ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: غلام سجاد

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر نوجوانوں والی ہی ہے نا!)

ماہ ستمبر میں دیے گئے اسلامی کوئز کے درست جوابات

اسلامی کوئز 1۔ (الف) ابودجانہؓ (ب) جنگ یمامہ

اسلامی کوئز 2۔ (الف) ابوذر غفاریؓ (ب) مدینہ میں

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ توصیف احمد (حیدرآباد) 2۔ ڈاکٹر محمد ندیم (منڈی بہاؤالدین) 3۔ عائشہ فاطمہ (فیصل آباد) 4۔ بدر منیر (کراچی)

درست جوابات دینے والوں کے نام

محمد عماد (کراچی)' منیر احمد (حیدر آباد)' توصیف احمد (حیدر آباد)' ابتہال سلیم (حیدر آباد)' طٰہٰ یٰسین (حیدر آباد)' مرزا اسفار بیگ (حیدر آباد)' ولی حسین (حیدر آباد)' مرزا ہادی بیگ (حیدر آباد)' ڈاکٹر محمد ندیم (منڈی بہاؤ الدین)' ابتسام الرحمٰن (ہری پور)' اطروبہ خان خانزادہ (سکرنڈ)' محمد تنزیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)' عائشہ فاطمہ (فیصل آباد)' ہشام صابر (ہری پور)' بدر منیر (کراچی)' حمزہ شمشاد خان (سرگودھا)' سعد سلمان (اٹک)

اسلامی کوئز ۱

حج کے لغوی معنی قصد کرنا' ارادہ کر کے کسی جگہ جانا۔ شرعی اصطلاح میں مکہ مکرمہ میں جا کر بیت اللہ' عرفات' مزدلفہ اور منیٰ وغیرہ کا قصد کرنے اور طواف دیگر مناسک حج ادا کرنے اور مقررہ آداب و اعمال بجالانے کا نام حج بیت اللہ ہے۔ حج اسلام کے پانچ ارکان بنیادی میں سے آخری رکن ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے۔'' (۳:۹۷)

حج کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو مرکز اجتماع قرار دیا۔ یہ اللہ کا پہلا گھر تھا جو نوع انسانی کے لیے قبلہ مقرر کیا گیا' قرآن مجید کی رو سے اس کا محل وقوع مکہ مکرمہ میں ہے۔

ا۔ حج کے لغوی معنی کیا ہیں؟ ۲۔ حج اسلامی مہینے کی کون سی تاریخ کو ادا کیا جاتا ہے؟

اسلامی کوئز ۲

شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک میدان کو منتخب کیا جس کا نام منیٰ ہے۔ یہاں تمام حجاج ٹھہرتے باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں۔ یہیں قربانی کی جاتی ہے' باہم دعوتیں ہوتی ہیں' بازار لگتے اور خرید و فروخت ہوتی ہے۔

ا۔ قربانی کون سے مقام اور کس تاریخ کو کی جاتی ہے؟ ۲۔ منیٰ میں کتنے دن قیام کیا جاتا ہے؟

انعامات کے لیے تعاون

اسلامک پبلی کیشنز

منصورہ ملتان روڈ لاہور

ادویہ تو چھوڑیں اسپرین کی گولی بھی مفت نہیں ملتی۔

اس طرح روپیہ لگانے کے بجائے روزگار فراہم کرنے والے کارخانے، اسکول، اسپتال اور چھوٹی انڈسٹریاں لگائی جائیں۔ اساتذہ اور نرسوں کی تربیت کا انتظام کیا جائے تو لاکھوں لڑکوں اور لڑکیوں کو ملازمتیں مل سکتی ہیں۔ ہمارے یہاں ۸۰ فیصد لڑکے اور لڑکیاں گریجوایشن کے بعد نہ صحیح اردو لکھ سکتے ہیں نہ انگریزی۔ تعلیم پہ بہت محنت کی ضرورت ہے۔

لیکن ان خامیوں کے باوجود میں غیر آئینی طریقے سے شریف برادران کو ہٹانے کے مخالف ہوں۔ عمران خاں اور طاہر القادری سے ٹھیک طور پر نمٹا جائے، یہ حد سے زیادہ بڑھ گئے۔ انھوں نے ۱۴ اگست کو اپنا پروگرام رکھ کر بہت بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ اللہ پاکستان کو اچھے حکمران عطا فرمائے۔ (آمین) مولوی حضرات خواتین کو گھر کے اندر رہنے کی تلقین کرتے ہیں، مگر ضرورت ہو تو خواتین کا مجمع لگاتے ہیں۔ پتا نہیں یہ کیسی خواتین ہیں جو گھروں سے بے نیاز گود میں بچے لیے دھرنے دے رہی ہیں۔

(اختر سلیمی، کراچی)

کچھ ان کا سدباب بھی ہونا چاہیے

یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب میرے موبائل فون پر یہ میسج آیا ''بے نظیر انکم سپورٹ کی طرف سے گھر گھر سروے کے تحت آپ کا تیس ہزار روپیہ منظور ہوا ہے۔'' آپ کا یہ نمبر ۰۳۲۲۸۶۴۳۷۱۷ ہمارے پاس رجسٹرڈ ہے۔ براہ مہربانی اِس نمبر پر رابطہ کریں۔ ۰۳۳۱۹۷۵۰۱۵۱''

میں نے فوری نمبر ملایا، تو ایک صاحب نے مجھے مبارک دی اور ساتھ ہی یہ ہدایت نامہ بھی تھا:

''آپ قریبی ''ایزی پیسہ'' والوں کے پاس جائیں اور اُن سے کہیں کہ میرا بھائی یا دوست مجھے کچھ رقم بھجوا رہا ہے۔ آپ اُسے اپنا اکاؤنٹ نمبر بتا دیں اور ہرگز نہ بتائیں کہ بے نظیر انکم سپورٹ کی طرف سے میرا انعام نکلا ہے ورنہ وہ آپ کی رقم ہضم کر لے گا۔''

میں بھاگم بھاگ اپنے محلے کی ''ایزی پیسہ'' دکان پر گیا اور اُس سے سارا مدعا بیان کر دیا۔ اللہ اُس کا بھلا کرے، وہ بتانے لگا کہ باؤ جی یہ بڑا زبردست فراڈ ہو رہا ہے۔ آپ اِنھیں میرا اکاؤنٹ نمبر دیں گے اور وہ جیسے تیسے میرے اکاؤنٹ سے میری ہی رقم نکلوا لے گا اور میں آپ کو پکڑوں گا کہ آپ نے اُسے میرا اکاؤنٹ نمبر دیا تھا۔ آپ ان چکروں میں نہ پڑیں۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور چپ چاپ گھر لوٹ آیا۔

لیکن تاحال مجھے ایسے میسج آنے کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ میں ایسے کئی میسج ختم کر چکا پھر بھی مہینے ڈیڑھ مہینے بعد نئے نمبروں سے ایسے میسجز آتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ میسج صرف مجھے ہی نہیں کئی لوگوں کو آتے ہوں گے اور ممکن ہے کئی سادہ لوح اِن فراڈیوں کے ہتھے چڑھ چکے ہوں۔ ایسے فراڈ بدمزگی اور خون خرابے کا باعث بنتے ہیں۔ ہمارے اعلیٰ حکام اِن دھوکے بازوں کی جانب توجہ دیں، تو بہت سوں کا بھلا ہو گا۔ یہ دھندا کرنے والوں کو انھی کے نمبروں سے ٹریس کر کے حوالات میں بند کر دینا چاہیے۔

(عرشیان محی الدین، لاہور)

دفاع نمبر

ماہ ستمبر کے پہلے ہفتے ''دفاع نمبر'' نظر نواز ہوا۔ میر واعظ عمر فاروق اور جنرل (ر) احسان الحق کے انٹرویو بہت معلوماتی تھے جنھیں پڑھ کر کئی پوشیدہ نکات منظر عام پر آئے۔ دیگر تحریریں بھی لائق صد ستائش ہیں۔

(جاوید احمد صدیقی، راولپنڈی)

◆●●

میڈیا کے انتہائی شور مچانے پر جو سرکاری امداد اور گندم مٹھی شہر کے سرکاری گودام میں بھیجی گئی' وہ بھی متعلقہ حکام نے بجائے مستحق افراد میں تقسیم کرنے کے اپنوں میں بانٹ دی۔ البتہ فوج اور دیگر فلاحی اداروں نے نہایت ایمانداری سے ریلیف کیمپ لگا کر جہاں تک اُن کی رسائی ہو سکی' وہاں امداد اور ادویہ تقسیم کروائیں جس پر وہ بلاشبہ قابل تحسین ہیں۔

دیگر تین صوبوں کی حکومتوں نے بھی امدادی سامان قحط زدہ علاقوں میں بھیجا مگر حکومت سندھ کے سرکاری حکام کی بے حسی کا یہ عالم تھا کہ نہ تو سرکاری اسپتالوں اور صحت کے بنیادی مراکز میں ادویہ موجود تھیں اور نہ ہی ان علاقوں سے منتخب ایم پی اے حضرات نے متعلقہ گاؤں اور دیہات میں جا کر عوام کی خبر گیری کی زحمت کی۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ تھر کے دیہات میں سڑکوں کا جال بچھایا جائے۔ صاف پانی کی لائنیں بچھائی جائیں۔ قحط سالی کا مسئلہ حل کرنے کی خاطر جامشورو بیراج سے ایک نہر نکالی جائے جو مٹھی' اسلام کوٹ اور نگر پارکر کے علاقوں کو سیراب کرے۔ ہر سال دریاؤں میں آنے والا سیلابی پانی کوٹری بیراج سے آگے سمندر میں جا گرتا ہے۔ لہٰذا جامشورو سے تھر پارکر تک نہر نکالی جائے تو اس سیلابی پانی کو اُس کے ذریعے تھر پہنچا کر قابل استعمال بنایا جا سکتا ہے۔

(مہناز آفریدی' لطیف آباد)

اردو ادب کی یونیورسٹی

اردو ڈائجسٹ اردو ادب کی ایک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ستمبر میں ۶۵ء کی جنگ کے واقعات ایمان کو تقویت دینے کا باعث بنے۔ فوجیوں کے واقعات اور آپ بیتیاں شائع کیجیے۔ قارئین کی دل چسپی بڑھے گی۔ بقیہ تمام مضامین بھی اچھے ہیں

(ڈاکٹر خالد شفیع ملک' بھکر)

حکومت وقت سے گلے شکوے

پنجاب حکومت نے بغیر حساب کتاب سستی روٹی کی قیمت مقرر کر دی۔ یوں حکومت کو کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔ پھر یہ اسکیم کسی شرمندگی یا معافی کے بغیر ختم کر دی گئی۔ اگر پہلے ہی حساب کتاب کر لیا جاتا' تو لوگ بھی اسے قبول کر لیتے۔

اسی طرح دانش اسکولوں کا منصوبہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سیکڑوں نہیں ہزاروں سرکاری اسکول کھولے جائیں' مگر صرف ۳۵ دانش اسکول قائم کیے گئے۔ ایک اسکول ۷۵ کروڑ روپے میں بنتا ہے۔ معیار تعلیم ایچیسن کالج جیسا ہے۔ اس میں غریب خاندانوں کے بچے تعلیم پائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ بچے پڑھ لکھ کر اپنے غریب خاندانوں میں واپس جا سکیں گے؟ ان کا کیا ہو گا؟ کیا وزیراعلیٰ پنجاب کے پاس ان کے لیے کوئی پروگرام ہے؟

بڑے صاحب ان سے بھی آگے ہیں۔ سو ارب روپے کا کاروباری قرض دے رہے ہیں۔ گویا سو ارب روپیہ ضائع کرنا معمولی بات ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ کاروبار کرنا ہر نوجوان کے بس کی بات نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ منصوبہ بھی کہیں پیلی ٹیکسیوں کی طرح برباد نہ ہو جائے۔

وہ بھی مفت لیپ ٹاپ بانٹنے کے شوقین ہیں۔ اصل میں دونوں بھائی ملک کی ترقی کا صحیح وژن نہیں رکھتے۔ سستی روٹی' مفت لیپ ٹاپ' میٹرو بس اور موٹروے ترقی کی سند نہیں...... ملک میں اسکولوں اور اسپتالوں کی سخت ضرورت ہے۔ سرکاری اسپتالوں میں

(۱) پوری دنیا میں پاک وطن کی جگ ہنسائی ہوئی اور قوم دس سال پیچھے چلی گئی۔

(۲) قوم بداعتمادی کا شکار ہوئی۔ خانہ جنگی کی بنیاد رکھ دی گئی۔ بھائی کا بھائی دشمن بنا دیا گیا۔

(۳) معیشت تباہ ہوئی۔ تجارت کو نقصان پہنچا۔

(۴) قوم کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

(۵) چھے سات لوگ جنرل مشرف کی مونچھ کا بال بنے رہے' کیا وہ پاک صاف ہو گئے؟

(۶) یہ فساد فی الارض تھا...... اللہ پاک نے فساد برپا کرنے والوں کو سخت عذاب کی وعید سنائی ہے۔

(۷) چینی صدر کا دورہ ملک و قوم کے لیے بہت مفید تھا' مگر خراب حالات کی وجہ سے ملتوی ہوا۔ چینی صدر نے حسب پروگرام' بھارت' سری لنکا' مالدیپ کا دورہ کیا۔ افسوس ؎

وائے ناکامی امتاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

(قاضی محمد یوسف' مسقط)

ہماری شاندار ساڑھے چودہ سو سالہ تاریخ

الحمدللہ اردو ڈائجسٹ اچھا جا رہا ہے۔ یقیناً صحافت قوم کی سب سے بڑی امانت ہے۔ اسے اٹھانے کے لیے امین' قابل اور اہل افراد کی ضرورت ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ مقدس امانت آج کل بہت سے نااہل' بے ضمیر' دین بیزار اور مال و زر کے اسیر افراد کے رحم و کرم پر ہے۔

ماضی میں ہمارے اسلاف تمام علوم دنیا کے امام تھے۔ یہ عقیدت نہیں ایک کھلی حقیقت ہے۔ وہ نہ صرف قابل ترین افراد تھے بلکہ اُن کے دل بھی زندہ تھے۔ وہ ایمانی جذبے سے سرشار تھے۔ مگر افسوس آج انھی کے نام لیوا اُن کی روشن اور تابناک تاریخ سے ناواقف ہیں۔

یورپ کے لوگ صرف تین سو سالہ تاریخ رکھتے ہیں لیکن انھوں نے اس میں مبالغہ آرائی سے کام لیا۔ وہ اُسے بڑھ چڑھ کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

اس کے برعکس مسلم قوم اپنا ماضی بھول چکی جو ساڑھے چودہ سو سال پر محیط ہے۔ اس طویل زمانے میں ہر فن کے امام گزرے ہیں۔

ہمارے بعض اہل صحافت تعمیری سرگرمیوں اور معاشرے کی اصلاح چھوڑ کر نوجوانوں کے اخلاق اور زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بے حیائی اور بدذوقی کے ہولناک جراثیم پھیل چکے۔ ایسے دور میں الحمدللہ اردو ڈائجسٹ اور دیگر چند اسلامی اور مشرقی مجلے اپنے مقاصد سے ہرگز غافل نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نوجوانوں کو اسلاف کے کارناموں سے باخبر رکھا جائے۔ اردو ڈائجسٹ کے معزز ذمہ دار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اس پر مستند سلسلہ شروع فرمائیں۔

(محمد اقبال' دارالعلوم' کراچی)

سیلابی پانی سے فائدہ اٹھائیے

میرا درس و تدریس کے شعبے سے تعلق ہے۔ قریباً دو سال سے مٹھی میں ایک سرکاری اسکول میں اپنے فرائض انجام دے رہی ہوں۔ مٹھی کبھی تھرپارکر کا چھوٹا سا گاؤں ہوتا تھا' آج شہر اور ضلع کی حیثیت اختیار کر چکا۔ مگر انتہائی افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس ضلع میں شامل دیہات اور تحصیلوں کی حالت نہایت خراب ہے۔ پچھلے دنوں قحط سالی سے صرف ضلع مٹھی اور اس کی تحصیل اسلام کوٹ اور نگر پارکر میں سو سے زائد بچے اور دیگر بوڑھے افراد موت کی آغوش میں چلے گئے' مگر ہمارے ارباب اختیار جو ان علاقوں سے ووٹ لے کر اسمبلی میں منتخب ہوئے، اُن کے کانوں پہ جوں تک نہیں رینگی۔

قارئین کے تبصروں، مشوروں
اور باتوں سے سجا کالم

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ...... آپ بہت یاد آئے

''میں نے جو کہا تھا' اُسے درست سمجھا گیا۔ لہٰذا مجھے گرفتار کرلیا گیا۔'' یہ الفاظ تھے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے اور زمانہ تھا ایوب خان کا۔ مولانا مودودیؒ نے بیان دیا تھا: ''حکومت تھانیدار کے دماغ سے سوچتی ہے۔'' انھیں گرفتار کرنے کے بعد اُن سے کہا گیا ''اگر وہ یہ کہہ دیں کہ اُن کی بات کو صحیح نہیں سمجھا گیا اور اُن کا مطلب وہ نہیں تھا جو سمجھا گیا تو انھیں رہا کر دیا جائے گا۔''

مولانا نے جواب دیا ''میرا مدعا صحیح سمجھا گیا' اسی لیے تو مجھے گرفتار کیا گیا۔''

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ روایتی معنوں میں مولانا نہ تھے' لیکن وہ حقیقی معنوں میں مولانا یعنی ایک مرشد ضرور تھے۔ وہ ماضی سے نئی نسل کو مربوط کرنے والی شخصیت تھے۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات کا احیا اور دفاع اُس وقت کیا جب اُس کی ضرورت تھی۔ مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبالؒ کے خوابوں اور ارمانوں کی تعبیر مولانا مودودیؒ کے قلم سے ہوئی۔ ''الجہاد فی الاسلام''، ''تجدید و احیائے دین''، ''تفہیمات''، خلافت وملوکیت اور اُن کی دیگر کتب کو اسی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ مولانا مودودیؒ کا ایک عظیم کارنامہ قرآن کی ترجمانی پر مشتمل شہرہ آفاق تصنیف ''تفہیم القرآن'' ہے۔ اس تفسیر نے لوگوں میں رجوع الی القرآن کی ایک جوت جگا دی۔

ستمبر کا مہینا اور سال ۱۹۷۹ء کا تھا جب مولانا مودودیؒ ہم سے بچھڑ گئے۔ وہ تہ خاک ہو چکے' لیکن ایک سورج کی طرح ہمیشہ اپنے افکار و خیالات کی وجہ سے زندہ رہیں گے۔ جب حالات دگرگوں ہوں اور سنجیدگی مفقود ہو جائے' مولانا مودودیؒ بہت یاد آتے ہیں۔

(سید مزمل حسین' اسلام آباد)

احساسِ زیاں جاتا رہا

دیارِ غیر میں مقیم ہم پاکستانی وطن عزیز کے دگرگوں حالات دیکھ کر کڑھتے رہتے ہیں۔ میرے نزدیک عمران خاں اور ڈاکٹر طاہر القادری کے احتجاج کا بدیہی نتیجہ یہ نکلا:

قصہ کوئز ۱

پاک فوج کے سابق کمانڈر انچیف۔ اعظم گڑھ، یوپی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور ۱۹۵۰ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کے چھٹے کورس میں شمولیت اختیار کی۔ ۱۹۵۲ء میں بلوچ رجمنٹ میں بطور انفنٹری افسر کمیشن ملا۔ اسپشل سروسز گروپ میں شامل رہ کر فوجی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۲ء میں اسٹاف کالج کوئٹہ سے گریجوایشن کی۔ نیشنل ڈیفنس کالج، راولپنڈی میں کچھ عرصہ انسٹرکٹر بھی رہے۔ چیف آف جنرل اسٹاف بھی رہے۔ ۱۹۸۶ء میں جی ایچ کیو سے تبادلہ کر کے انھیں آرمی کور پشاور کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ مارچ ۱۹۸۷ء میں ان کو ترقی دے کر جنرل بنایا گیا اور جنرل خالد محمود عارف کی جگہ وائس چیف آف آرمی اسٹاف بنایا گیا۔

قصہ کوئز ۲

مصور، شاعر۔ ۱۹۳۹ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میاں محمد شفیع۔ سیالکوٹ سے گریجوایشن کرنے کے بعد اپنے فطری میلان کے مطابق مصوری کو پیشے کے طور پر اختیار کیا اور بڑا نام کمایا۔ ۱۹۶۱ء سے آپ نے سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ مصوری شروع کی۔ آپ پہلے مصور ہیں، جنھوں نے پہلی مرتبہ گرے رنگ استعمال کیا، حالانکہ دوسرے مصور اسے ثانوی اور امدادی رنگ سمجھ کر نظرانداز کرتے رہے ہیں۔ آپ نے اسے نہ صرف بنیادی اہمیت کا حامل بنایا بلکہ اپنے موقلم کے لیے اساسی تجربہ گاہ کی حیثیت دے رکھی ہے۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک گرے رنگ کی گراؤنڈ میں شاداب ہریاول یا کھلا ہوا نارنجی رنگ اور اوپر سے تیکھے، تیز، شوخ اور نوکیلے سیاہ خطوط، یہی آپ کے بنائے ہوئے سرورقوں کا مجموعی اسلوب رہا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد آپ کی تصویر اور سرورق میں اجتماعی زندگی، حب الوطنی اور قوم کی منفرد توانائی پھوٹی پڑتی ہے۔ پھر ۱۹۷۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان کے بعد شدید مایوسی اور کرب نے خالی مکان، خالی دروازوں اور خالی کھڑکیوں کی صورت میں اظہار کیا۔ پھر یکایک آپ کا رجحان خطاطی کی طرف ہو گیا۔ آپ نے حروف کو تصویر میں دیکھا اور دکھایا۔

۱۔ جنرل اسلم بیگ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
۲۔ ان کو کون کون سے تمغے ملے؟
۳۔ اسلم کمال کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
۴۔ انھوں نے خطاطی میں کون سا خط استعمال کیا؟

قصہ کوئز ۳

ادیب، افسانہ نگار۔ ۲۲/اگست ۱۹۲۵ء کو مکتسر، ضلع فیروز پور میں ڈاکٹر محمد خان کے گھر پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اردو کیا اور دیال سنگھ کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ دو سال تک روم یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرار رہے۔ وہیں اطالوی زبان میں ڈپلوما حاصل کیا۔ فرانسیسی زبان کا ڈپلوما گرینوبل یونیورسٹی، فرانس سے حاصل کیا۔ نیویارک سے ریڈیائی نشریات کی تربیت حاصل کی۔ وطن واپسی پر اپنا اشاعتی گھر قائم کیا اور رسالہ ''داستان گو'' جاری کیا۔

۱۹۵۸ء میں جب مارشل لا کے ایک حکم کے تحت پروگریسیو پیپرز لمیٹڈ کو سرکاری تحویل میں لیا گیا تو ہفت روزہ ''لیل ونہار'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ ایک سال تک پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں پنجاب کے اعزازی لیکچرار رہے۔ آر سی ڈی کے علاقائی ثقافتی انسٹیٹیوٹ میں چار سال تک ڈائریکٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔

۱۔ اشفاق احمد کب اور کہاں پیدا ہوئے؟ ♦♦♦

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اُکساتا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، اس کی 3 بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بہ غور پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے 2 سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہوئے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو "اردو ڈائجسٹ" کے 6 شماروں کی انعامی و اعزازی ترسیل کے علاوہ منشورات کی 2 خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتا: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ** 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور

ماہ ستمبر میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز 1۔ (الف) اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۶۷۳ء میں (ب) بادشاہی مسجد

قصہ کوئز 2۔ (الف) بابری مسجد (ب) ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء

قصہ کوئز 3۔ (الف) قطب الدین ایبک (ب) قطب منار، دہلی

درست جوابات دینے والوں کے نام

محمد تنزیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، ستارہ اعزاز (لاہور)، ڈاکٹر خالد سیف خان (لاہور)، شہباز احمد (آزاد کشمیر)، محمود منور خان (سرگودھا)، بدر منیر (کراچی)، محمد الیاس (منڈی بہاؤ الدین)، عبدالنعیم انصاری (حیدر آباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدر آباد)، منیر احمد (حیدر آباد)، آصف کریم (حیدر آباد)، محمد احمد (کراچی)، ولی حسین (حیدر آباد)، عبدالسلیم (حیدر آباد)، ملک جاوید محمد خان (چھچھ)، نسرین مبشر (چکوال)، منور سعید خانزادہ (سکرنڈ)، منظور احمد بھیگو (نواب شاہ)، عمر حمید (فیصل آباد)، حمزہ شمشاد خان (سرگودھا)، اویس حبیب (فیصل آباد)، صادقہ احسان (اسلام آباد)، علی زیب احمد (قصور)، سعد سلمان (اٹک)، ندیمہ امتیاز (جہلم)، پرویز اختر واحد (ہری پوری)، ماسٹر قاسم علی (اوکاڑہ)، امین فاطمہ (میر پور)، حسام ظفر (راولپنڈی)، فیصل قریشی (راولپنڈی)، احتشام ظفر (راولپنڈی)

دلچسپی معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ،
یہی ہے اِس کوئز کا اصل مقصد

انچارج کوئز:
غلام سجاد

یہی ہے قصہ کوئز

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- شہباز احمد (آزاد کشمیر)
- ستارہ اعزاز (لاہور)

آپ کو 6 ماہ تک اُردو ڈائجسٹ کے شمارے بطور تحفہ ملیں گے

نوٹ: تمام قارئین اپنا مکمل نام و پتا اور موبائل یا پی ٹی سی ایل نمبر لکھنا ہرگز نہ بھولیں۔ اس کے بغیر کوریئر سروس کا نمائندہ آپ تک نہیں پہنچ پاتا۔ (ایڈیٹر)

ہیں۔ بے حد محتاط ہوتے ہیں۔ خود اپنا تجزیہ وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ حساس ہوتے ہیں۔ خود پر کنٹرول رکھنا جانتے ہیں۔ نیک سیرت اور بلند کردار کے حامل ہوتے ہیں۔

وفا دار ہونے کے ساتھ ساتھ جذباتی بھی بہت ہوتے ہیں۔ دوستی خوب سوچ سمجھ اور پرکھنے کے بعد کرتے، عموماً کم گو اور عقل مند ہوتے ہیں۔ سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ صابر و شاکر ہوتے ہیں۔ پراستقلال اور پرعزم رہتے ہیں۔ اپنے فیصلوں پر ثابت قدم رہتے ہیں۔

خواتین خصوصیت سے رحملانہ، مشفقانہ اور مادرانہ جذبات کی حامل ہوتی ہیں۔ عموماً اپنے اندر سمٹی رہتی ہیں۔ کسی حد تک قدامت پسند اور فرائض کی بجا آوری کو اپنا نصب العین سمجھتی ہیں۔ ذہین و فطین اور سوجھ بوجھ کی حامل ہوتی ہیں۔ ازدواجی زندگی میں محبّت، وفاداری اور خلوص کو اولیت دیتی ہیں۔ لباس کے معاملے میں بہت محتاط ہوتی ہیں۔ خواتین ہوں یا مرد، قابل بھروسا اور دوست کے ساتھ وفادار ہوتے ہیں۔

منفی خصوصیات

نیلے رنگ کے عاشق تخلیقی سوچ اور صلاحیتوں میں پیچھے ہوتے ہیں۔ اپنے منفی اور مثبت خیالات پر سختی سے جمے رہتے اور خود کو ہی درست مانتے ہیں۔ اپنے کاموں، ارادوں اور خود کو ہمیشہ نیک سمجھتے ہیں۔ دوسروں کی تعریف اور شکریہ ادا کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ اپنے اعتقادات پر سختی سے یقین رکھتے ہیں اور ان میں لچک پیدا نہیں کرتے۔ ساتھ ہی انھیں اس بات کی بھی فکر رہتی ہے کہ لوگ ان کے متعلّق کیا سوچتے ہیں۔ ◆◆◆

اندازِ نظر

ایک شخص اپنے کھیت میں کھدائی کر رہا تھا کہ اسے سنگِ مرمر کی ایک نہایت حسین اور نظر فریب مورتی ملی۔ وہ اسے لے کر ایک ایسے شخص کے پاس گیا جو پُرانی چیزوں کا دل و جان سے دلدادہ تھا۔ اُس نے ایک خطیر رقم دے کر وہ مورتی خرید لی اور دونوں اپنی اپنی راہ چلے گئے۔

بیچنے والا گھر جاتے ہوئے، اپنے دل میں کہہ رہا تھا۔ ”کتنی جان اور کتنی زندگی ہے اس دولت میں! سچ مُچ بڑی حیرت ہے کہ ایک عقل مند انسان اتنی بڑی رقم، ایک گونگے اور بے جان پتھر کے ٹکڑے کے عوض کیسے دے سکتا ہے جو ہزاروں برس سے زمین میں دبا پڑا ہو، جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا ہو۔“

عین اُسی لمحے خریدنے والا مورتی کو غور سے دیکھتا دل ہی دل میں کہتا جاتا تھا:

”کتنا مقدس ہے وہ حُسن، جو تجھ میں ہے اور کتنی مبارک ہے وہ زندگی جو تیرے وجود میں شعلہ زن ہے۔ خدا کی قسم! میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ انسان ایسی لطیف، ایسی نادر اور ایسی بے بہا چیز کو بے جان اور زائل ہو جانے والی دولت کے بدلے کیسے فروخت کرسکتا ہے۔“

(اشرف سکندر، اوکاڑہ)

رنگوں کا استعمال کرتے وقت ان کے اثرات ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ہلکے رنگوں سے روشنی، کشادگی اور تازگی و فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف گہرے رنگ طیش اور طبیعت پر گرانی کا احساس چھوڑتے ہیں۔ اس لیے شبینہ بلب کا رنگ عموماً ہلکا نیلا منتخب کیا جاتا ہے۔ گھروں میں رنگ کرانے کے لیے عموماً سفید، آف وائٹ، نیلا، سلیٹی زیادہ منتخب کیے جاتے ہیں کیوں کہ ان سے کشادگی اور روشنی کا احساس دوچند ہو جاتا ہے۔

یوں تو تیز، ہلکے، پُرسکون، بھدے اور متضاد سب ہی رنگ انسانی زندگی کا حصہ ہیں، مگر ان کی پسند یا ناپسند سے انسان کے کردار، چال چلن اور عادات اطوار کا اندازہ لگانا ممکن ہے۔ آج کل رنگوں کے ذریعے بیماریوں کا علاج بھی ہوتا ہے۔

روحانی معالجین رنگوں کی افادیت پر یقین رکھتے اور رنگ و روشنی سے علاج کرتے ہیں۔ قدیم آیوورویدک کتابوں میں بھی رنگوں سے علاج کے نسخے موجود ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ نسخے نیلے رنگ اور روشنی کے ہیں۔

رنگوں کے اثرات کو قدیم یونانی اور مصری بھی مانتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے مندروں اور عبادت گاہوں میں خصوصیت سے رنگوں کا استعمال کیا۔

کچے رنگ پکے کرنا

نیلا کپڑا عموماً رنگ چھوڑ دیتا ہے، خواہ وہ آسمانی ہو، گہرا نیلا یا نیوی بلیو۔ اس کو پکا کرنے کے لیے ایک بالٹی میں گرم کھولتا ہوا پانی ڈالیں۔ اس میں ایک چمچ کھانے کا نمک اور پھٹکری ملا کر ۱۰ منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ پھر کپڑے ڈالیے۔ ۱۰ منٹ بعد پانی ٹھنڈا ہو جائے تو کپڑے نچوڑ کر سائے میں ڈالیں۔ دوبارہ آپ کپڑے کو دھوئیں گی تو رنگ نہیں نکلے گا۔

نیلے رنگ کی اشیا

نیلے رنگ کی تمام اشیا دیکھنے، کھانے اور استعمال کرنے سے قدرتی طور پر سکون، اطمینان، ٹھنڈک، خوشی اور پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے۔ رنگوں سے علاج کرنے والے ماہرین کا دعویٰ ہے کہ نیلے رنگ کی غذائیں ہسٹیریا، بے خوابی، السر، غصے، تیزابیت، اعصابی دباؤ، نسیان، جنون، شور، جوڑوں کے درد، گلے کی سوزش، آنکھوں اور سر کا درد، انفلوانزا، یادداشت کی کمزوری، طبیعت کی گرانی، یرقان اور دماغی تکالیف میں مفید ہیں۔

نیلا رنگ کیا ظاہر کرتا ہے؟

رنگ ہمارے جسم اور دماغ پر غیر محسوس طریقے سے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ یہ ہماری دلچسپیوں اور ذہنی و جذباتی حرکات کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ نیلا رنگ بتاتا ہے "میں پُرامید ہوں، ہار نہیں مانوں گا، ہمت رکھتا اور اعتماد کرتا ہوں۔" یہ رنگ پسند کرنے والوں میں تجزیاتی اہلیت ملتی ہے۔

شفا بخش رنگ

نیلے رنگ اور روشنی کو روحانی اور جسمانی، دونوں قسم کے علاج میں شفا بخش پایا گیا ہے۔ نیلا لباس، روشنی، اشیا اور نیلی دوا غرض بیماریوں سے شفا کے لیے سب سے زیادہ یہ رنگ استعمال ہوتا ہے۔ جب بھی آپ افسردہ ہوں، سر درد ہو، نسیان میں مبتلا ہوں، بدن اور پٹھوں میں درد یا کھنچاؤ ہو، تو نیلے رنگ کی اشیا اور لباس کا انتخاب کریں۔ زیادہ سے زیادہ وقت اس رنگ کے زیر اثر گزاریں، شفا پائیں گے۔

مثبت خصوصیات

نیلا رنگ پسند کرنے والے دوسروں کا خیال رکھتے

ذہنی و جسمانی علاج میں شفا بخش

نیلا رنگ

تین بنیادی رنگوں میں سے ایک کی
مثبت و منفی خصوصیات

شاہدہ ریحانہ

رنگ کی کہانی تین بنیادی رنگوں...... سرخ، زرد اور نیلے سے شروع ہوتی ہے۔ یہ تینوں قدرتی اور فطری ہیں، کسی اور رنگ سے وجود میں نہیں آتے۔ اسی لیے انھیں تین بنیادی رنگ کہا جاتا ہے۔ لیکن ان رنگوں کو آپس میں ملایا جائے تو طرح طرح کے رنگ تخلیق ہوتے ہیں۔ یہ ثانوی رنگ کہلاتے ہیں۔ ہرا، لال، نیلا اور پیلا ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ رنگوں کی ان گنت اقسام اور خصوصیات ہیں۔

کچھ رنگ گرم اور کچھ ٹھنڈے مانے جاتے ہیں۔ نیلے رنگ کی تمام اقسام کو ٹھنڈا سمجھا جاتا ہے۔ سجاوٹ میں وہ چاہے گھر کی ہو یا لباس کی، رنگوں کا امتزاج اور ترتیب بہت اہم حیثیت رکھتی ہے۔

لباس یا آرائش میں اگر ایک ہی رنگ کے ہلکے اور گہرے شیڈ استعمال کیے جائیں تو یہ متضاد رنگوں سے زیادہ بھلے لگتے ہیں۔

نے کہا۔
"یہ ہرن کا گوشت ہے کیا؟"
وہ خاموش رہا۔
کمرے سے باہر جا کر اُس نے دروازہ بند کیا اور پھر آواز لگائی:
"ہرن کھانا کھا رہا ہے۔ آدھے گھنٹے بعد قصائی کو بھیج دینا۔"

☆☆

فرمائش

"میں نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا ہے۔" اُس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔
"میری بیوی اور تم ایک دوسرے سے محبّت کرتے ہو۔ مجھے درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔"
اُس نے میز کی دراز سے پستول نکال لیا۔
"خوب!" میں نے اُسے داد دی۔
"مجھے تم جیسے بہادر آدمی سے یہی توقع تھی۔"
اس نے شکست خوردہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔
"مرنے سے پہلے ہمیں شادی کا تحفہ نہیں دو گے؟" میں نے پوچھا۔
"کیوں نہیں؟ کہو کیا چاہیے؟" اُس نے پستول میں ایک گولی ڈال کر کہا۔
"خودکشی سے پہلے میری بیوی کو ٹھکانے لگا دو...... پلیز!"

☆☆

خرانٹ

"آپ کا نام کیا ہے؟"
"نام میں کیا رکھا ہے؟ ویسے آپ مجھے شیکسپیئر کہہ سکتے ہیں۔"
"شیکسپیئر صاحب! مجھے تیسری منزل پر جانا ہے' آپ کے لیے کون سا بٹن دباؤں؟"
"میں بھی تیسری منزل پر جاؤں گا' جہاں اُس خرانٹ جج کا کمرا ہے۔
سالا ہر ایک کی بے عزتی کرتا ہے۔
یہ تو کرسی ہے جس سے سب ڈرتے ہیں'
ورنہ کوئی اُس سے بات کرنا پسند نہ کرے۔
بدقسمتی کہ میرا مقدمہ وہ سنے گا۔
خیر میری چھوڑیں' اپنی سنائیں'
آپ کا نام کیا ہے؟"
"نام میں کیا رکھا ہے؟ آپ مجھے یور آنر کہہ سکتے ہیں۔"

☆☆

اُداسی

میں آج پہلی بار بیٹی کو اپنے دفتر لے گیا۔
بیوی نے چلنے سے پہلے کرن کو اپنا آئی فون دے کر کہا:
"بیٹی' جب فرصت ملے تو کال کر کے خیریت کی خبر دے دینا۔"
کرن کو بالکل فرصت نہیں ملی۔
دفتر والے ہر سال ایک پروگرام کرتے ہیں' چلو بیٹی میرے دفتر' بیٹیاں پورا دن باپ کے دفتر میں گزارتی ہیں' خوب لطف اٹھاتی ہیں۔
شام کو بیٹی واپس آئی تو ماں نے کہا' "آج میں سارا دن بہت اُداس رہی۔"
کرن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
ماں کا جملہ اُس کے بعد مکمّل ہوا......
"آئی فون کے بغیر ایک پل نہیں کٹتا۔" ◆◆◆

ملاقات

وہ سیاست دان مجھے فون کیا کرتا۔
''ایڈیٹر صاحب، میرا سیکرٹری پریس ریلیز لائے گا۔''
سیکرٹری آتا، سلام کرتا، ایک پرچہ میرے حوالے کرتا۔
نہ کبھی اس نے کوئی بات کی، نہ میں نے کبھی بیٹھنے کو کہا۔
اگلے دن بیان چھاپ دیتا۔ سیاست داں شکریے کا فون کرتا۔
میرے دن رات اخبار کے دفتر میں گزرتے تھے، اور اُن کے جلسوں میں۔
ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔
ایک دن لانڈھی جانا ہوا۔ وہاں سنا کہ صاحب ''سچائی'' کے موضوع پر تقریر فرما رہے ہیں۔
میں بڑے اشتیاق سے جلسے میں شریک ہوا۔
دیکھا کہ سیکرٹری صاحب خطاب فرما رہے ہیں۔

☆☆

خواہش

کیا آپ واقعی جاننا چاہتے ہیں کہ اس بوتل میں کیا ہے؟
اور میں کیوں اسے ساتھ لیے پھرتا ہوں؟
اچھا، تو سنیں!
یہ بوتل ایک رات مجھے سمندر کنارے ملی تھی۔
اسے کھولا تو ایک جن نکل آیا۔
کہنے لگا ''آپ نے مجھے سیکڑوں سال کی قید سے آزاد کیا ہے، میں اب آپ کی ایک خواہش پوری کرنے کا پابند ہوں۔''
میں نے بہت سوچا کہ کیا خواہش بیان کروں؟
میرے پاس بہت پیسا ہے، بڑا کاروبار ہے، کئی کوٹھیاں ہیں۔ کچھ سمجھ نہ آیا تو میں نے تنگ آ کر کہا ''چلو واپس اس بوتل میں گھس جاؤ۔''

☆☆

روزانہ

''ہر روز سو لفظوں کی ایک کہانی لکھتا ہوں۔'' میں نے اُسے بتایا۔
وہ مجھے دفتر کے پیچھے والی گلی میں ملا تھا۔
پوچھ رہا تھا کہ کیا کام کرتا ہوں۔
''روز کہانی لکھنا ایسا ہے جیسے......
یوں سمجھو کہ روز کنواں کھودتا ہوں، روز پانی پیتا ہوں۔''
گلی میں اندھیرا تھا لیکن اُس کے چہرے پر روشنی پھیل گئی۔
بات اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔
''تم کیا کام کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''میں بھی روز کنواں کھودتا ہوں، روز پانی پیتا ہوں۔'' اُس نے کہا۔
پھر ایک پستول لہرا کے بولا ''ہر روز ایک موبائل فون چھینتا ہوں۔''

☆☆

آلو گوشت

''کیا تم تاوان کے لیے اغوا کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں تو۔'' اُس نے جواب دیا۔
''تو پھر؟ کیا سیاسی مخالفین کو اُٹھاتے ہو؟''
''نہیں، کیا تم سیاسی لیڈر ہو؟''
''کیا دوسرے فرقے کے لوگوں کو......؟''
''نہیں یار۔''
''پھر مجھے کیوں اغوا کیا؟''
اُس نے جواب دینے کے بجائے کھانے کی ٹرے بڑھا دی۔
''اتنا مزے کا آلو گوشت پہلے کبھی نہیں کھایا۔'' میں

تیز ترین دھار رکھنے والی

میٹھی چھری

خوابیدہ دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے والی
شوخ و شنگ مختصر کہانیاں

مبشر زیدی

"میرے نانا پہنچے ہوئے پیر تھے۔" ہمسائی نے بتایا۔
"واقعی؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔
"اور کیا!" وہ بولیں "جس کسی پر دم کر دیتے' اُسے کبھی بخار نہیں ہوتا تھا۔"
"کمال ہے۔" میں نے کہا "کاش انھوں نے وہ دم کسی کو بتا دیا ہوتا۔"
"وہ انھوں نے مجھے لکھ کر دیا تھا جو شخص وہ دم پڑھ لے اُسے بخار نہیں ہوتا۔"
"واہ!" میں نے خوش ہو کر کہا "کیا آپ مجھے وہ دم پڑھنے دیں گی؟"
"ہاں ضرور۔" ہمسائی نے وعدہ کر لیا۔ "میری ڈائری میں لکھا ہے' کل نکالوں گی۔"
"آج کیوں نہیں؟"
"آج مجھے بخار ہے۔"

☆☆

یہ بولتے ہوئے بیکری والے کی بیزاری محسوس کی جا سکتی تھی۔ اس کی بیزاری نظرانداز کرنا ہمیں کتنا بھاری پڑا، اس کا کاش ہمیں اندازہ ہوتا۔

ہم بولے: ''بھائی یہ آزادی کی جنگ ہے۔'' ہم پر تھوڑی دیر کے لیے خان صاحب طاری سے ہو گئے اور ہم اس ملک کو بادشاہوں سے آزاد کروانے کے لیے نکلے ہیں۔ ''اب ہمیں ہمارا حق چھیننے سے کوئی نہیں روک سکتا کیونکہ اب اس ملک کا نوجوان جاگ گیا ہے۔ ہمارے مینڈیٹ پر ڈاکہ ڈالنے والے اب ہم سے بچ نہیں سکتے۔ ہمیں اگر اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کو انصاف دلوانا ہے تو ہمیں شفاف انتخابات یقینی بنانے ہوں گے۔ اس کے لیے ہمیں انتخابی اصلاحات کرنا ہوں گی اور جن جن حلقوں میں دھاندلی ہوئی ہے وہاں دوبارہ گنتی......

ہم بولتے چلے جارہے تھے کہ ایک دم بیکری والا چلا کر بولا ''بھائی! اس کا میری ڈبل روٹی اور سات روپے سے کیا لینا؟ آپ مجھے میرے پیسے دو اور جو کرنا ہے جا کے کرو۔''

ہم بولے: ''خاں صاحب نے ٹیکس دینے سے منع کیا ہے۔ اسی لیے ٹیکس تو......''

ابھی ہم نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک زناٹے دار لافا ہمارے کان اور گدی کے درمیانی حصہ میں آ لگا اور جیسے کان میں ریل گاڑی والی سیٹی بج گئی۔ جب سیٹی کی آواز کچھ کم ہوئی تو احساس ہوا کہ بیکری والا کچھ غلیظ الفاظ سے ہمیں مخاطب کر رہا ہے۔ ابھی ہم اُن الفاظ کی گہرائی جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ بیکری والے کے سخت ہاتھوں سے لے کر بھاری پاؤں ہمارے جسم کے اُن اعضا پر پڑنے لگے جن کا یہاں ذکر کرنا مزید تکلیف کا باعث ہوسکتا ہے۔

خیر جناب ہم ڈبل روٹی چھوڑ چھاڑ بیکری سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے اور تب تک بھاگتے رہے جب تک موٹی گالیوں کی آوازیں آنا بند نہیں ہوگئیں۔ جب حواس کچھ بحال ہوئے تو سوچنے لگے کہ اخبار کے بل سے لے کر موبائل کارڈ تک اور بچوں کے دودھ سے ہماری سگریٹوں تک...... ہر چیز خریدنے سے پہلے کیا اسی عمل سے گزرنا پڑے گا؟ ہر دکاندار اور ریڑھی والے سے ہر دفعہ اتنا ہی پٹنا اور اتنی گالیاں سننا کوئی آسان عمل نہیں ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے، سول نافرمانی کی تحریک چلانا کوئی آسان کام نہیں۔

خیر کوئی بات نہیں، جب ہمارے خاں جی وزیراعظم بن جائیں گے، تو میں بیکری والے اور اُس کے ساتھ ملی تب کی حکومت کو جو میرے ساتھ ہونے والی دھاندلی میں برابر کی شریک تھی، گھسیٹ کر عوام کی عدالت میں لاؤں گا اور ان سب کا احتساب کروں گا۔

◆◆◆

لفظ لفظ خوشبو

☆ بدترین ہے وہ شخص جو توبہ کی امید پر گناہ کرے (خواجہ غریب نواز)

☆ جو سچائی جھوٹ کے مشابہ ہو اسے اختیار مت کرو۔ (حضرت فرید گنج شکر)

☆ زیادہ خوشحالی ور زیادہ بدحالی، دونوں برائی کی طرف لے جاتے ہیں۔ (بوعلی سینا)

☆ علم کے بغیر انسان کو خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ (شیخ سعدی)

☆ دلوں کو فتح کرنے کے لیے تلوار کی نہیں عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ (شیکسپیئر)

پہلے شیخ صاحب کو عمران خاں صاحب کا انھیں چپراسی کی نوکری نہ دینے کا اعلان کرنے پر ہوئی تھی۔

شیخ صاحب کا موقف یہ تھا کہ انھوں نے کبھی اس نوکری کے لیے درخواست ہی نہیں دی' تو "ریجیکٹ" ہونے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ یہ الگ بات کہ ہمارے ذرائع کے مطابق ہے' شیخ صاحب کو نوکری نہ ملنے سے زیادہ صدمہ اس بات کا جلسہ میں اعلان کرنے پر ہوا۔ کچھ دوستوں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ شیخ صاحب اس توہین کو آج تک نہیں بھولے اور نہ ہی اُن کا ایسا کوئی ارادہ ہے۔

بہرحال ڈبل روٹی کا جائزہ لیتے ہوئے ہم بیکری والے بھائی سے مخاطب ہوئے "کتنے کی ہے؟"

اس سوال پر بیکری والا حیرانی سے ہمیں ایسے دیکھنے لگا جیسے ہم نے کچھ حلقوں میں دوبارہ گنتی کی صدا لگا دی ہو۔ لیکن اُس کی یہ حیرانی بجا بھی تھی۔ یہی ڈبل روٹی ہم روز لے جایا کرتے تھے اور اُس کے حساب سے ہمیں قیمت کا بھی خوب اندازہ تھا پھر یہ سوال کیوں؟ خیر اپنی حیرت پر قابو پا کے اُس نے جواب دیا:

بیکری والا: "بھائی صاحب کیا ہو گیا ہے؟ آپ تو روزانہ لے جاتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے چھوٹی ڈبل روٹی پینتالیس روپے کی ہے۔"

ہم بولے: "اچھا اور اس پر ٹیکس کتنا لیتے ہو آپ؟"

بیکری والا: "بھائی! ٹیکس ہم نہیں حکومت والے لیتے ہیں۔"

بس اس جواب نے رات میں دھرنے پہ ہونے والی تقریر پر جیسے حق و سچ کا ٹھپا لگا دیا۔

ہم بولے: "ہاں بھائی وہی جو حکومت لیتی ہے' مگر کتنا؟"

بیکری والا جیسے جھلا سا گیا' قدرے سڑ کر بولا "او بھائی صاحب! روپے پہ پندرہ یا سولہ پیسے۔"

ہم نے فوراً اپنا دماغی کیلکولیٹر چالو کر دیا اور حساب لگانے لگے ہمارے حساب کے مطابق سرکار ڈبل روٹی کی مد میں ہم سے ۷ روپے ۲۰ پیسے ٹیکس لے رہی تھی۔ گویا ٹیکس کے بغیر ڈبل روٹی فقط سینتیس روپے اور اسی پیسوں کی بنی۔"

دھرنے پر ہوئے خطاب اور اپنے حساب کتاب کی روشنی میں ہم نے جیب سے چالیس روپے نکال کر بیکری والے کو دیے اور اُس سے بولے "بھیا اڑتیس روپے کاٹ کر دو روپے واپس کر دو۔"

ہمارا اتنا کہنا تھا کہ کہ بیکری والے کو لگا' ہم نے ٹیکنوکریٹس والی غیرسیاسی نگراں حکومت کی بات کر دی ہو۔ وہ ہاشمی صاحب جیسی برہم شکل بنا کر اپنے اسٹول سے قریباً اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا: بھائی! پانچ سات روپے کے لیے سویرے سویرے میرا دماغ کیوں کھا رہے ہو؟ اگر پیسے نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں' کل دے دینا پر مذاق تو نہ کرو۔"

ہم بولے: "بھیا! بات پیسوں نہیں اصول کی ہے۔ جو تمہاری ڈبل روٹی کے پیسے ہیں' وہ تم لو۔ جو سرکار کی جی ایس ٹی ہے' وہ سرکار جانے اور ہم! جب وہ تم سے یہ سات روپے بیس پیسے لینے آئیں تو انھیں ہمارے گھر بھیج دینا' ہم اُن سے خود بات کر لیں گے۔ اب تم اپنے پیسے کاٹو اور ہمیں دو روپے واپس کرو تو ہم جائیں۔"

ہماری باتیں جیسے بیکری والے کے سر پر سے گزر گئیں۔ وہ ہمیں یوں تکنے لگا جیسے ہم سو کے اُٹھ کر بنی گالا جاتے کپتان کو کچھ دیر پہلے تک رہے تھے۔

بیکری والا: "بھائی مگر حکومت والے آپ کے گھر کیوں آئیں گے ٹیکس لینے' وہ تو ہم سے ہی مانگیں گے نا؟"

جس کی لاٹھی، اُس کا گلو

سول نافرمانی کی تحریک چلانا آسان نہیں' اس میں گالیاں سننا اور مار سہنا پڑتی ہے

ارسلان خان

صبح ساڑھے چھے بجے کا وقت تھا۔ میں ایک دھرنے سے اپنی نیند پوری کر کے واپس گھر جا رہا تھا کہ بیوی صاحبہ کا فون آیا "میاں! آتے ہوئے محلے کی بیکری سے ڈبل روٹی لیتے آنا۔"

بیوی صاحبہ کا حکم تھا' لہٰذا جا گھسے قریبی بیکری میں۔ بیکری والا ویسے تو ہمیں جانتا ہی تھا مگر خلاف توقع آج اس نے زیادہ "لفٹ" نہیں کروائی...... خیر ہمیں کیا؟

بیکری والا: "جی بھائی صاحب؟"

ہم بولے: "بس بھیا ایک چھوٹی ڈبل روٹی دے دو۔"

بیکری والے نے ڈبل روٹی ہماری طرف بڑھا دی۔ ہم ہاتھ میں لے کر اُس کا یوں جائزہ لینے لگے جیسے مارشل لا لگتے ہی آئین کا لیا جاتا ہے۔ بیکری والے کو ہماری یہ ادا اتنی ہی ناگوار گزری جتنی کچھ سال

بنیاد مفاد پرستی پر رکھنے کے بجائے خلوص، الفت اور محبت جیسے جذبات کو فروغ دیں۔ یوں ہمارا معاشرہ مثالی بن سکتا ہے۔

وقت کی کمی کے سلسلے میں ایم اے او کالج، لاہور میں پروفیسر عربی، جناب شاہد چودھری سے بات کی گئی تو انھوں نے کہا کہ انسان کے پاس جوں جوں سہولیات آئیں، اس کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ مثلاً پہلے ٹی وی، کمپیوٹر وغیرہ نہیں تھے، اکثر لوگوں کے پاس کار بھی نہ تھی تو خاصی فراغت رہتی۔ درختوں کے نیچے بیٹھ کر رات تک قصے کہانیوں کا سلسلہ چلتا۔ پھر انسان سہولیات ملنے سے مصروف ہوتا چلا گیا۔

"اس کے اخراجات بھی بڑھے۔ اخراجات پورا کرنے کے لیے اضافی بچت زندگی کا حصہ بن گئی۔ کچھ اور معاملات مثلاً مہنگائی، ملکی سیاسی حالات وغیرہ کے نتیجے میں بھی اخلاقی اقدار پامال ہو گئیں۔ انسان صرف اور صرف روٹی کھانے کے چکر میں پڑ گیا۔ اب ایسا وقت آ چکا کہ تعلق، رشتے تو ایک طرف، بچے پالنا مشکل ہو گیا ہے۔ شادی بیاہ یا خوشی کی دوسری تقریبات میں شرکت تو درکنار، جنازے میں بھی حاضری کم ہو گئی ہے۔ ایسے میں اگر انسان یہ نہ کہے کہ میرے پاس وقت نہیں ہے تو اور کیا کہے؟"

ایک گھریلو خاتون کا کہنا ہے، جدید ٹیکنالوجی نے جس قدر انسانی زندگی کو سہل بنا دیا ہے، انسان کی ہوس کو اسی قدر ہوا دی۔ وہ بہتر سے بہترین اشیا کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ یہ نفسانفسی اس قدر بڑھی کہ لوگوں کی اکثریت صرف اپنی ذات کے نفع و نقصانات سوچنے تک محدود ہو گئی اور معاشرے میں اجتماعی سوچ کا فقدان ہو گیا۔ اس لیے ہر شخص کے پاس دوسرے کی خاطر وقت کم ہونے لگا۔

اس کے باوجود چوبیس گھنٹوں میں سے اگر آٹھ گھنٹے نیند اور آٹھ گھنٹے تعمیری مقاصد مثلاً پڑھنے، ملازمت کرنے کے لیے نکال دیے جائیں، تب بھی ہمارے پاس آٹھ گھنٹے بچتے ہیں۔ ان میں ہم سیر و تفریح، فلاحی کام، دوست احباب اور رشتے داروں کے لیے وقت نکال سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ہم اپنا بیشتر وقت بے مقصد کاموں، فارغ بیٹھنے یا پھر خوش گپیوں میں صرف کر دیتے ہیں۔ جب کسی بامقصد کام کے لیے ہمیں وقت نکالنا پڑے تو آرام سے کہہ دیتے ہیں "ہم بہت مصروف ہیں، ہمارے پاس وقت نہیں۔ صرف پندرہ یا بیس فیصد لوگ ہی نیکی یا فلاحی کام کے لیے وقت نکالتے ہیں۔"

اگر ہم اپنا وقت صحیح کاموں کے لیے استعمال کریں اور روزانہ کا نظام ترتیب دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے خاندان اور دیگر (لوگوں کے) امور کے لیے وقت نہ نکال سکیں۔"

ڈاکٹر باجوہ حنیف فاطمہ میموریل اسپتال میں پروفیسر آف آبسٹرک اینڈ گائنی ہیں۔ وہ کہتی ہیں "جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ہمارے پاس وقت نہیں، وہ بالکل غلط کہتے ہیں۔ میں نے اپنی بیٹی کی بہترین پرورش اپنی مصروف ترین زندگی سے وقت نکال کر ہی کی ہے۔ اگر ہم اپنا وقت صحیح کاموں کے لیے استعمال کریں اور روزانہ کا نظام ترتیب دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے خاندان اور دیگر (لوگوں کے) امور کے لیے وقت نہ نکال سکیں۔"

افراد ہیں تو ہر ایک کے آنے جانے کے اوقات الگ الگ ہیں۔

ایسی صورت میں سب ایک جگہ کھانے پر بمشکل اکٹھے ہوتے ہیں۔ نتیجتاً ایک ہی گھر میں رہنے والے افراد کے دلوں میں ایک دوسرے سے وابستہ غلط فہمیاں ختم ہونے کے بجائے بڑھ جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ والدین اور بچوں کے درمیان سردمہری پیدا ہو جاتی ہے۔ والدین کو یہ شکوہ رہتا ہے کہ بچے ان کا کہنا نہیں مانتے' ہم کچھ کہتے ہیں لیکن نوجوان نسل اپنی ہی مرضی کرتی ہے۔

نوجوان نسل کہتی ہے کہ اب زمانہ بدل چکا' ہمیں اپنے زمانے کی اقدار مدنظر رکھتے ہوئے مرضی کے فیصلوں کا اختیار ہے۔ اسی چیز کو ہم جنریشن گیپ (Generation Gap) یا نسلی تفاوت کا نام دیتے ہیں۔ لیکن یہ نسلی تفاوت اور بہت سی الجھنیں ختم ہو سکتی ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ خواہ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں' اپنے اہل خانہ اور بچوں کے لیے وقت ضرور نکالیے۔

ملک میں زر کی غیر منصفانہ تقسیم نے بھی عوام کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہ طبقاتی فرق روز بروز بڑھ رہا ہے۔ لوئر کلاس' مڈل کلاس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تگ و دو میں مصروف ہے۔ مڈل کلاس اپر کلاس میں چھلانگ لگانے کے لیے دن رات کوشش کر رہی ہے۔ اس وجہ سے یہ صورت حال ہو چکی کہ انسانوں کی زندگی مشینی بن گئی ہے۔ ایک آدمی دن رات مصروف رہنے کی وجہ سے آرام کے اوقات بھی کام کرتے گزارتا ہے۔

جب انسانی زندگی کی حیثیت چوبیس گھنٹے کام کرنے والی مشین کی طرح ہو جائے تو ٹینشن اور ڈپریشن جیسی بیماریوں کا جنم لینا فطری ہے۔ اسٹیٹس سمبل (Status Symbol) کے حصول نے زندگی کو مصروف ترین بنا دیا ہے۔ لوگوں کے پاس آرام کرنے اور سکون کا سانس لینے کی فرصت نہیں تو دوسرے لوگوں کے لیے وقت کہاں سے آئے گا؟

اسی مشینی زندگی میں اگر کچھ وقت سکون کا نکال لیا جائے تو وہ ٹی وی کی نذر ہو جاتا ہے۔ شام کے وہ فارغ اوقات جن میں اہل خانہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے اور خوش گپیوں میں مصروف رہتے تھے' اب ان نشستوں کی جگہ ٹی وی نے لے لی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بچے بھی بوڑھوں کے پاس بیٹھ کر جنوں اور پریوں کی کہانیاں سننے کے بجائے ٹی وی پر ٹام اینڈ جیری (Tom & Jerry) دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ نوجوان نسل بھی بغرض تفریح ٹی وی دیکھنے کے لیے اپنی مصروفیات میں سے وقت ضرور نکال لیتی ہے چاہے اہل خانہ کو نہ دے سکے۔ اب تمام اہل خانہ آپس میں گھلنے ملنے کے بجائے ٹی وی دیکھنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔

> جب انسانی زندگی کی حیثیت چوبیس گھنٹے کام کرنے والی مشین کی طرح ہو جائے تو ٹینشن اور ڈپریشن جیسی بیماریوں کا جنم لینا فطری ہے۔

وقت کی کمی کی وجہ سے موجودہ دور میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں' ان سے مناسب طور پر نبرد آزما ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم دوستوں' رشتے داروں اور متعلقہ احباب کے لیے وقت نکالیں' اہم معاملات پر ان سے تبادلہ خیال کریں اور ان رشتے ناتوں اور دوستیوں کی

جب سے انھوں نے الگ گھر لیا ہے، میں تو پوتا پوتی کی شکل دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔ وہ بڑھاپے میں تنہائی کا شکار ہیں۔

جہانگیر صاحب نے تو تنہائی سے دوستی کر لی ہے کیونکہ بیٹا صبح کا نکلا شام کو گھر لوٹتا ہے۔ شام کے وقت بھی اسے دفتر کے کام گھر پر نکل آتے ہیں۔ اسی لیے اس کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ بہو صبح اسپتال میں ملازمت کرنے کے بعد شام کو اپنا کلینک چلاتی ہے۔ بیٹے اور بہو میں سے کسی کے پاس وقت نہیں کہ کچھ لمحے ماں باپ کے پاس گزار لیں۔ ان سے ہنسی خوشی تھوڑی دیر بات ہی کر لیں تاکہ وہ بڑھاپے میں تنہائی کا شکار نہ ہوں۔

دنیا کے کام تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ ماں باپ وہ ہستی ہیں جو اپنے آپ کو بھلا کر اپنی خواہشیں مار کے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ لیکن وہ مقررہ مدت تک ہی اولاد کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اگر اس محدود وقت میں بھی بچوں کے پاس ان کے لیے وقت نہ ہو تو بعد میں پچھتاوا ہی رہ جاتا ہے۔

ماضی میں ہمارے معاشرے میں مشترکہ خاندانی نظام مروج تھا۔ تمام رشتے دار اور افراد آپس میں مل جل کر ایک ہی گھر میں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دوسرے کے لیے محبت و الفت کے جذبات موجزن تھے۔ لیکن اب ان جذبات کا فقدان نظر آتا ہے کہ علیحدہ گھر میں رہنے کا نظام زور پکڑ چکا۔ پہلے بچوں یا جوانوں کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا' تو گھر کے بڑے بوڑھے اسے حل کر لیتے۔ بڑوں کا کیا ہوا فیصلہ سب فریقوں کے لیے قابل قبول ہوتا۔ یوں خاندان میں خوشگوار فضا بھی قائم ہو جاتی۔ گھر کا انتظام و انصرام ایک فرد کے ہاتھ میں رہنے کی وجہ سے اہل خانہ کو ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کے مواقع زیادہ میسر آتے لیکن زمانے نے کروٹ بدلی اور وقت گزرنے کے ساتھ ہی مشترکہ خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔

معاشرے کی اقدار و روایات بھی تبدیل ہونا شروع ہو گئیں۔ اب حالات یہ ہیں کہ ہر شخص اپنے فیصلے کرنے میں خود مختار ہے۔ بچے بزرگوں کے فیصلوں کو غلط سمجھتے ہیں۔ نوجوان نسل کہتی ہے کہ زندگی ہماری ہے' ہم جیسے چاہیں اپنی زندگی سے متعلق فیصلے کریں۔ اکثر اوقات نوجوان اپنی ناتجربہ کاری کے باعث اپنے فیصلوں سے نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔ کیونکہ بزرگوں کے فیصلوں کی بنیاد تجربے پر ہوتی ہے۔ اہم معاملات میں فیصلوں کی بنیاد اگر تجربات پر نہ رکھی جائے تو نقصان کا خدشہ ہوتا ہے۔

اکثر اوقات نوجوان اپنی ناتجربہ کاری کے باعث اپنے فیصلوں سے نقصان بھی اٹھاتے ہیں۔ کیونکہ بزرگوں کے فیصلوں کی بنیاد تجربے پر ہوتی ہے۔

وقت کم ہونے سے نوجوان نسل اور والدین و بزرگوں کے درمیان رابطے کا جو خلا پیدا ہوا ہے' وہ ایک دوسرے کے لیے وقت نکال کر ہی پورا ہو سکتا ہے۔ معاشرے میں خوش اخلاقی' رکھ رکھاؤ' ہمسایوں کے ساتھ نیک سلوک جیسے مثبت رویوں میں کمی واقع ہوئی ہے۔ آپ خواہ کسی بھی شعبے میں چلے جائیں' کسی سے کوئی بات پوچھنی ہو' کوئی رائے معلوم کرنی ہو یا کسی اہم بات پر گھر کے افراد خانہ سے گفتگو کرنی ہو یا کوئی مسئلہ حل کرنا ہو' ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے بھی افراد خانہ کے ساتھ پہلے وقت طے کرنا پڑتا ہے۔ آج گھر میں اگر چھے

''فاخرہ باجی کی شادی ہے اور آپ دفتر سے دو دن کی چھٹی نہیں لے سکتے؟'' مسز فیاض ناگواری سے شوہر سے مخاطب ہوئی۔

''سمیرا! میں تمھیں پہلے ہی بتا چکا کہ پرسوں کراچی سے وفد آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ معاہدے سے ہمارے کاروبار کو کروڑوں روپے کا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے میرے پاس تو وقت بالکل نہیں، بس تم خود ہی چلی جانا۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور دفتر روانہ ہو گئے۔

یہ تھی چند گھروں کی صورت حال، جہاں ہر شخص اپنی ذات میں اتنا مصروف ہے کہ دوسرے لوگوں کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں۔ آپ کوئی کاروبار چلا رہے ہیں، دفتر میں ملازمت کرتے ہیں، طالب علم ہیں یا گھریلو خاتون، آج ہر شخص اتنا مصروف ہو چکا کہ ہماری روزمرہ زندگی میں تعلّقات کا دائرہ محدود ہوتا جا رہا ہے۔

بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ خاندانی رشتے ناتے ٹوٹ کر ان کی جگہ مطلب کی دوستیوں نے لے لی ہے تو غلط نہ ہو گا۔ دور جدید میں اتنی افراتفری اور نفسانفسی پھیل چکی کہ ہر شخص دوستی کرنے سے پہلے یہ دیکھتا ہے اسے اس سے کتنا مفاد ملے گا؟ اگر کوئی مفاد نظر آئے تو تعلّقات بڑھائے جاتے ہیں ورنہ بات سلام دعا تک ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر مفادات نہ ہوں تو دوستی کو وقت کا ضیاع سمجھا جاتا ہے۔ تعلّقات میں خلوص اور ہمدردی جیسے جذبات کا فقدان ہو چکا۔ ان جذبات کی جگہ مفادات نے لے لی ہے۔ ہم سب لوگ اس قدر مصروف ہو گئے ہیں کہ ہمارے پاس رشتے قائم رکھنے کے لیے وقت نہیں۔

سوال یہ ہے کہ وقت کیوں نہیں ہے؟

ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ معاشرے میں نفسانفسی کا عالم ہے۔ ہر شخص دوسرے سے ''سوشل سٹیٹس'' اور مادی اشیا حاصل کرنے کی دوڑ میں آگے نکلنے کی فکر میں ہے۔ یہ منزل پانے کے لیے اکثر شوہر اور بیوی مل کر ملازمتیں کرتے ہیں۔ پھر بھی معاشی مسائل کا شکوہ ان کے لبوں پر رہتا ہے۔ بڑھتی مہنگائی نے بھی شوہر اور بیوی کو ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ خواتین میں بڑھتی معاشرتی آگاہی کی وجہ سے بھی وہ فالتو بیٹھنے کی نسبت نوکری کرنے کو زیادہ ترجیح دیتی ہیں لیکن پھر ہوتا یہ ہے کہ ایک دوسرے کے لیے وقت کی کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ تب بہت سے چھوٹے چھوٹے مسائل وقت کی کمی کے باعث جنم لیتے ہیں۔

> **پہلے بچوں یا جوانوں کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا، تو گھر کے بڑے بوڑھے اسے حل کر لیتے۔ بڑوں کا کیا ہوا فیصلہ سب فریقوں کے لیے قابل قبول ہوتا۔ یوں خاندان میں خوشگوار فضا بھی قائم ہو جاتی۔**

رفتہ رفتہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غلط فہمیاں پیدا ہونے لگتی ہیں کیونکہ ہمارے پاس وقت نہیں ہوتا کہ ہم انھیں بیٹھ کر حل کرنے کی کوشش کریں۔ آہستہ آہستہ وقت کی کمی کی وجہ سے پیدا ہونے والی غلط فہمیاں ہمارے تعلّقات میں خلیج حائل کر دیتی ہیں۔ نوبت آخر لڑائی جھگڑوں تک جا پہنچتی ہے۔

مسز مائرہ جہانگیر ایک ریٹائرڈ خاتون ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میرا بیٹا اور بہو دونوں نوکری کر...

وقت نہیں ہے

آج کے انسان نے خود کو اتنا مصروف کر لیا ہے کہ بے جان مشین اور اس میں کوئی فرق باقی نہیں رہا......

دل و دماغ پر دستک دیتی اچھوتی تحریر

محمد ضیاالرحمٰن

''اوہو آج بھی کالج سے دیر ہوگئی۔ عامر بھائی! پلیز، آپ مجھے کالج چھوڑ دیں۔'' سیما گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بھائی سے مخاطب ہوئی۔

''معاف کرنا بھئی، میرے پاس بالکل وقت نہیں، میں خود پہلے ہی دفتر سے لیٹ ہو چکا۔'' عامر جلدی میں سلائس منہ میں ڈالتا اُٹھ کھڑا ہوا۔

......☆......

''ابو! کل میرے اسکول میں یوم والدین منایا جا رہا ہے، آپ اس میں شرکت کریں گے نا؟'' احسن نے اسکول جانے سے پہلے بابا کو یاددہانی کرائی۔

''معاف کرنا بیٹا، کل تو میری ضروری میٹنگ ہے۔ تقریب میں نہیں آ سکتا۔ امی کو لے جاؤ۔'' انھوں نے جواز پیش کیا۔ ''میرے لیے وقت نکالنا بہت مشکل ہے۔''

......☆......

''شکریہ سر۔ منرل واٹر کی بوتلوں کا ایک ٹرک ابھی استعمال نہیں ہوا۔''

ایسا کرو اسے رکھ دو حفاظت سے، کام آئے گا۔ ابھی تو خبر گرم ہے، لوگوں کا آنا جانا لگا رہے گا۔ ابھی ہم سرکاری چیزوں کو بانٹ نہیں سکتے۔''

''جی سر، ٹھیک ہے۔ کھانے کا کیا کروں؟''

''ایسا کرو تم لے جاؤ۔ تم نے بڑی محنت کی ہے۔ اپنے رشتے داروں میں بانٹ دینا۔''

''جی سر، ٹھیک ہے۔''

☆

''سر! میڈیا والے آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''کہہ دو میں مصروف ہوں، ابھی نہیں مل سکتا۔''

''سر! ڈاکٹر صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔''

''ہاں انھیں اندر بھیج دو۔''

''کچھ امداد ملی؟''

''ڈاکٹر صاحب! اعلان تو ہوا ہے۔ وزیراعلیٰ کے علاوہ وزیراعظم نے بھی اربوں روپے دینے کا اعلان کیا ہے۔''

''مگر ہمیں اربوں روپے نہیں ادویہ اور خوراک چاہیے۔''

''سائیں نقد روپے بھی لوگوں کو دیے ہیں۔''

''ہمیں روپے کی ضرورت نہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب! انھی اربوں روپے سے دوائیں اور خوراک آئے گی۔''

''مگر کب؟''

''ابھی صرف اعلان ہوا ہے، جب فنڈ جاری ہو گا تب۔''

''مگر تب تک صورت حال اور گمبھیر ہو جائے گی۔''

''نہ آپ کچھ کر سکتے ہیں نہ میں۔ ایک اور بات ڈاکٹر صاحب! آج ہی مجھے سائیں نے ٹرانسفر کی خوشخبری سنائی ہے۔ میرا مشورہ ہے آپ بھی واپس امریکا چلے جائیں۔ صورت حال سنبھالتے سنبھالتے میرے اعصاب شل ہو چکے۔ شکر ہے سائیں کو مجھ پر ترس آ گیا اور انھوں نے میرا ٹرانسفر کرا ہی دیا۔

''مگر یہ لوگ......''

''ڈاکٹر صاحب! ایک بات یاد رکھیں۔ یہاں کوئی مسیحا نہیں آئے گا۔ یہ لوگ ظلم سہنے کے عادی ہو چکے۔ بلکہ انھیں معلوم ہی نہیں ظلم کیا ہے اور زندگی کیا۔ جب تک یہ نیند سے نہیں جاگتے، ان کی حالت نہیں بدل سکتی۔ نیند بھی موت کا ایک روپ ہے۔ جب تک یہ اس کو شکست نہیں دیتے، ان کی حالت نہیں بدلے گی۔ ہو سکتا ہے، ان ہی میں سے کوئی نیند کے حصار سے نکل آئے اور جاگ جائے۔ تب تک یہ بھوک اور پیاس ان پر مسلّط رہے گی۔

کام کی باتیں

☆۔ ہدایت کے بعد گمراہی اپنا لینا پرلے درجے کا اندھا پن ہے۔

☆۔ ہوا و ہوس سے بچو، یہ انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔

☆۔ ظالم بادشاہ کے سامنے سچی بات کہنا بہت بڑا جہاد ہے۔

☆۔ خدا اس ستر سالہ بڈھے کو پسند نہیں کرتا جو اپنی رفتار اور صورت میں بیس سالہ نوجوان کا سا انداز رکھے۔

لاتے ہیں۔ کچھ تو راستے میں ہی ان کی گود میں دم توڑ دیتے ہیں کچھ یہاں پہنچ کر۔ مگر یہ لوگ کوئی احتجاج نہیں کرتے، خاموشی سے لاشیں لے جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے، یہ لوگ ہماری دنیا کے ہیں ہی نہیں!"

"ڈاکٹر صاحب! یہ ہم سے مایوس ہو چکے۔ مگر اپنی زمین چھوڑنے کو تیار نہیں حالانکہ اس صحرا نے انھیں موت اور بھوک کے سوا کچھ نہیں دیا۔"

"میں نے اپنے دوستوں سے رابطہ کیا ہے۔ وہ ایک دو دن میں دوائیں اور خوراک لے کر یہاں آرہے ہیں۔ شاید کچھ مدد ہو سکے۔"

"ڈاکٹر صاحب! کل ضرور تشریف لائیے۔ ہم نے کیمپ لگوایا ہے۔ وزیر اعلیٰ اور ولی عہد کل یہاں دورے پر آ رہے ہیں۔"

"مجھے معاف کیجیے۔ یہ آپ کی ڈیوٹی ہے، آپ نبھائیے۔ میں چلتا ہوں۔ مریض انتظار کر رہے ہوں گے۔"

☆

"سر! ایک نظر سارے انتظامات دیکھ لیجیے۔"

"یہ بتاؤ، کھانے میں کون سی ڈشیں رکھی ہیں؟"

"سر! کوفتہ، بریانی، مچھلی، تکے، کباب اور میٹھے میں کافی چیزیں ہیں۔"

"ایسا کرو کچھ "کونٹی نینٹل" بھی رکھواؤ، ولی عہد بھی تو ہیں۔"

"جی سر، یہ باورچی فائیو اسٹار ہوٹل کا ہے، میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔"

"اچھا دیکھو، کھانا اچھی خاصی مقدار میں بنوانا، بچ جائے تو کوئی فکر کی بات نہیں، مگر کم نہ پڑے۔"

"سر! میں نے ہر چیز دوگنی پکوائی ہے، آپ فکر نہ کریں۔"

ٹھیک ہے چلو پھر میں سارے انتظامات دیکھتا ہوں۔

☆

قحط زدہ تھر میں شاندار دعوت کا منظر جس میں وزرا شریک تھے

"سائیں غفلت تو ہوئی ہے مگر میڈیا بڑھا چڑھا کر بتا رہا ہے۔ بہرحال وزیراعلیٰ نے اربوں روپے کی امداد کا اعلان کیا ہے۔ ولی عہد نے بھی عہد کیا ہے کہ جب تک تھر کی حالت نہیں بدلتی، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

"باقی سب ٹھیک ہے؟"

"جی سر، سب ٹھیک ہے۔"

"میڈیا والے تھے کھانے پر؟"

"جی سر، سارے تھے۔"

"سب لوگ چلے گئے ہیں؟"

"جی سر، سب چلے گئے۔"

"اب سامان جا رہا ہے۔ کھانا کافی بچ گیا ہے۔"

"تم نے کھانا اچھا بنوایا تھا۔"

ولی عہد کے دوروں سے کسی کی جان نہیں بچے گی۔"

"ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی بات سے متفق ہوں۔ سب کچھ واضح ہے۔ لیکن جو میرے اختیار میں ہے، وہ کچھ بھی نہیں۔"

"کہاں ہیں وہ روشن خیال این جی اوز؟"

"دیکھیے ڈاکٹر صاحب، این جی اوز کو تو کوئی گرما گرم موضوع چاہیے جیسے کاروکاری اور بے حرمتی...... بھوک اور افلاس دور کرنے کے لیے انھیں فنڈ نہیں ملتا۔"

"فنڈ یہاں کی جہالت اور ظلم اجاگر کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ کیا بے گناہوں کی موت ظلم نہیں؟"

"ڈاکٹر صاحب! بے گناہ تو پوری دنیا میں مارے جاتے ہیں۔ میں نے کہا نہ کہ یہ ان کے لیے گرم موضوع نہیں۔ آپ بہت حساس ہیں۔ ذرا اپنے ہسپتال پر نگاہ دوڑائیے۔ کتنے ڈاکٹر اس علاقے کے ہیں؟ صرف وہی یہاں کام کر رہے ہیں۔ جن کی مجبوری ہے۔ اور یہ دیکھیے یہ فائلیں، سب نے ٹرانسفر کی درخواستیں جمع کرائی ہیں۔ بہت سے تو جا چکے۔ آپ خود اس علاقے سے تعلق نہیں رکھتے، یہ خدمت انسانیت کا جذبہ ہے جو آپ کو یہاں روکے ہوئے ہے۔ سب بہتر مستقبل کے لیے یہ جگہ چھوڑ گئے۔ مگر آپ بتائیے، یہ ڈاکٹر کس ڈومیسائل پر بنے ہیں...... اس علاقے کے لیکن اب کہاں خدمت کر رہے ہیں؟

"ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹروں ہی نہیں ہر شعبے کا یہی حال ہے۔ سب کو بہتر مستقبل چاہیے، کوئی قربانی دینے کو تیار نہیں۔ میں خود یہاں اپنی مرضی سے نہیں آیا، بھیجا گیا ہوں۔ بیوی بچے یہاں نہیں آئے۔ مجھے بھی موقع ملا، تو چلا جاؤں گا۔"

"لیکن کب تک چلے گا یہ سب کچھ؟ ظلم کی حد ہوتی ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! ابھی ظلم کی حد پار نہیں ہوئی، مزید بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ یہ دیکھیے، یہاں کے لوگ تو جانتے ہی نہیں کہ ان کی بھوک، پیاس اور موت اوروں کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ جب یہ جان جائیں گے تب ظلم اپنے انجام کو پہنچے گا۔"

"مجھے تو یہ سن کر افسوس ہوا کہ حکومت کہتی ہے، فلاں نہیں اتنے بچے مرے۔"

"ڈاکٹر صاحب! آپ بھی جانتے ہیں، میڈیا پر جو تعداد بتائی جا رہی ہے، وہ اصل تعداد سے کم ہے۔ میڈیا بھی وہی بتائے گا، جس کی اسے اطلاع ہو گی۔ آپ اور ہم جانتے ہیں کہ کتنے بچے مرے ہیں مگر کیا ہو گا، کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔ یہ جو اتنے برسوں بعد یہ سڑک بنی ہے ریگستان میں، یہ بھی لوگوں کو موت سے نہیں بچا سکتی۔ کئی بچے صرف اسی لیے مر گئے کہ وہ ہسپتال نہیں پہنچ سکے۔"

"آپ ہی کچھ کیجیے، اعلیٰ حکام کو جھنجھوڑیے۔"

"اعلیٰ حکام کے کیا کہنے! تھر کا قحط وفاق کی ذمہ داری نہیں۔ صوبائی حکومت کی ترجیحات میں یہ شامل نہیں۔ یہ آپ کے علم میں ہے کہ یہاں کے منتخب نمائندے بڑے خاندانوں اور بڑی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر آنچ نہیں آسکتی، چاہے جتنے لوگ مر جائیں۔

"ڈاکٹر صاحب! یہ سب جانتے ہیں کہ یہاں ڈاکٹروں کو تعینات کیا جائے۔ پانی مہیا اور غذائی قلت دور کی جائے۔ مگر ڈاکٹروں کا تقرر نہیں ہو گا۔ اگر بعض آ بھی گئے تو وہ یہاں سے ٹرانسفر کرا لیں گے۔ آپ جانتے ہیں، ٹنوں گندم خراب ہو گئی اور پانی اس صحرا کے نصیب میں نہیں۔

"عجیب سی مایوسی ہے۔ یہاں کے لوگ بچوں کو

پر چلے جانا۔"

"جی سر آپ کا بہت شکریہ۔ جب بھی کوئی کام ہو، آپ مجھے یاد کر سکتے ہیں۔"

"ہاں کیوں نہیں تم جیسا فرض شناس مشکل سے ملتا ہے۔"

"اچھا یہ میڈیا والوں کو بھی سنبھالنا ہے۔"

"جی سر، ان کے لیے بھی شاندار انتظام کیا ہے۔"

"یہ بھی کسی خبر کے پیچھے پڑ جائیں تو چھوڑتے نہیں۔"

"سر! یہ تو دو تین دن کا قصہ ہے، پھر کوئی اور نئی خبر آ جائے گی۔"

"موروں کے مرنے کی خبر دیتے رہتے تو ٹھیک تھا۔ ان سے پوچھو، لوگ تو یہاں برسوں سے مر رہے ہیں، انھیں اب خیال آیا خبر دینے کا؟"

"سر! ابھی کوئی اور گرم خبر نہیں تھی، اس لیے بس تھر پر تان ٹوٹی۔"

"اچھا اس چینل کو ضرور بلانا جس نے بچوں کے مرنے کی خبر سب سے پہلے چلائی تھی۔"

"سر میں نے کئی چینل والوں کو کہہ دیا ہے، سب آئیں گے۔"

"ہاں وزیر اعلیٰ تو آ ہی رہے ہیں، ساتھ میں ولی عہد بھی ہیں۔ ولی عہد ابھی جشن ثقافت منا کر فارغ ہوئے ہیں۔ اسے کہتے ہیں کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔"

"جی سر، مجھے ابھی پتا چلا ہے۔"

"ایسا کرو، دونوں کو برابر کوریج دینا۔"

"جی سر، دونوں کو ایک ہی جگہ کا دورہ کرا دیں گے۔"

"ہاں بھئی ہماری مصیبت ہے، کوئی اونچ نیچ نہ ہو جائے۔"

"سر! آپ بالکل فکر نہ کریں، سب کام ٹھیک طریقے سے ہو جائے گا۔"

"اچھا ایسا کرو، میرے بنگلے اور دفتر سے سارے گملے منگوا کر اچھی طرح سیٹ کر دو۔ کچھ کمی ہو تو شہر سے بہترین قسم کا سامان منگوا لینا۔ پیسے کی فکر نہیں کرنا، سرکار کا پیسہ ہے، اسی پر خرچ ہو گا۔"

"جی سر، ٹھیک ہے۔"

☆

"سر! ڈاکٹر صاحب آئے ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"بھیج دو۔"

"کہیے ڈاکٹر صاحب، کیا صورت حال ہے؟"

"آپ کے سامنے ہے۔ ہسپتال میں دوائیں نہیں، ڈاکٹر نہیں اور معصوم بچے ایک ڈرپ نہ لگنے سے مر رہے ہیں۔"

"دیکھیے، کل وزیر اعلیٰ آ رہے ہیں اور ولی عہد بھی۔ دیکھتے ہیں، وہ کیا اعلان کرتے ہیں۔"

"آج سے کل کے درمیان چوبیس گھنٹے ہیں۔ ان چوبیس گھنٹوں میں چوبیس معصوم جانیں چلی گئیں تو کون جوابدہ ہو گا؟"

"ڈاکٹر صاحب! آپ کے ہاتھ میں کچھ ہے اور نہ میرے۔"

"آپ اتنے بڑے عہدے پر ہیں، انتظامیہ آپ کے ماتحت ہے، آپ ہی کچھ کیجیے۔"

"ڈاکٹر صاحب! میں بھی آپ کی طرح حکومت کا ملازم ہوں۔ یہاں صرف سیاسی کھیل کھیلے جاتے ہیں۔"

"یہاں کے لوگ بھوک اور پیاس سے مر رہے ہیں۔ انھیں روٹی اور پانی چاہیے۔ دوائیں چاہئیں۔ وزیر اعلیٰ اور

نیند

ایک محبِّ وطن ڈاکٹر کی جذبات انگیز کتھا

وہ عوام کالانعام کو بیدار کرنا چاہتا تھا

شہلا جمال

''انتظام بہترین ہونا چاہیے۔''

''جی سر! آپ فکر نہ کریں، سب کام وقت پر اور بہترین انداز میں ہوں گے۔''

''دیکھو وزیر اعلیٰ اور کئی وزراء آ رہے ہیں۔ انتظام بہترین ہونا چاہیے۔''

''جی سر! میں نے کراچی سے اعلیٰ ہوٹل کا باورچی بلوایا ہے۔''

''شاباش! اچھا منرل واٹر کی بوتلوں کا ٹرک آ گیا۔''

''جی سر، آ گیا۔ بلکہ میں نے دوسرا ٹرک بھی منگوا لیا ہے۔''

''بھئی تم بہت ذمے دار ہو۔ میں نے تمھاری چھٹی منظور کرا دی ہے۔ تنخواہ بھی ملتی رہے گی۔ بس یہ کل کا دن گزر جائے۔ سارے معاملات نمٹا کر دو دن بعد سے چھٹی

میں انھیں تسلی دیتا کہ امی ابھی سوتا ہوں، مگر ان کے چلے جانے کے بعد پھر مطالعے میں ڈوب جاتا۔

بات کھیل کود سے اپنی عدم دلچسپی کی ہو رہی تھی۔ چلیے اس موضوع پر تھوڑی سی گفتگو ہو جائے۔ والد صاحب مجھے مجبور کرتے کہ شام کو باہر کھلی گراؤنڈ میں جاؤں اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلوں۔ دیہاتی بچوں میں یہ کھیل بہت مقبول تھا۔ میں بے دلی سے تھوڑی دیر اپنے ''فن'' کا مظاہرہ کرتا اور پھر گھر لوٹ آتا۔ گاہے گاہے گاؤں سے باہر ندی (جسے ہم لوگ ''کسی'' کہتے) نہانے نکل جاتا۔ میں تھوڑا بہت تیر لیتا، مگر اس فن کے اسرار و رموز کا محرم نہ تھا۔

ایک شام ہم چار پانچ لڑکے ''کسی'' میں نہانے گئے۔ تازہ بارش کی وجہ سے وہ بپھری ہوئی تھی۔ پانی کناروں سے باہر چھلک رہا تھا۔ میں نے پانی میں کودنے سے پس و پیش کیا تو پیچھے سے ایک شرارتی لڑکے نے دھکا دے دیا۔ میں ڈبکیاں کھانے لگا۔ کنارے تک پہنچنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر بات نہ بنی۔

قریب تھا کہ ڈوبنے کا عمل اپنے منطقی انجام کو پہنچتا، ایک نیک دل لڑکے نے پانی میں کود کر مجھے اپنی بانہوں میں اٹھایا اور لا کر کنارے پر ڈال دیا۔ میں اس وقت بے ہوش ہو چکا تھا۔ ذرا طبیعت سنبھلی تو گرتا، پڑتا گھر پہنچا۔ امی ابو اس حادثے کی خبر سن کر سخت پریشان ہوئے، اور انھوں نے اللہ کی راہ میں سوا روپے کا چورمہ (تنور کی گرم روٹی، شکر، گھی کا ملغوبہ) غریبوں میں تقسیم کیا، اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ

''رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت!''

خزینۂ ادب

☆۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور حکم وہی شخص نافذ کر سکتا ہے جو مداہنت کے مرض میں مبتلا اور جو خواہشاتِ نفس کا بندہ نہ ہو۔

☆۔ لوگوں میں جب تک جہالت اور نفس پرستی موجود ہو، وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔

☆۔ وہ چیز جو شمار ہو سکتی ہے کبھی نہ کبھی ختم ہو کر رہتی ہے۔

☆۔ دانشور وہ ہے جو ہر شے کو اس کے حقیقی مقام پر رکھے۔

☆۔ قرابت مودت کی اس سے زیادہ محتاج ہوتی ہے جتنی مودت قرابت کی۔

☆۔ مشورہ کرنے والا ہلاکت سے دوچار نہیں ہوتا (یعنی محفوظ رہتا ہے)

☆۔ کارِ خیر میں تاخیر نہ کرو بلکہ جہاں تک ممکن ہو پہل کرو۔

☆۔ جس شخص نے کسی دولت مند کے پاس جا کر اس کی دولت و ثروت کی بنا پر اظہارِ عجز و انکسار کیا اس نے اپنا دو تہائی دین و ایمان ضائع کر دیا۔

☆۔ جو کچھ تو سنے دوسروں سے بیان نہ کر کیوں کہ یہ دروغ گوئی کی دلیل ہے اور جو کچھ دوسرے تجھ سے بیان کریں اسے مسترد نہ کر اور جھوٹ نہ سمجھ کیوں کہ یہ بھی نادانی کی دلیل ہے۔ (انتخاب: محمد شفیق، خانیوال)

سوال ٹھیک، املا پوری کی پوری درست، پڑھائی لاجواب! بس پھر کیا تھا، نتیجہ نکلا تو ضلع بھر کے طالب علموں میں میری دوسری پوزیشن تھی۔ پہلے نمبر پر آنے والے خوش نصیب کا نام ارشاد الحق کیانی تھا۔ ہماری وہیں علیک سلیک ہوئی، جو بعد میں دوستی کی شکل اختیار کر گئی۔ گارڈن کالج میں بھی ہم دونوں پھر اکٹھے ہوئے۔ موصوف حکومت پنجاب کے ایک اعلیٰ افسر رہے۔

تو جناب، بات ہو رہی تھی ہمارے وظیفے کی۔ ہم چار لڑکوں میں سے دو اس اعزاز کے مستحق پائے۔ ایک میں اور دوسرا کرامت حسین۔ یہ حضرت بعد میں فوج میں شامل ہو گئے۔

اس زمانے میں ماہانہ وظیفے کی رقم چار روپے تھی۔ والد صاحب حساب کتاب کے معاملے میں حد درجہ محتاط تھے۔ میرے وظیفے کی رقم وہ علیحدہ رکھ دیتے۔ اس سے مجھے کچھ نہ ملتا۔ ویسے وہ اپنی جیب سے مجھے ہر روز آنہ، دو پیسے دے دیا کرتے، جس سے میں مونگ پھلی، گزک وغیرہ خرید کر اپنی جھولی بھر لیتا۔

والد صاحب پورے چار سال تک یہ رقم پس انداز کرتے رہے۔ 192 روپے جمع ہوئے تو وہ ایک دن پنڈی چلے گئے۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اس رقم سے انھوں نے سلائی مشین ایک سو تیس روپے، میں خریدی، جسے ہم لے کر خوشی خوشی گھر لوٹے۔ اڈہ لاریاں سے ہمارے گاؤں کا فاصلہ ایک میل کے لگ بھگ تھا، جسے پیدل طے کرنا پڑتا۔ والد صاحب کندھوں پر مشین اٹھائے چلے جا رہے تھے کہ بے جی نے انھیں دور سے آتے دیکھ لیا اور لپک کر گاؤں سے باہر ''کالو والی کسی'' کے قریب ہمارا استقبال کیا۔ انھوں نے ہاتھ آگے بڑھایا، والد صاحب نے مشین ان کے حوالے کرنا چاہی، مگر توازن برقرار نہ رہ سکا۔ مشین کا ایک سرا بے جی کے ماتھے سے جا ٹکرایا، جس سے خون بہنے لگا۔

ہم لوگ بہت افسردہ ہوئے کہ آغاز اچھا نہیں۔ زخم خاصا گہرا تھا، جسے مندمل ہونے میں کئی ماہ لگے۔ مگر امی کبھی بھولے سے بھی حرف شکایت لبوں تک نہ لائیں۔ مشین نے بھی وفا کا ریکارڈ قائم کر دکھایا۔ امی جتنی دیر زندہ رہیں، اسے استعمال کرتی رہیں۔ ان کی رحلت کے بعد ہم لوگ اسے اپنے ساتھ پنڈی لے آئے۔ آج بھی یہ مشین ''تندرست و توانا'' ہے۔ میں اسے جب دیکھتا ہوں تو دور رفتہ کی بہت سی یادیں لوٹ آتی ہیں۔ ابا جی، بے جی کی معصوم تصویریں میری آنکھوں میں تیرنے لگتی ہیں۔

میں نے آٹھویں جماعت تک اپنے گاؤں کے اسکول میں ہی تعلیم پائی۔ پڑھائی، لکھائی میں میرا کوئی ہم پلہ نہ تھا۔ سب مضامین میں میری پوزیشن قابل رشک تھی۔ ہر امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کرنا میرا معمول بن چکا تھا۔ مجھے پڑھنے لکھنے کی اتنی چاٹ پڑ گئی کہ میرا کسی اور جانب دھیان ہی نہ جاتا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ کھیلوں سے مجھے کبھی رغبت پیدا نہ ہو سکی۔

میری صحت کے بارے میں ابا، امی پریشان رہا کرتے تھے۔ میرا معمول یہ تھا کہ اسکول سے لوٹ کر آتا تو کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے آرام کرتا اور پھر کتابیں لے کر پڑھنے بیٹھ جاتا۔ مطالعے کا یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا۔ مٹی کے دیے کی روشنی میں پڑھنے کا عمل بڑا تکلیف دہ تھا، مگر ان حالات میں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ بے جی کا معمول تھا کہ رات سونے سے پہلے مجھے دودھ کا پیالہ پلانے آتیں اور جاتی بار نصیحت فرماتیں ''بیٹا! کافی وقت گزر چکا، اب سو جاؤ۔''

لگیں۔ اتنی دیر میں ابا جی آن پہنچے۔ انھوں نے بے جی کو تسلی دی۔ وہ خاموش ہو گئیں، مگر انھیں اس بات کا برسوں قلق رہا کہ ان کے 'لاڈلے' کو ناکردہ گناہ کی پاداش میں یہ سزا دی گئی۔

میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا کہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر راجہ نواب خان نے مجھے اسٹیج پر آ کر مجمع سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ تیاری کے لیے مجھے ہفتہ دس دن مل گئے تھے۔

موضوع تھا ''سچ کی برکتیں۔'' والد صاحب نے بہت عمدہ تقریر لکھ کر دی، جسے میں نے ایک آدھ دن میں ازبر کر لیا۔ پھر اس کی مشق شروع کر دی۔ میں گھر کے تمام افراد کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے بولنے کی مشق کرتا۔ والد صاحب تقریر کے آداب سے مجھے آگاہ کرتے، الفاظ کے زیر و بم اور زورِ بیاں کے انداز سے روشناس کراتے۔ اس طرح بھرپور تیاری کے بعد جب میں نے تمام اسکول کے سامنے تقریر کی تو یقین جانیے، سامعین جھوم اٹھے۔ ہر طرف سے تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسنے لگے۔

لڑکوں نے اتنے جوش و خروش سے تالیاں بجائیں کہ پورا گاؤں ان کی آواز سے گونج اٹھا۔ راجہ نواب خان نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور اپنے پدرانہ پیار سے نوازا۔ پھر اسمبلی میں برملا اعلان کیا ''مولوی'' کا لیکچر بہت عمدہ ہے۔ اسے آج ہم ایک روپیہ بطور انعام دیتے ہیں۔'' میرے لیے یہ اعزاز بہت گراں قدر تھا۔

ان دنوں چوتھی جماعت کے ہونہار لڑکے وظیفے کے امتحان میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اس دفعہ ہم چار لڑکوں کو قسمت آزمائی کے لیے جہلم بھجوایا گیا۔ والد صاحب نے مجھے اتنے بھرپور انداز سے تیاری کرائی کہ میری کامیابی خدا کے فضل سے یقینی تھی۔ والد صاحب بلند پایہ استاد تھے۔ ان کی نگاہ عمیق اور طریق کار حقیقت پسندانہ تھا۔ انھیں ڈر تھا کہ ''پینڈو'' بچے بڑے شہروں میں جا کر حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ جس ہال میں بٹھا کر بچوں سے امتحان لیا جاتا ہے، اس کے در و دیوار نقشوں، چارٹوں اور تصویروں سے مزین ہوتے ہیں اور آواز ہال میں گونجتی ہے۔ والد صاحب نے پیش بندی کے طور پر ''حفاظتی تدابیر'' اختیار کر لیں۔ کچھ تفصیلات آپ بھی سنیے۔

گاؤں سے باہر ایک بزرگ کا مزار واقع تھا۔ والد صاحب مجھے وہاں بٹھا کر املا لکھاتے۔ گنبد کے اندر آواز گونجتی جس کی بازگشت کی وجہ سے صحیح سنا نہ جاتا۔ والد صاحب میرے کانوں کو اس ناخوشگوار صورت حال سے مانوس کرانا چاہتے تھے، مبادا ہال میں ممتحن صاحب کی آواز ہمارے پلے نہ پڑے اور اس طرح ہمارا نام وظیفہ خوروں کی فہرست میں شامل ہونے سے رہ جائے۔ دیکھی آپ نے باپ کے پیار اور شفقت کی جھلک!

میں 15 اپریل 1939ء کی صبح اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جہلم پہنچا۔ کسی شہر میں وارد ہونے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ شہر کی گہما گہمی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ہم لوگوں نے اپنے کرم فرما ملک شیر علی ایڈووکیٹ کے ہاں قیام کیا۔ بجلی کے قمقمے دیکھنے کا بھی یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ چراغ کی ٹمٹماتی لو میں پڑھنے والے طالب علم کو اگر بجلی کی نعمت میسر آ جائے تو اسے اور کیا چاہیے؟ خیر! ہم اگلی صبح کمرۂ امتحان کی جانب چل دیے۔

امتحان شروع ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے پرچوں کا معیار میرے اندازے سے بہت نیچے ہو۔ میں نے آن کی آن میں تمام پرچے حل کر دیے۔ حساب کے سب

گھر سے مدرسے تک

گزرے دور کی میٹھی سلونی یادیں

کرنل (ر) غلام سرور

جب سخت جان بچے ٹمٹماتے چراغ تلے پڑھتے اور مادرِ علمی تک پہنچتے ہوئے کئی میل کا فاصلہ طے کرتے

جب میں پہلی جماعت میں داخل ہوا تو میرے استاد علی شان مقرر ہوئے۔ مرحوم کا تعلق بھی ہمارے گاؤں سے تھا۔ والد صاحب کے دیرینہ رفیق کار تھے۔ اللہ بخشے بڑے بھلے انسان تھے، مرنجاں مرنج اور بے ضرر۔ دوسروں کے معاملات میں کبھی دخل نہ دیتے، بس اپنے من کی دنیا بسائے رکھتے۔ انھیں بھینسیں پالنے کا بہت شوق تھا۔ اسکول آنے سے پہلے وہ گھاس کا وافر ذخیرہ کاٹ کر گھر میں محفوظ کر آتے۔ اسکول سے لوٹتے ہی پھر بھینسوں کی خاطر مدارات میں جت جاتے۔ بہت محنتی اور جفاکش انسان تھے، سخت کوشی کی منہ بولتی تصویر۔

ماسٹر جی نے پہلے دن میرا امتحان لیا۔ میں نے دوسری جماعت کی کتاب بھی پڑھ رکھی تھی، پھر مجھے ڈر کس بات کا تھا؟ فرفر سبق سنا دیا۔ ساری جماعت حیران وششدر رہ گئی۔ ماسٹر جی نے بھرپور شاباش دی۔ مجھے پڑھائی لکھائی میں قطعاً کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ماسٹر جی جو پوچھتے، فرفر سنا دیتا۔ حساب کے سوال بھی آنکھ جھپکتے میں حل کر ڈالتا اور تختی پر املا بھی بڑی خوبصورتی سے لکھتا۔ خدا کی رحمتیں ہوں ابا جان پر جنھوں نے مجھے خوداعتمادی کی دولت سے نواز رکھا تھا۔

ایک دن میری شامت جو آئی تو ماسٹر جی کے سوال کا جواب بات ختم ہونے سے پہلے ہی دے دیا۔ وہ دراصل یہ سوال کسی اور لڑکے سے کرنا چاہتے تھے۔ میری یہ حرکت دیکھ کر غصے سے لال پیلے ہو گئے۔ انھوں نے اسے میری گستاخی پر محمول کر کے زناٹے کا طمانچہ میرے منہ پر رسید کیا۔ وار اتنا بھرپور تھا کہ پانچوں انگلیوں کے نشان میرے گال پر ثبت ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد گھر لوٹا، تو بے جی میرا یہ حال دیکھ کر

محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن بجلی آئے، تو بہتر ہے، گوشت قلیل عرصے میں استعمال کر لیا جائے۔ جدید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ گوشت میں جراثیم بہت جلد پیدا ہوتے ہیں۔ تازہ گوشت ہی صحت کے لیے مفید ہے۔

☆ گوشت دھو کر پتلے پتلے پارچے کاٹیے اور دھوپ میں سکھا لیں۔ پھر باریک ململ کے کپڑے میں لپیٹ لیں۔ باریک پسے کوئلے کو ایک برتن میں ڈالیے اور گوشت والے کپڑے کو اس پر رکھ دیں۔ کچھ پسا ہوا کوئلہ کپڑا کے اوپر بھی ڈال دیں۔ اس طرح گوشت بغیر فریج کے بھی دیر تک خراب نہ ہوگا۔

☆ گوشت خشک کر کے بھی محفوظ کیا جاتا ہے۔ صاف ستھرا گوشت اچھی طرح دھو کر خشک کر لیں۔ ایک پیالے میں لیموں کا رس اور گڑ گھولیں۔ اس آمیزے کو گوشت پر لگا دیں۔ پھر پسا نمک گوشت پر چھڑک دیں۔ یہ گوشت مہینوں خراب نہیں ہوگا۔

☆ کچے گوشت کو زیادہ دن فریج کے بغیر رکھنے کی صورت میں اسے سرکے سے بھیگے کپڑے میں لپیٹ کر رکھیں۔ یہ کپڑا روزانہ تبدیل کر دیں۔

☆ بغیر فریج کے گوشت اگر دو دن تک رکھنا ہے تو نمک ڈال کر اسے پانی میں ابال لیں۔ پھر اس دیگچی کو ٹھنڈی جگہ پر یا ٹھنڈے پانی کے برتن میں رکھ دیں۔

☆ اگر کافی عرصے تک گوشت محفوظ رکھنا ہے تو اُسے نمک ڈال کر ابال لیں۔ جب پانی سارا خشک ہو جائے تو ایک مرتبان میں تیل لے کر اس کے اندر گوشت ڈال دیں۔ جب گوشت ٹھنڈا ہو جائے تو مرتبان کا ڈھکن بند کر کے رکھیے۔ اس عمل سے گوشت مہینوں محفوظ رہ سکتا ہے۔

☆ عید قربان پہ سارا دن ہاتھوں میں گوشت میں رہتا ہے۔ یوں اس کی بو ہاتھوں میں رچ بس جاتی ہے۔ بو سے محفوظ رہنے کی خاطر پلاسٹک کے دستانے استعمال کیجیے۔

عید قربان پر عموماً گھریلو ذمے داریوں کا بوجھ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ پھر بھی صفائی ستھرائی کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ذرا سی غفلت پر کافی دن تک کے لیے بیماریاں گھر دیکھ لیتی ہیں۔ اگر تھوڑی سی احتیاط کر لی جائے تو گھر کو صاف رکھا جا سکتا ہے:

☆ گوشت کی آمد کے ساتھ ہی مکھیاں، چیونٹیاں اور دیگر حشرات الارض کو دعوت اڑانے کا موقع مل جاتا ہے۔ ان بن بلائے مہمانوں سے نپٹنے کے لیے باورچی خانے کے دروازے پر پودینے کی گڈی لٹکا دیں۔ باورچی خانے میں دو اگر بتیاں بھی جلائیے یا پھر چیونٹیوں کے بلوں اور آمدورفت کے راستے میں آٹا ڈال دیں۔

☆ صحن، برآمدے وغیرہ سے گوشت اور خون کی بو دور کرنے کے لیے پہلے سے ایک موم بتی کو نمک اور ڈیٹول ملے ایک گلاس پانی میں دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر اسے جلا کر گوشت کے قریب کسی محفوظ جگہ پر رکھ دیں، بو نہیں آئے گی۔

☆ چند کوئلے دہکا یا سوکھی نیم کی پتیوں کو جلا کر گھر بھر میں دھونی دیں۔ گوشت کی بو کے ساتھ ساتھ حشرات الارض بھی غائب ہو جائیں گے۔

☆ ایک کلو گوشت میں اگر ایک چمچ کچا پپیتا ڈال دیا جائے تو وہ گل کر خستہ ہو جائے گا۔ یا پھر خربوزے کا خشک یا تازہ چھلکا گوشت پکاتے وقت ڈال دیں۔

☆ گوشت گود کر اس میں دہی ملائیے اور ایک گھنٹہ رکھ دیں۔ پھر پکائیں۔ گوشت جلد گل جائے گا یا گوشت پکانے والے برتن کے نیچے چونا لگا دیں۔

☆ گوشت گلاتے وقت تھوڑی سی شکر ڈال دیں۔ گوشت جلد گل جائے گا۔

☆ گوشت کی مناسبت سے آدھی، ایک یا دو چھالیہ کے ٹکڑے ڈالنے سے بھی گوشت جلد گل جاتا ہے۔

خواتین کے کام آنے والے منفرد ٹوٹکے

گوشت کو محفوظ بنائیے

ان ترکیبوں کا ذکر جن کے ذریعے کئی ہفتے تک گوشت حفاظت سے رکھنا ممکن ہو گیا

نسرین شاہین

قربانی کا مقدس فریضہ ہر صاحب استطاعت مسلمان پرواجب ہے۔ ایک اچھے تن درست جانور کو ذبح کرنا، پھر اسے خود کھانا، گھر والوں، عزیز، رشتے داروں اور مساکین کو کھلانا نہ صرف قربانی کا جذبہ بڑھاتا بلکہ مہمان نوازی اور فیاضی کی روایات بھی قائم واستوار کرتا ہے۔

اس گوشت کے تین حصے ہوتے ہیں۔ ایک حصہ فقرا اور دوسرا رشتے داروں میں تقسیم ہوتا ہے۔ تیسرا حصہ اہل و عیال استعمال کرتے ہیں۔ جانور ذبح کرنے کے بعد گھر کی خواتین کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ گوشت کی تقسیم اور حفاظت کے لیے کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ گوشت کے پکوان بھی تیار ہوتے ہیں۔ یوں عیدالاضحیٰ کا تقریباً تمام دن خواتین کی مصروفیت میں گزرتا ہے۔ عید قربان کے دن گوشت کی وافر مقدار ہوتی ہے۔ لہٰذا گوشت محفوظ رکھنا اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس کے لیے چند آسان نکات ذہن میں رکھیے:

☆ گوشت کے محفوظ رکھنے سے پہلے صاف پانی سے دھو کر خشک ضرور کر لیں۔ پھر پلاسٹک کی تھیلیاں لیجیے۔ ہر تھیلی میں حسب ضرورت گوشت رکھیں اور فریز کر لیں۔ جب بھی ضرورت ہو ایک تھیلی نکال کر پکا لیں۔ فریز سے نکلا ہوا گوشت فوراً یا چند گھنٹوں کے اندر استعمال کر لینا چاہیے۔

☆ خواتین کوشش کریں کہ گوشت اتنا ہی منجمد کریں جتنی ضرورت ہو۔ زیادہ دنوں تک فریج میں رکھے گوشت میں غذائیت باقی نہیں رہتی۔ فریزر جراثیم بڑھنے سے روکتا ہے، لیکن ختم نہیں کرتا۔

☆ ماہرین غذائیت کے مطابق گوشت تین مہینے تک

بیس سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا۔ فی الوقت کئی سو روبوٹ جاپان، امریکا اور دیگر یورپی کارخانوں میں کام کررہے ہیں۔ وہ گاڑیاں بناتے اور مختلف پرزہ جات و آلات متفرق اشیا میں رکھتے ہیں۔

لیکن اب روبوٹوں کی نئی کھیپ سامنے آنے لگی ہے ۔ یہ روبوٹ آنکھ مارتے، باتیں کرتے، اپنے اعضا ہلاتے حتیٰ کہ ہماری طرح جذباتی روّیہ بھی دکھاتے ہیں۔ پہلے والے روبوٹ "ہمارے لیے" کام کرتے ہیں۔ لیکن یہ نئی قسم کے روبوٹ "ہمارے ساتھ" کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

گویا وہ وقت قریب ہے جب انسان نما یہ روبوٹ ہماری سماجی وگھریلو زندگیوں کا حصہ بن جائیں گے۔ تب وہ ہمارے کام کرنے کے علاوہ ہمارا دل بھی بہلائیں گے۔ تاہم عسکری نقطہ نگاہ سے بھی انھیں بڑی اہمیت حاصل ہے۔

دراصل خاص طور پر امریکیوں کی کوشش ہے کہ وہ میدان جنگ میں لڑنے والے ہمہ اقسام کے روبوٹ ایجاد کرلیں۔ یوں انھیں محاذ جنگ پر اپنے فوجی بھجوانے سے نجات مل جائے گی۔ جب جنگوں میں امریکی فوجی مارے جائیں، تو امریکی عوام اس امر پر چراغ پا ہوتے ہیں۔ اسی باعث امریکی حکومت فضا، خشکی اور سمندر...... تینوں جگہ لڑنے والے روبوٹ اور خودکار مشینیں اپنے سائنس دانوں سے تیار کرا رہی ہے۔

یہ واضح رہے کہ لفظ روبوٹ سب سے پہلے چیک ادیب، کارل چیپک کے ایک ڈرامے آر یو آر (Rosumovi Universzalni Roboti) میں استعمال ہوا۔ یہ ڈراما ۱۹۲۰ء میں لکھا گیا تھا۔ چیک زبان میں یہ لفظ مزدور یا ورکر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

بائیس سال بعد سائنسی ادب لکھنے والے مشہور انگریز ادیب، اسحاق اسموف نے اپنی ایک کہانی "رن اباؤٹ" (Runabout) میں اس لفظ کو برتا۔ رفتہ رفتہ روبوٹ عالمی شہرت یافتہ لفظ بن گیا اور اب تمام زبانوں میں استعمال ہوتا ہے۔

سوراخوں سے بچے نکالنے والا روبوٹ

روبوٹ بنانے میں بھارتی سائنس دان پاکستانیوں سے آگے ہیں۔ حال ہی میں ممبئی کے ایک موجد نے ایسے سوراخ (Hole) سے بچے نکالنے والا روبوٹ ایجاد کیا ہے جو پانی حاصل کرنے کی خاطر کھودے جاتے ہیں۔

پچھلے سال پروفیسر مانک نندن کا چار سالہ بیٹا ایک ایسے ہی تنگ سوراخ میں گر پڑا۔ اسے بچانے کی سرتوڑ کوششیں ہوئیں، مگر بچارے کا آخری وقت آن پہنچا تھا۔ سو وہ دم گھٹنے سے ہلاک ہوگیا۔

غم وصدمے سے نڈھال پروفیسر مانک نندن نے پھر ایسا روبوٹ تیار کیا جس کا ہاتھ بہت لمبا ہے۔ وہ کئی فٹ نیچے تک پہنچ سکتا ہے۔ روبوٹ کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے مشینی بازو میں مزید بازو نصب کرنا ممکن ہے تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ لمبا کیا جاسکے۔

یہ روبوٹ بیٹری سے چلتا ہے۔ چناں چہ اسے دور دراز دیہات میں بھی استعمال کرنا ممکن ہے۔ یہ خصوصیت روبوٹ کی اہمیت دو چند کر دیتی ہے کیونکہ دیہات میں بروقت ہنگامی امداد کا عملہ دستیاب نہیں ہوتا۔

اس بھارتی روبوٹ میں اندھیرے میں بھی کام کرنے والا کیمرا نصب ہے جو اوپر ڈسپلے میں زندہ (لائیو) تصاویر دکھاتا ہے۔ یوں سوراخ کے کونے کھدرے میں پھنسے بچے کو بھی کھوجنا ممکن ہے۔

کہ وہ دیرینہ ساتھی کی صورت ہمیں خوشیاں فراہم کریں۔ پیپر کی صورت احساسات سمجھنے والے یہ روبوٹ کمپیوٹر کی طرح ہماری زندگیوں میں انقلاب لا سکتے ہیں۔"

ابھی پیپر "۱۷" زبانیں بول سکتا ہے۔ تاہم وہ جاپانی ہی رواں انداز میں بولتا ہے۔ اس کے کمپیوٹر میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ اسے اپ گریڈ کیا جا سکے۔ گویا مستقبل میں ضرورت ہوئی، تو پیپر کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اردو بولنے لگے۔ اس کرشماتی روبوٹ کی قیمت دو ہزار ڈالر (دو لاکھ روپے) رکھی گئی ہے۔

انسانوں کے مانند پیپر دو بازو رکھتا ہے۔ تاہم اس کی ٹانگ ایک ہی ہے جس پر دو پہیے لگے ہیں۔ پیپر پہیوں پر ہی ادھر ادھر گھومتا پھرتا ہے۔ یہ روبوٹ بنانے والے تسلیم کرتے ہیں کہ ابھی پیپر بول چال اور جذبات سمجھنے میں سو فیصد مہارت نہیں رکھتا۔ تاہم وہ اسے بہتر بنانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

سیر کرانے والے روبوٹ

اس وقت روبوٹ یا خودکار مشینیں بنانے میں جاپانی اور امریکی سب اقوام سے آگے ہیں۔ جاپانی سائنس داں و موجد تو روزمرہ کام انجام دینے والے روبوٹ ایجاد کر رہے ہیں۔ جب کہ امریکی اپنی "ضرورت" مدنظر رکھ کر عسکری روبوٹ تیار کرنے میں مصروف ہیں۔

پچھلے ماہ اوساکا یونیورسٹی سے وابستہ موجد پروفیسر ہیروشی اشیگورو نے عوام و خواص کے سامنے دو انسان نما روبوٹ پیش کیے۔ ان نسوانی روبوٹوں کے نام آٹو نیروڈ اور کوڈومور یڈ رکھے گئے۔

یہ نسوانی روبوٹ صورت شکل میں لڑکیوں سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ ان کی جلد سلی کون مادے جب کہ عضلات جیلی سے بنائے گئے۔ یہ روبوٹ مختلف نسوانی اور مردانہ آوازیں بولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آنکھیں جھپکاتے اور پلکیں ہلاتے ہیں حتیٰ کہ بعض سوالات کے جواب بھی دے سکتے ہیں۔

پروفیسر ہیروشی مستقبل میں ان نسوانی روبوٹوں کو ٹوکیو عجائب گھر میں تعینات کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہاں سیاحوں کو میوزیم کی سیر کرانے کے علاوہ انھیں مختلف آثار قدیمہ کی معلومات بھی دیں گی۔ فی الحال آٹو نیروڈ اور کوڈومور یڈ تجرباتی مرحلے میں ہیں۔

وہ وقت جلد آنے والا ہے جب روبوٹ ہمارے ساتھ کھیلیں گے

روبوٹوں کی نئی نسل

نت نئے روبوٹوں کی آمد عیاں کرتی ہے کہ انسانی ٹیکنالوجی نئے دور میں داخل ہو چکی۔ سائنس پہلے ہی "سمارٹ پروڈکٹس"، پہنے جانے والے آلات (Wearable devices) اور "دی انٹرنیٹ آف تھنگس" پیش کر کے انسانی زندگیوں میں انقلاب لا رہی ہے۔

یہ یاد رہے کہ انسانوں کی دنیا میں آئے روبوٹوں کو

سیاہ آنکھوں اور سفید بدن والا پیپر من موہنا سا روبوٹ ہے۔ پھر اس کی معصومانہ حرکات انسان کا دل موہ لیتی ہیں۔ دراصل سافٹ بینک کے مالک، مایوشی سن نے یہ روبوٹ اسی لیے تخلیق کرایا ہے کہ وہ انسانوں کا دل بہلا سکے۔

پیپر کی آنکھوں، سینے، کانوں اور بازوؤں پر مختلف حساس آلات (Sensors)، کیمرے اور آڈیو ریکارڈ نصب ہیں۔ مزید برآں اس کے کمپیوٹر میں چہرے شناخت کرنے والی ٹیکنالوجی بھی سموئی گئی ہے۔ جدید

پیپر کے خیال نے سافٹ بینک کے کاروباری فلسفے سے جنم لیا۔ اس فلسفے کا بنیادی نظریہ ہے: "خوشیاں سب کے لیے!" چناں چہ یہ کمپنی روبوٹوں کی دنیا میں اس لیے داخل ہوئی کہ ایسا روبوٹ ایجاد کرے جو لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ لے آئے۔

یہ یاد رہے کہ جاپان میں ادھیڑ عمر مرد و زن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ چونکہ اولاد عموماً والدین کو تنہا چھوڑ دیتی ہے لہٰذا جاپانی معاشرے میں ایسے شہریوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو تنہائی اور بے چارگی کا شکار

ٹوکیو عجائب گھر میں سیر کرانے والی روبوٹ

ترین سائنسی و تکنیکی اختراعات کا مرقع ہونے کے باعث ہی پیپر کئی محیر العقول خصوصیات کا حامل ہے۔

مثال کے طور پر وہ جان سکتا ہے کہ اس وقت آپ غصے میں ہیں، خوش ہیں یا ناراض۔ اگر آپ کا موڈ خراب ہے، تو وہ آپ کو خوش کرنے کی خاطر لطیفے سنائے گا۔ تب بھی مزاج ٹھیک نہیں ہوا، تو وہ آپ کے سامنے ناچ پیش کرے گا۔ پیپر بالکل انسانوں کی طرح بازو اور گردن ہلا کر باتیں بھی کر سکتا ہے۔

ہیں۔ انھی ہزار ہا جاپانیوں کی تنہائی دور کرنے کے لیے پیپر تخلیق کیا گیا۔

ظاہر ہے، جب اداسی و تنہائی کے مارے ایک انسان کو بولنے، لطیفے سنانے اور ناچنے والے روبوٹ کی رفاقت میسر آ جائے، تو پھر اسے سخت دل اور بے ضمیر انسانوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس بابت مایوشی سن کہتا ہے: "دس سال قبل کی بات ہے، مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ہمدرد روبوٹوں کا سب سے اہم کام یہ ہوگا

سائنسی ترقی کا حیرت انگیز کرشمہ

انسان نما روبوٹ

اب موجد انسانی زبان ہی نہیں جذبات و خیالات سمجھنے والی جادوئی مشینیں بھی ایجاد کرنے لگے ہیں

ہمارے معاشرے میں رواج ہے کہ جب کوئی شخص جذبات سے عاری روّیے کا مظاہرہ کرے اور سپاٹ چہرہ لیے رہے، تو اسے ''مشین'' یا ''روبوٹ'' کا خطاب دیا جاتا ہے۔ مگر اب پاکستانیوں کو یہ رواج بدلنا پڑے گا۔ وجہ یہ کہ نت نئے تجربوں کے شوقین جاپانیوں نے جذبات سمجھنے والا روبوٹ ایجاد کرلیا ہے۔

چار فٹ بلند اور اٹھائیس کلو وزنی ''پیپر'' (Pepper) نامی یہ روبوٹ جاپانی ٹیلی کام کمپنی سافٹ بینک کے ماہرین نے فرانسیسی و چینی موجدوں کی مدد سے تیار کیا ہے۔

سرفراز حسن

ملین ہرشل اور ریمونا میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک سیاہ فام عورت کے لیے دو ملین بھی بہت ہے۔"

"یہ سمجھوتا تمام لوگوں کے لیے اچھا ہوسکتا ہے میرے لیے نہیں۔ مزید یہ کہ تم اس کو نظرانداز کر رہے ہو کہ متوفی کیا چاہتا تھا۔ میں اس کی خواہش کے مطابق وصیت کا دفاع کرنے کا پابند ہوں۔"

"تو کیا یہ سمجھوتا نہیں ہوسکتا؟"

"نہیں۔" سٹل مین نے اپنی بیئر ختم کی اور باہر نکل گیا۔

☆

تمام وکلا وصیت کے اہم مدعیان کے متعلق مزید معلومات اکٹھی کرنے کے لیے تحقیق میں مصروف تھے۔ ویڈلینیٹر کے ماہر تحقیق کار رینڈل کلیپ نے ایک اہم گواہ فرٹنر پکرنگ کو دریافت کیا جس نے بتایا کہ کافی سال پہلے لیٹی لینگ اس کی بیوہ والدہ آئرین پکرنگ کے گھر میں کام کر چکی ہے۔ فرٹنر نے بتایا کہ وہ ہر مہینے اپنی والدہ سے ملنے جاتا تھا اور وہ لیٹی لینگ کو اچھی طرح جانتا ہے۔ مس پکرنگ لیٹی سے بہت خوش تھی۔

جب وہ زیادہ بیمار ہوگئی تو لیٹی نے اس کی بہت زیادہ خدمت کی۔ بتدریج لیٹی نے اپنی مالک کے مالی معاملات کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بلوں، انشورنس فارموں، چیکوں اور بینک اسٹیٹمینٹس کو بھی وہی دیکھتی تھی۔ فرٹنر پکرنگ نے انکشاف کیا کہ ایک دن اچانک اس کی بہن کو باورچی خانے سے والدہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصیت ملی جس میں پچاس ہزار ڈالر لیٹی کے لیے چھوڑے گئے تھے۔ دونوں بہن بھائی نے اپنی والدہ سے سوال کیا لیکن وہ کوئی بھی جواب دینے کے قابل نہ تھی۔

اگلے دن انھوں نے لیٹی سے پوچھا۔ اس نے مکمل لاعلمی اور معصومیت کا اظہار کیا۔ بہن بھائی نے لیٹی کو فوری طور پر ملازمت سے فارغ کر دیا اور اپنی والدہ کو جوں توں کر کے آکسفورڈ میں ایک وکیل کے دفتر لے گئے جہاں اس نے ایک وصیت تیار کی جس میں لیٹی کے بجائے بہن بھائی کو مساوی حصہ دینے کا لکھا گیا۔ اگرچہ ان کی والدہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی لیکن اس نے وصیت پر دستخط کر دیے۔ ایک ماہ بعد اس کی موت واقع ہوگئی اور بہن بھائی نے وصیت کے مطابق ترکہ مساوی تقسیم کر لیا۔

ویڈلینیٹر کے لیے یہ ملین ڈالر دریافت تھی۔ اس نے کلیپ کو ہدایت کی کہ آکسفورڈ کے اس وکیل کے دفتر سے وہ فائل حاصل کی جائے جس میں ہاتھ سے تحریر کردہ وصیت ہے اور جس میں لیٹی لینگ کا ذکر موجود ہے۔ چناں چہ کلیپ نے ایک ساتھی کی مدد سے رات کے وقت وکیل کے دفتر سے متعلقہ فائل چرا لی اور ویڈلینیٹر کے حوالے کر دی۔ وہ اسے مقدمے کے دوران ایک زبردست دھماکے کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔

اسی اثنا میں جیک کی سیکرٹری راکسی نے لیوسین کے گستاخانہ اور غیر اخلاقی رویے کے خلاف احتجاج کیا اور کہا کہ وہ اس کو دفتر میں برداشت نہیں کر سکتی۔ جیک نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راکسی کو اسی وقت ملازمت سے برطرف کر دیا اور اس کی جگہ پورشیا کو سیکرٹری کی ذمہ داریاں سونپ دیں۔ تھوڑی دیر بعد لیوسین دفتر میں آ گیا اور اس نے دوبارہ وکالت شروع کرنے کے ارادے کا اظہار کیا۔ جیک کو شک تھا کہ وہ اس عمر میں بار کا امتحان دوبارہ پاس کر سکے گا یا نہیں۔ تاہم اس نے کوئی اعتراض نہ کیا البتہ اس نے لیوسین کو خبردار کیا کہ اسے دفتر میں پورشیا کے ساتھ اپنا رویہ بہتر بنانا ہوگا۔

(اس سلسلے کی آخری قسط اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیے)

جج نے سسٹرنک سے کہا کہ اب اس کا اس مقدمے میں کوئی کردار نہیں لہٰذا وہ جا سکتا ہے۔ دوسری طرف جیک نے پورشیا کی ذہانت' قابلیت اور قانونی سوجھ بوجھ سے متاثر ہو کر اسے پچاس ڈالر ہفتہ کے حساب سے تربیتی کارکن کے طور پر ملازم رکھ لیا۔ اس فیصلے کو جج اٹلی نے سراہا۔ پورشیا ٹھیک وقت پر خوبصورت اور باوقار لباس میں دفتر پہنچ گئی۔

کوئینس لنڈی نے سیتھ کے تمام اثاثوں کی ابتدائی فہرست تیار کر لی تھی۔ تمام اثاثوں کی مجموعی مالیت ۲۴۰۲۰۰۰۰ ڈالر تھی۔ جیک فوراً جج اٹلی کے پاس گیا اور اسے یہ فہرست دکھائی۔ جج نے اس کو سر بمہر کر کے فی الحال خفیہ رکھنے کا حکم دیا۔ جیک نے اپنے کوئینس لنڈی اور دوسرے کارکنوں کے معاوضوں کے بل پیش کیے جن کی منظوری جج صاحب نے دے دی۔ جج نے اگلا سارا ہفتہ وصیت سے فائدہ اٹھانے والے دعویداروں سے جرح کے لیے مختص کر دیا۔

سوموار کی صبح کمرا عدالت میں جیک سمیت نو وکلا جمع ہوئے۔ وہ مدعا علیہان پر جرح کے لیے تیاری کر کے آئے تھے۔ پورشیا اپنی والدہ کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ جیک نے کورٹ رپورٹر اور وکلا سے لیٹی کا تعارف کروایا۔ کورٹ رپورٹر نے لیٹی سے حلف لیا کہ وہ جو کچھ بیان کرے گی، سچ سچ کہے گی۔ اس کے بعد پہلے ریمونا اور آیان ڈیفو کے وکیل ویڈلینٹر اور پھر ہرشل کے وکیل سٹل مین رش نے باری باری لیٹی سے سوالات کیے۔ انھوں نے لیٹی کے خاندان' شوہر سائمن کے خاندان' دونوں کی ملازمتوں اور آجروں' خصوصاً لیٹی کے سیتھ ہیوبرڈ کے گھر پر کام اور سیتھ کے ساتھ اس کے تعلقات اور بے تکلفی کے بارے میں تفصیلی سوالات کیے۔

جیک نے لیٹی کو ان سوالات کے لیے اچھی طرح تیار کیا ہوا تھا۔ لیٹی نے بہت محتاط اور بچے تلے جوابات دیے۔ ان کے بعد ہرشل کے بچوں اور ریمونا کے بچوں کے وکلا زیک زیٹلر اور جو بریڈی ہنٹ نے بھی لیٹی پر جرح کی۔ لیٹی دو دن کی اس طویل کارروائی سے مکمل طور پر تھک چکی تھی۔ بدھ کا دن جیک نے ہرشل ہیوبرڈ اور جمعرات کا دن ریمونا سے جرح میں صرف کیا۔ اس نے اہل خانہ' ملازموں اور سیتھ کے ساتھ ان کے تعلقات کے بارے میں سوالات پوچھے۔ چونکہ اینسل ہیوبرڈ کو تلاش نہیں کیا جا سکا لہٰذا اس کا کوئی وکیل تھا نہ جرح کی ضرورت۔

چار دن کی مسلسل غیر دلچسپ جرح کے بعد کمرا عدالت سے نکلتے ہوئے سٹل مین رش نے جیک کو مے نوشی کی دعوت دی جو جیک کے لیے غیر متوقع تھی۔ تاہم دونوں قریب ہی ایک جگہ چلے گئے اور بیئر کا آرڈر دیا۔ سٹل مین نے کہا ''جیک میرے پاس ایک تجویز ہے۔ اس مقدمے کے ساتھ بہت بڑی رقم کا تعلق ہے۔ لیکن کتنی مجھے معلوم نہیں؟''

''چوبیس ملین ڈالر۔'' جیک نے جواب دیا۔

''جیک' میرا خیال ہے ہمیں فریقین کے درمیان کوئی سمجھوتا کروانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس میں کل تین کھلاڑی ہیں: ہرشل' ریمونا اور لیٹی...... ہر ایک کو ایک حصہ دیں اور سب خوش ہو جائیں۔''

جیک اور لیوسین اس بارے میں تبادلہ خیال کر چکے تھے۔ پھر بھی اس نے پوچھا:

''تمہاری تجویز کیا ہے؟''

سٹل مین نے کہا ''وصیت کا سرمایہ زیادہ تر وارثان کو ہی ملتا ہے۔ لیٹی خاندان کی فرد نہیں' اس لیے اسے بہت تھوڑا حصہ ملنا چاہیے۔ ٹیکسوں کے بعد نصف رقم بچے گی' اس میں سے دو ملین لیٹی کو دے دیے جائیں اور بقیہ دس

اور سب کو موجود پایا۔

جج نے بکلے سے کہا کہ آپ کی تقرری پر جیک بریگینس نے اعتراض کیا ہے۔ جب تک اس اعتراض کا فیصلہ نہیں ہو جاتا' آپ بطور وکیل عدالت میں نمائندگی نہیں کر سکتے لہٰذا آپ اپنے کاغذات سمیٹ لیں اور جیوری باکس کی میز پر چلے جائیں۔ جج نے جیک کو اپنی مخصوص میز پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ سسٹرنک نے اس پر اعتراض کیا کہ محترم جج انھیں ان حق سے محروم کر رہے ہیں۔ جج نے اس کو توہین عدالت کے قانون کے مطابق گرفتار کروا کر جیل بھجوا دیا۔

ان کے جانے کے بعد کمرا عدالت میں سکون ہو گیا۔ جج نے تمام درخواستوں پر فیصلہ سنا دیا اور فریقین کو تیاری کے لیے پانچ ماہ بعد کی تاریخ دے دی۔ پریس رپورٹر ڈومازلی نے سسٹرنک اور بکلے کی گرفتاری کی رپورٹ اخبارات کو بھیج دی تھی۔ اگلی صبح میمفس کے اخبار میٹرو میں یہ کہانی پہلے صفحے پر سسٹرنک اور بکلے کی ہتھکڑیوں میں تصویر کے ساتھ شائع ہوئی۔ سرخی یوں تھی: ممتاز میمفس وکیل مسس پی جیل میں۔

اگلے دن روفس بکلے کو جج ایٹلی کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس نے اپنے گزشتہ رویے پر معذرت کی اور اس پر سے توہین عدالت کا الزام ہٹا دیا گیا۔ جج نے یہ بھی کہا کہ اس مقدمے میں وکلا کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی ہے اور وصیت کی پیروی کے لیے نامزد کردہ وکیل صرف جیک بریگینس ہے اور وہ وصیت سے فائدہ اٹھانے والے تمام افراد کا دفاع کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس لیے باقی وکلا عدالت کی طرف سے آزاد ہیں۔

سسٹرنک نے معافی مانگنے کے بجائے جیل میں رہنے کو ترجیح دی۔ اس مختصر سماعت کے دوران جیک نے ایک جوان' خوش شکل سیاہ فام عورت کو دیکھا۔ سماعت ختم ہونے کے بیس منٹ بعد وہ جیک کے دفتر پہنچ گئی۔ اس کا نام پورشیا لینگ تھا اور وہ لیٹی لینگ کی بڑی بیٹی تھی۔ جیک سے ملاقات کے دوران اُس نے بتایا کہ وہ چھے سال کے بعد فوج کی ملازمت سے فارغ ہو کر گھر واپس آئی ہے۔ مزید یہ کہ اس کے ماں باپ کے تعلّقات ہمیشہ خراب رہے ہیں۔ کل بھی جنگ ہوئی ہے۔ اس کا باپ اپنی بیوی پر سیتھ کے ساتھ ناجائز تعلّقات کا الزام بھی لگاتا ہے۔ اب وصیت سے فائدہ بھی اٹھانا چاہتا ہے۔

اسی نے سسٹرنک کو وکیل کھڑا کیا ہے۔ لیٹی جیک پر اعتماد کرتی ہے۔ ماروس نے بھی یہی کہا ہے کہ جیک پر بھروسہ کیا جائے۔ لیکن وہ نہیں جانتی کہ یہ کام کیسے ہوگا اور سسٹرنک سے چھٹکارا کیسے ملے گا کیونکہ وہ اس سے رقم بھی مستعار لے چکے۔ جیک نے اس کو بتایا کہ واحد طریقہ یہ ہے کہ لیٹی سسٹرنک کو وکالت سے برطرف کر دے۔ اس کا قرضہ بعد میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ جیک نے کہا کہ وہ وصیت کا ہر قیمت پر دفاع کرے گا لیکن سسٹرنک کی موجودگی میں وہ یہ مقدمہ ہار جائیں گے کیونکہ وہ نسلی امتیاز پر زور دے رہا ہے۔ اس طرح سفید فام اکثریت والی جیوری مخالف فیصلہ دے سکتی ہے۔ جیک نے پورشیا کو اپنے گھر پر شام کے کھانے کی دعوت دی۔ کھانے پر ان کے درمیان بے تکلفی اور اعتماد میں اور اضافہ ہو گیا۔ پورشیا جیک سے بہت متاثر ہوئی۔

اگلے دن پورشیا اپنی والدہ کو ساتھ لائی اور جیک کے دفتر میں اس نے سسٹرنک کو برطرف کرنے کی تحریر پر دستخط کر دیے۔ اوزی والز سسٹرنک کو جج ایٹلی کے کمرے میں لے آیا جہاں جیک' لیٹی اور پورشیا موجود تھے۔ جج نے اس کو برطرفی کا پروانہ دکھایا۔ نیز توہین عدالت کا حکم کالعدم کر دیا۔

فیڈرل کورٹ سسٹم میں کارگر ہو سکتے تھے لیکن فورڈ کاؤنٹی میں نہیں، خصوصاً جج ایٹلی کے سامنے نہیں۔ جیک نے سسٹرنک کی دائر کردہ درخواستوں کو بغور پڑھا اور لیوسین اور ہیری ریکس سے مشورہ کیا۔ سب کی رائے تھی کہ وہ بڑا وکیل لیٹی لینگ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہا تھا۔ جیک نے سسٹرنک اور بکلے کی دائر کردہ درخواستوں کو خارج کرنے کی درخواست دائر کر دی۔ اسے امید تھی کہ جج ایٹلی ان لوگوں کو ان کی صحیح جگہ پر رکھنے میں مدد کرے گا۔

رسل ایمبرگ کو فارغ کر دیا گیا اور اس کی جگہ کوئنس لنڈی نے کام شروع کر دیا۔ اس کا کام سیتھ کے اثاثوں کی تفصیل جمع کرنا، تخمینہ لگانا اور ان کی حفاظت کرنا تھا۔ وہ ہر روز ایک گھنٹے کا سفر طے کر کے دس بجے جیک کے دفتر میں پہنچ جاتا۔ وہ اور راکسی یہ کام بخوبی انجام دے رہے تھے۔ لیوسین کئی سالوں میں پہلی مرتبہ کچہری میں نظر آنے لگا۔ وہ اکثر زمینوں کے ریکارڈ کی چھان بین کرتا دکھائی دیتا۔

اکتوبر کے آخری دنوں میں جیک اور کارلا منگل کی صبح پانچ بجے اٹھے اور جلدی جلدی تیار ہو گئے۔ انھوں نے جیک کی والدہ کو خدا حافظ کہا جو گھر میں ان کی بیٹی کی دیکھ بھال کرتی تھی اور گاڑی میں آکسفورڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں انھوں نے فاسٹ فوڈ سنٹر سے کافی اور بسکٹ لیے اور دو گھنٹے کے سفر کے بعد پارچ مین پہنچ گئے۔ یہ ایک قید خانہ تھا۔ جیک چند ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔ آج یہاں اس سفید فام نسل پرست گروہ کے ایک رکن ڈینس یاکی کے پیرول کی سماعت ہونے والی تھی جس نے جیک بریگینس کے گھر کو نذر آتش کیا تھا۔

یہ ایک تشدد پسند تنظیم تھی جنھوں نے کارل لی ہیلی کی وکالت کرنے پر جیک کو نفرت، دھمکیوں اور حملوں کا نشانہ بنایا تھا۔ ڈینس یاکی کو بورڈ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کے تفتیش کنندہ نے حقائق بیان کیے۔ اس کو پانچ سال قید کی سزا سنائی گئی تھی اور وہ ستائیس ماہ بعد پیرول پر رہا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیک اور کارلا نے بورڈ کے سامنے مجرم کی پیرول پر آزادی کی مخالفت کی۔ اوزی والز نے بھی اس کی رہائی کی مخالفت کی۔

واپسی سے پہلے جیک نے ایک دوست وکیل کی معرفت لیٹی لینگ کے بیٹے ماروس لینگ سے ملاقات کی جو وہاں کسی جرم میں سزا کاٹ رہا تھا۔ جیک نے اس کو بتایا ”ایک سفید فام شخص سیتھ نے اپنی وصیت میں جائداد کا نوے فیصد تمہاری والدہ کے نام کر دیا ہے۔ مقدمہ عدالت میں ہے اور تمہاری والدہ نے میمفس کے کچھ وکلا کو اپنی نمائندگی کے لیے مقرر کر لیا ہے۔ وہ نہیں جانتی لیکن وہ اس کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ وہ اس کی ساری رقم لوٹ لیں گے۔ تم اس سے بات کرو اور کہو کہ وہ ان سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ وہ سخت غلطی کر رہی ہے۔ یہ بڑا مشکل مقدمہ ہے۔ اس کی لڑائی میں لڑوں گا...... تم اپنی والدہ کو سمجھاؤ۔“

☆☆

بعد میں اوزی والز نے فون پر جیک کو بتایا کہ پیرول بورڈ نے تین دو کی اکثریت سے ڈینس یاکی کو پیرول پر رہا کر دیا ہے۔ اس نے مایوسی کا اظہار کیا لیکن کہا کہ وہ اس لڑکے کو سمجھائے گا، وہ کلینٹن شہر کی حدود میں داخل نہ ہو۔

سیتھ کی وصیت کے مقدمے کی باقاعدہ سماعت کے دن لیٹی کے وکلا سسٹرنک اور بوسٹ نے مقامی وکیل روفس بکلے کے ساتھ کارروائی سے بہت پہلے آ کر مدعی وکیل کی میز پر قبضہ کر لیا اور اپنے کاغذات اس پر پھیلا دیے۔ جیک نے دیکھا کہ اس کی میز پر قبضہ ہو چکا ہے تو اس نے خاموشی سے جا کر جج ایٹلی کو صورت حال سے مطلع کیا۔ باقاعدہ سماعت شروع ہونے پر جج نے وکلا کی حاضری لی

سکتا۔اس نے سوچا کہ جونہی سائمن بیدار ہو گا وہ اس کو اسٹور سے اشیائے خوردنی خریدنے بھیجے گی۔اس کے لیے رقم سسٹرنک کے فیاضانہ قرض سے ادا کی جائے گی۔ سسٹرنک نے انھیں پانچ ہزار ڈالر بطور پیشگی دیے تھے۔

لیٹی کافی کا کپ ہاتھ میں لیے باہر لان میں جھولے پر بیٹھ گئی۔ اُسے یہ سوال پریشان کر رہا تھا کہ سیتھ ہیوبرڈ نے اپنے بچوں کو نظرانداز کر کے اتنا بڑا حصہ اس کو کیوں دیا؟ تھوڑی دیر میں ایک کار گھر کے سامنے آ کر رکی اور اس میں سے لیٹی کا بھائی رونٹل اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اترا۔ بچے اپنی پیاری آنٹی سے ملنے آئے تھے جس کی تصویر اخبار کے پہلے صفحے پر چھپی تھی اور جو آج کل میں امیر ہونے والی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے شوہر کو جگایا اور اسے اسٹور سے لانے کے لیے اشیا کی فہرست دی۔

جب وہ الماری سے پیسے نکال رہی تھی تو سائمن نے دیکھ لیا۔ جب وہ چلی گئی تو سائمن نے الماری سے ایک ہزار ڈالر نکال لیے۔ وہ پھر عقبی دروازے سے نکلا اور اپنے ٹرک میں سوار ہو کر ہوا ہو گیا۔ وہ اپنی آزادی اور تنہائی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ بالآخر لیٹی کو چھوڑ دینا چاہتا تھا لیکن ابھی نہیں، مستقبل قریب میں مثالی شوہر بننے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ پھر شراب خانے پہنچا۔ وہاں اس کا جھگڑا ہو گیا۔ پولیس نے اُسے گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔

ادھر گھر میں مزید مہمان اور بچے آ گئے۔ وہ سب لیٹی کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتے تھے۔ سائمن کے واپس نہ آنے پر لیٹی نے اسٹور سے کھانے پینے کی اشیا دوبارہ منگوائیں اور کھانے کی تیاری کی۔ لیٹی اتنے سارے رشتہ داروں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ وہ اپنی تعریف اور شہرت کے بادل میں گم ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اُدھر کچھ دیر قید میں رکھنے کے بعد پولیس نے سائمن کو آزاد کر دیا۔

☆☆

سیتھ ہیوبرڈ کی آخری وصیت پر عدالتی کارروائی شروع ہونے کے دو ہفتوں کے اندر صورت حال میں نئی الجھنیں پیدا ہو گئیں۔ ہرشل، ریمونا اور ان کے بچوں کے وکلا کی طرف سے وصیت کی مخالفت کی درخواستیں جمع کروائی گئی تھیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ہاتھ سے لکھی ہوئی وصیت درست نہیں اور یہ کہ لیٹی لینگ کی طرف سے سیتھ پر ناجائز اثر و رسوخ استعمال کیا گیا تھا۔ آیان نے ہرشل کو آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ ان سب کی طرف سے ویڈلینئر کو ہی وکیل مقرر کر لیا جائے لیکن ہرشل نے اتفاق نہیں کیا اور اس نے بڑی ہوشیاری سے دوسری وصیت کے مصنّف سٹل مین رش کو اپنا وکیل مقرر کر لیا۔

لیٹی لینگ کے وکیل بکر سسٹرنک نے مقامی وکیل روفس بکلے کے ساتھ معاونت اختیار کر لی۔ سسٹرنک نے متعدد درخواستیں دائر کر دی تھیں۔ ایک میں جیک بریگینس کو ہٹانے اور اس کی جگہ سسٹرنک اور بوسٹ فرم کو مقرر کرنے کی استدعا کی گئی۔ دوسری میں خود جج اٹلی کو ہٹانے کا مطالبہ اس بنیاد پر کیا گیا کہ وہ ہاتھ سے لکھی ہوئی وصیت کے بارے میں تعصّب رکھتا ہے۔ تیسری میں مقدمے کی جگہ کو بہتر یعنی سیاہ فام اکثریت والے مقام سے تبدیل کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ سسٹرنک کا اس کارروائی میں شریک ہونا جیک کے لیے تشویش کا باعث تھا۔ اس کی شہرت ایک پُراعتماد، بے خوف، ہنگامہ پرور اور جارحانہ رویہ رکھنے والے وکیل کی تھی۔ وہ جیوری کے سامنے بہت مہذبانہ اور عمدہ اور ضرورت پڑنے پر دھمکی آمیز رویہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ اس کے مقابلے میں قانونی چارہ جوئی ایک ناخوشگوار معاملہ ہوتا۔ اکثر مدعا علیہان جلد ہی سمجھوتا کر لیتے تھے۔

جیک جانتا تھا کہ سسٹرنک کے یہ حربے میمفس

ہوسکتا ہے۔ جیک کا خیال تھا کہ یہ کوئی جھوٹا جعلی وکیل ہے۔ اس نے اپنے آپ کو پرسکون رکھتے ہوئے کہا "میں اس وکیل سے بات کروں گا اور اس کو کہوں گا کہ وہ اس معاملے سے دور رہے۔"

کمیلا نے کہا "اس کا انداز جارحانہ تھا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ ہم کہانی کو مخصوص انداز میں بیان کریں۔ حقیقت میں وہ چاہتا تھا کہ ہم یہ کہیں کہ دواؤں کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے سیتھ کا دماغی توازن درست نہیں تھا۔"

جیک نے کہا کہ ہم ریڈ میکسی کو فون کر لیتے ہیں۔ اس نے نمبر ڈائل کیا اور مسٹر ریڈ میکسی سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ خاتون سیکرٹری نے جواب دیا اور کہا مسٹر میکسی شہر سے باہر ہیں اور سوموار تک واپس نہیں آئیں گے۔ جیک نے کہا کہ کوئی بہروپیا ان کا نام استعمال کرتے ہوئے عدالتی کارروائی میں مداخلت کر رہا ہے اور یہ کہ وہ اگلے ہفتے ان سے بات کرے گا۔

جیک کو شک تھا کہ ہرشل یا ریمونا یا ان کے بچوں کے وکیل نے کسی کو بھیجا ہوگا تاکہ وہ ممکنہ گواہان کو پریشان اور خوفزدہ کر کے ان سے اپنی مرضی کا بیان حاصل کر لے۔ پھر جیک نے آرلین سے سیتھ کے ذاتی معاملات پر سوالات کیے۔ آرلین نے بتایا "سیتھ تنہائی پسند تھا۔ وہ لوگوں سے گریزاں رہتا' اپنے کاروبار اور ذاتی معاملات کو ہمیشہ اپنی حد تک محدود رکھتا۔ اس نے اپنی وصیت یا اپنے بچوں کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی۔ میں نے لیٹی لینگ کے بارے میں بھی کبھی نہیں سنا۔ صرف اس کی تصویر اس ہفتے اخبار میں دیکھی ہے۔ وہ اپنے کاروبار کو انتہائی خفیہ رکھتا تھا۔ جب اس نے اپنی فیکٹریاں فروخت کیں تو مجھے پچاس ہزار ڈالر کا بونس دیا۔ اس نے کمیلا اور ڈیوین کو بھی بونس دیا لیکن مجھے معلوم نہیں کتنا۔ سیتھ عمدہ انسان اور اچھا مالک تھا۔ وہ دوسرے سفید فاموں کی طرح متعصب نہیں تھا۔ اپنی فیکٹریوں میں سفید فام اور سیاہ فام ملازمین سے برابری کا سلوک کرتا اور ان کو یکساں تنخواہیں دیتا۔ میں اس کی بے حد عزت کرتی ہوں۔"

☆☆

لیٹی بیدار ہوئی تو آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے شوہر کو دیکھا جو گزشتہ رات شراب نوشی کی وجہ سے ابھی تک خراٹے لے رہا تھا۔ وہ موٹا ہو چکا اور اس کے سر کے بال سفید ہو رہے تھے۔ اس کی تنخواہ گزشتہ برسوں میں بتدریج کم ہو چکی تھی۔ وہ ایک ہفتے سے کام پر نہیں گیا تھا۔ لیٹی نے سوچا' اس کو چاہیے کہ اٹھے اور اپنے کام پر جائے۔ لیٹی اس چھوٹے سے گھر سے تنگ آئی ہوئی تھی جس میں کئی افراد رہتے تھے۔ کچھ بیڈ پر ہوتے تھے' کچھ صوفے پر اور کچھ فرش پر۔ کچھ دنوں سے سائمن کے رویے میں اچانک خوشگوار تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح زیادہ شراب نوشی نہیں کرتا تھا۔ بیوی بچوں کے ساتھ اس کے رویے میں بھی نرمی اور تحمل پیدا ہو گیا تھا۔

اس نے کئی برس سے بیوی کو زد و کوب نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ اس کے ماضی کو نہیں بھول سکتی تھی جب وہ اسے مارا کرتا تھا۔ اگرچہ اس نے معافی مانگ لی تھی لیکن وہ اسے دل سے معاف نہ کر سکی۔ لیٹی نے قسم کھائی تھی کہ اس کو زندگی میں جب بھی موقع ملا وہ اس سے علیحدگی اختیار کر لے گی۔ ایک بڑا گھر اور بہتر سہولتیں حاصل کرے گی۔ وہ اپنے آپ کو اس گھر میں مقید خیال کرتی تھی۔ اب اس کو آزادی کی یہ کرن دکھائی دے رہی تھی کیونکہ دولت کا مطلب ہے آزادی۔

لیٹی باورچی خانے میں گئی۔ اس نے اپنے لیے کافی بنائی اور فرج کے اندر نظر ڈالی۔ وہاں چند انڈوں کے سوا کچھ نہ تھا جو اتنے سارے گھر والوں کو ناشتے میں پیش کیا جا

گئی۔ وہ ایک پچاس سالہ عورت تھی جو تھوڑی سی فربہ تھی۔ اس نے جیک کو سیتھ کا دفتر اور اسٹور دکھایا جہاں اس کا سارا ریکارڈ محفوظ تھا۔

آرلین نے جیک سے پوچھا کہ وہ کس کی طرف سے وکیل ہیں؟ جیک نے بتایا کہ وہ سیتھ کی خواہش اور ہدایت کے مطابق اس کی وصیت اور جائداد کا وکیل ہے۔ آرلین نے بتایا کہ سیتھ زیادہ تر اپنے کاروباری دوروں پر رہتا اور شاذ و نادر ہی دفتر میں بیٹھتا تھا۔ البتہ بیمار ہونے کے بعد وہ دفتر میں زیادہ دیر تک بیٹھتا اور اپنے کاروباری اور مالی ریکارڈ کو مکمل کرتا رہا۔ آرلین سفروں کے دوران اس کے ساتھ فون کے ذریعے مسلسل رابطہ رکھتی تھی۔ آخری مرتبہ اس نے سیتھ کو اس کی خودکشی سے پہلے جمعہ کے روز دیکھا تھا۔

سیتھ کے دفتر کے ساتھ اسٹور ایک گھٹن زدہ کمرا تھا جس میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ ہر چیز پر گرد کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ میز پر گتے کے چار بڑے ڈبے اوپر نیچے رکھے تھے۔ تیسرے ڈبے پر بینک، کمیشن کا لیبل تھا۔ جیک کو اسی کی تلاش تھی۔ اس نے فائلوں کا بغور جائزہ لیا اور جلد ہی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ برمنگھم کے ایک بینک میں ۲ء۱۲ ملین ڈالر نقد رقم موجود تھی جس پر چھے فیصد سالانہ منافع بھی مل رہا تھا۔ ان اعداد و شمار نے اس کے دماغ کو دھندلا کر دیا۔ ایک چھوٹے قصبے میں کرائے پر رہنے والے وکیل کے لیے جس کی پرانی گاڑی دو لاکھ میل چل چکی ہو، یہ منظر حقیقت سے زیادہ خواب معلوم ہوتا تھا۔ یہ رقم فورڈ کاؤنٹی میں کام کرنے والے کسی بھی وکیل کی ساری زندگی کی کمائی سے زیادہ تھی۔ وہ مسکرانے لگا۔ اچانک اس کے دل میں سیتھ کی توصیف کے جذبات اُبھر آئے۔

جیک تصورات میں گم تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ جیک نے جلدی سے ڈبا بند کیا اور دروازہ کھولا۔ آرلین نے مسکراتے ہوئے کہا: ''مسٹر بریگینس، یہ ڈیوین سکوائر ہیں۔ کہنے کو یہ نائب صدر ہیں لیکن کام وہی کرتے ہیں جو میں انھیں کہتی ہوں۔'' جیک اور ڈیوین نے ہاتھ ملایا جبکہ خوبصورت کمیلا قریب کھڑی دیکھتی رہی۔ ڈیوین دبلا پتلا آدمی تھا اور سگریٹ نوشی کا عادی۔ آرلین نے پوچھا ''کیا ہم آپ سے بات کر سکتے ہیں؟''

یقیناً' جیک نے کہا ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

آرلین نے ایک کارڈ آگے بڑھایا ''کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟''

جیک نے کارڈ پر نظر ڈالی: ریڈ میکسی۔ اٹارنی ایٹ لا۔ جیکسن۔ مسس سپی۔

''نہیں، میں نے اس کا نام کبھی نہیں سنا۔ کیوں؟'' جیک نے کہا۔

''یہ شخص گزشتہ منگل کو یہاں آیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ مسٹر ہیوبرڈ کی جائیداد کی تحقیق کر رہا ہے اور یہ کہ عدالت اس کی ہاتھ سے لکھی ہوئی وصیت سے مطمئن نہیں کیونکہ وہ غالباً ادویہ کے نشے میں تھا اور اس کی دماغی حالت درست نہیں تھی جب اس نے خودکشی کی منصوبہ بندی کی اور وصیت لکھی۔ اس نے کہا کہ ہم تینوں بڑے اہم گواہ ہیں کیونکہ ہم نے خودکشی سے پہلے جمعہ کے دن سیتھ کو دیکھا تھا اور ہم تصدیق کر سکتے ہیں کہ وہ کس حد تک نشے کی حالت میں تھا اور یہ کہ ہم وکلا کی تیار کردہ وصیت کی تائید کر سکتے ہیں۔ نیز اس نے ہمیں کچھ پیسے بھی دیے۔ اس نے کہا کہ یہ ہمارے بہترین مفاد میں ہے کہ ہم سچ بولیں اور بتائیں کہ سیتھ تصدیق صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔''

جیک ششدر رہ گیا کہ کس طرح کوئی اور وکیل اس کے کام میں دخل دے اور جھوٹ بول کر گواہوں پر اثر انداز

سے ہوئی ہے جو نکھٹو اور آوارہ ہے اور شراب نوشی کرتا ہے۔ ان کے چار یا پانچ بچے ہیں۔ ایک لڑکا قید خانے میں ہے۔ ایک لڑکی فوج میں ہے۔ لیٹی پینتالیس سال کی ہے۔ اس کا تعلق ٹیبر فیملی سے ہے۔ جیک نے پوچھا کہ کیا آپ سیتھ ہیوبرڈ کو جانتے ہیں۔ اوزی نے کہا کہ اس نے مجھے انتخابات میں کامیابی کے لیے دو دفعہ پچیس پچیس ہزار ڈالر دیے اور بدلے میں کچھ نہیں مانگا۔ وہ کچھ زمین کا مالک تھا اور عمارتی لکڑی کا کاروبار کرتا تھا۔ لیکن ایک ناخوشگوار طلاق میں وہ بہت کچھ کھو بیٹھا تھا۔ اس نے بتایا کہ سیتھ کی تجہیز و تکفین کل سہ پہر چار بجے چرچ سے ملحق قبرستان میں ہوگی۔ اس نے فون کر دیا تھا اور اس کے دونوں بچے ہرشل اور ریمونا جلد پہنچ جائیں گے۔

ہرشل ہیوبرڈ ایک گھنٹے میں میمفس سے فورڈ کاؤنٹی سیتھ کے گھر پہنچ گیا۔ پھر اس کی بہن ریمونا اور اس کا شوہر آیان ڈیفو بھی پہنچ گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے سے رسمی تعزیت کی۔ صرف ریمونا کافی دیر روتی رہی۔ ہرشل نے اپنے باپ کے بارے میں کوئی جذبات محسوس نہ کیے۔ وہاں ان کی ملاقات سیاہ فام گھریلو ملازمہ لیٹی لینگ سے ہوئی۔ وہ اس بات پر حیران تھے کہ سیتھ اس کو پانچ ڈالر فی گھنٹا کے حساب سے معاوضہ ادا کرتا تھا جو کہ بہت زیادہ تھا۔ سیتھ کے ہمسائے اور چرچ کے دوست خورونوش کی اشیا کے ساتھ تعزیت کے لیے آ رہے تھے۔ لیٹی ان سے کیک اور تعزیت وصول کر رہی تھی کیونکہ سیتھ کے بچوں نے کسی سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جلد ہی انھوں نے سیتھ کی وصیت اور بینک اکاؤنٹس کے بارے میں سوالات شروع کر دیے۔ دو پولیس افسر آئے اور انھوں نے سیتھ کی کار واپس کر دی۔ انھوں نے سیتھ کا وہ خط بھی واپس کیا جو ان کو ڈائننگ ٹیبل سے ملا تھا اور جس میں سیتھ نے اپنی تجہیز و تکفین کی ہدایات دی تھیں۔

ہیری ریکس طلاق کے مقدمات کا ماہر مشہور وکیل تھا۔ وہ طلاق کے مقدمے میں سیتھ کی دوسری بیوی سائبل کا وکیل تھا۔ اس نے جیک کو بتایا کہ اس مقدمے میں اس نے سیتھ کا سارا روپیہ لے لیا تھا۔ کافی رقم خود رکھی اور باقی موکلہ کو دے دی۔ جیک نے اس سے سیتھ کی موجودہ جائداد اور مالی حیثیت کے بارے میں استفسار کیا۔ سیتھ کے وارث گھر کے عقبی حصے میں بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ لیٹی نے ان کو لنچ پیش کیا۔ لیٹی نے سنا وہ کہہ رہے تھے تجہیز و تکفین کے اگلے دن وہ لیٹی کو ملازمت سے فارغ کر دیں گے اور گھر کو تالا لگا دیں گے۔

جیک نے اپنے دفتر میں لیٹی کو وصیت پڑھنے دی۔ فورڈ کاؤنٹی کے جج ریوبن اٹلی نے سیتھ کی موت کے نو دن بعد اپنی عدالت میں مقدمے کی پہلی سماعت کی۔ کمرا عدالت وکلا مدعیان اور مبصرین سے بھرا ہوا تھا اور سفید فام اور سیاہ فام تماشائیوں کے دو واضح گروہ نظر آئے۔ جج نے کچھ ضروری معاملات نمٹائے اور سماعت تیس دن کے لیے ملتوی کر دی۔

بیرنگ لمبر کمپنی ایک وسیع و عریض احاطے میں مختلف قسم کی فولادی عمارتوں پر مشتمل تھی۔ یہاں سیتھ کا بڑا دفتر واقع تھا۔ مرنے سے پہلے سیتھ نے اپنا تمام کاروباری اور اکاؤنٹس ریکارڈ مرتب کر دیا تھا۔ اس بارے میں وہ بہت محتاط تھا۔ جیک بریگینس نے سیتھ کی دفتر سیکرٹری آرلین سے فون پر دو مرتبہ بات کی تھی۔ شیرف اوزی والز، سیتھ کی موت کے اگلے دن یہاں آیا تھا۔ اس نے ملازمین کو تاکید کی کہ وہ عدالت کی ہدایات تک کسی چیز میں رد و بدل نہ کریں۔ سیتھ کی خودکشی کے دو ہفتے بعد جیک یہاں آیا۔ استقبالیہ پر اس کی ملاقات کمپلہ سے ہوئی جو ایک سیاہ بالوں والی جوان، پرکشش خاتون تھی۔ تھوڑی دیر میں آرلین وہاں پہنچ

گزشتہ اقساط کی تلخیص

اکہتر سالہ سیتھ ہیوبرڈ نے چنار کے ایک درخت سے لٹک کر گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال لیا۔ اس نے نہایت عمدہ سیاہی مائل سوٹ پہن رکھا تھا۔ چونکہ بارش ہو رہی تھی اس لیے وہ مکمل طور پر بھیگا ہوا تھا۔ وہ خوش مزاج شخص تھا اور اکثر چرچ بھی جاتا تھا۔ اس کی دو سابق بیویاں تھیں جنھوں نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ سیتھ کے دو بچے تھے جو کہیں اور رہتے اور باپ سے بہت کم ملتے تھے۔ سیتھ ہیوبرڈ ایک فارم ہاؤس اور اس کے اردگرد درختوں سے پُر قطعہ زمین کا مالک تھا اور عمارتی لکڑی کا کامیاب کاروبار کرتا تھا۔ خودکشی سے پہلے سیتھ نے اپنے ایک ملازم کیلون کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ اسے فلاں جگہ ملے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو مسٹر سیتھ کی گاڑی کھڑی تھی اور ان کی لاش درخت سے لٹک رہی تھی۔ اس نے پولیس کو فون کیا۔ پولیس افسروں نے آ کر سیتھ کی تصویریں لیں اور لاش درخت سے اُتار کر ایمبولینس میں رکھی۔ فورڈ کاؤنٹی کا شیرف اوزی والز بھی وہاں آ پہنچا۔ وہ سیتھ ہیوبرڈ کو جانتا تھا۔ ایک افسر کیلون کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ جہاں اسے باورچی خانے کے میز پر سیتھ کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس نے اپنی جان خود لی ہے اور اس کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے اور اپنی تجہیز و تکفین کے بارے میں کچھ ہدایات بھی لکھ دی تھیں۔

فورڈ کاؤنٹی میں جیک بری گینس ایک مشہور اور نیک نام وکیل تھا۔ کارل ہیلی کا مشہور مقدمہ جیتنے کے باعث وہ شہرت اور عظمت کی بلندیوں پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن اس کے بعد مقدمے کے مخالف دہشت گردوں نے اس کے مکان کو جلا دیا۔ اب وہ کرائے کے معمولی سے مکان میں رہتا تھا۔ مکان کی انشورنس کا معاملہ ابھی تصفیہ طلب تھا۔ چار دہشت گرد اب قید کی سزا بھگت رہے تھے۔ کچھ کہیں اور منتقل ہو چکے تھے۔ اس لیے جیک ہمیشہ پستول ہمراہ رکھتا تھا۔ وہ صبح جلدی اٹھتا اور تیار ہو کر دفتر چلا جاتا۔ اس کی بیوی کارلا اسکول ٹیچر تھی۔ وہ بعد میں تیار ہو کر اپنی بیٹی حنا کو ساتھ لے کر اسکول چلی جاتی تھی۔ جب جیک گھر سے باہر نکلا تو اس نے پولیس افسر لوئی ٹک کو ہیلو کہا جسے اوزی والز نے بریگینس فیملی کی حفاظت کے لیے وہاں متعیّن کر رکھا تھا۔ وہ جلد اپنی پرانی امریکی گاڑی میں اپنے دفتر کے قریب کلینٹن چوک میں کافی شاپ پر پہنچ گیا۔ کافی پیتے ہوئے اس نے دوستوں سے سیتھ ہیوبرڈ کی خودکشی پر گفتگو کی۔ اس نے سیتھ کی جائداد اور ممکنہ وصیت میں دلچسپی لی کیونکہ اس کا مطلب کسی وکیل کے لیے اچھی خاصی فیس ہوتا ہے۔ جیک حسب معمول کلینٹن چوک میں روزانہ کی چہل قدمی کے بعد اپنے شاندار دفتر میں داخل ہو گیا۔ اس کی سیکرٹری راکسی نچلی منزل پر استقبالیہ کمرے میں بیٹھتی اور وہ خود بالائی منزل پر بیٹھتا تھا۔ اس روز کی ڈاک میں جیک کو اپنے نام ایک لفافہ ملا جس پر لکھنے والے کا نام سیتھ ہیوبرڈ تحریر تھا۔ اس نے لفافہ احتیاط سے کھولا۔ اس میں سیتھ ہیوبرڈ کا ایک خط برآمد ہوا جس میں اس نے اپنی خودکشی کی اطلاع دی تھی اور اپنی وصیت کے معاملے میں اس کو اپنا وکیل نامزد کیا تھا۔ خط کے ساتھ سیتھ کی لکھی وصیت بھی تھی جس میں اس نے اپنے دونوں بچوں اور دونوں سابق بیویوں کو جائداد سے یکسر محروم کر دیا تھا اور جائداد کا نوے فیصد حصہ اپنی ملازمہ اور دوست لیٹی لینگ کے نام کر دیا تھا جس نے بیماری کے زمانے میں اس کی خدمت کی تھی۔ جیک نے خط اور وصیت کی ایک نقل راکسی کو دی، دو نقول اپنے ڈیسک میں رکھیں اور ایک نقل بینک کے لاکر میں رکھ دی۔ اس کے بعد وہ کاؤنٹی شیرف اوزی والز کو ملنے اس کے دفتر گیا۔ دونوں نے تھوڑی دیر سیتھ ہیوبرڈ کی خودکشی، اس کی وصیت اور سیاہ فام لیٹی لینگ کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔

اوزی نے بتایا کہ وہ لیٹی لینگ کو جانتا ہے۔ وہ ایک چھوٹی آبادی لٹل ڈیلٹا میں رہتی ہے۔ اس کی شادی سائمن لینگ

مقبول انگریزی ناول

چھٹی قسط

چناروں کی قطار

جان اے گریشم

پروفیسر محمد فاروق قریشی

اس وسیع و عریض جائیداد کی تجسّس و اسرار سے بھرپور داستان جس پر وارثوں کے مابین قانونی جنگ کا آغاز ہوگیا

چچا واپس پاکستان آئے، تو یہ انہونی مجھے بھی سنائی۔

تب میں نے ان پر افشا کیا کہ شاید آپ کو خبر نہیں، امریکا کے بیشتر بانی فری میسنری سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں جارج واشنگٹن، بنجمن فرینکلن، الیگزینڈر ہملٹن، تھامس جیفرسن اور رابرٹ شرمن نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

درج بالا امریکی راہنماؤں میں کئی نیک نام شہرت رکھتے ہیں۔ یہ اپنی جمہوریت پسندی اور انسان دوستی کے باعث مشہور ہوئے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ بانیان امریکا جن خفیہ تنظیموں (الومناتی اور فری میسنری) کے رکن تھے، اس کی بنیاد یہود نے کیتھولک عیسائیت سے انتقام لینے کی غرض سے رکھی تھی۔

الومناتی کی بنیاد پڑی

یہ 1492ء کی بات ہے، اسپین کے شاہ فرڈی نینڈ نے مسلمانوں کے علاوہ یہود کو بھی ملک سے نکال دیا۔ اس وقت بہت سے یہود جلاوطنی یا قتل عام سے بچنے کے لیے کیتھولک عیسائی ہو گئے مگر اندرونی طور پر یہودی ہی رہے۔ مورخین نے ایسے یہودیوں کو خفیہ یہود (Crypto Jews) کا خطاب دیا۔

رفتہ رفتہ بہت سے خفیہ یہود جرمنی، سوئٹزرلینڈ، برطانیہ اور دیگر یورپی شہروں میں آ بسے۔ ان کی اکثریت سودی کاروبار، کرنسی کے لین دین اور سونے کی تجارت سے وابستہ تھی۔ انھی خفیہ یہود نے بعدازاں الومناتی، فری میسنری اور دیگر خفیہ تنظیموں کی بنیاد رکھی۔

ان سبھی تنظیموں کا مدعا یہ تھا کہ یورپی معاشروں میں ''آزاد سوچ'' (Free thinking) کو رواج دیا جائے۔ آزاد سوچ بذات خود ترقی کی علامت ہے۔ لیکن خفیہ و عیاں یہودی یورپ میں مادر پدر آزاد سوچ کو رواج دے کر مذہب کا خاتمہ چاہتے تھے۔ یوں وہ کیتھولک عیسائی راہنماؤں سے انتقام لینے میں کامیاب ہو جاتے۔

لہٰذا الومناتی، فری میسنری وغیرہ سے وابستہ نام نہاد ''دانشور'' یہ پروپیگنڈا کرنے لگے کہ مذہب افیون کے مانند ہے جو انسان کو سلا دیتا ہے۔ یہ انسانوں کو تقسیم کرتا اور انھیں آپس میں لڑاتا ہے۔ غرض یورپی معاشروں میں اس قسم کے غلط اور مذہب دشمن اور پورے نظریات مسلسل پروپیگنڈے سے پھیلائے گئے۔

یہ پروپیگنڈا عیاش اور رنگ رلیاں منانے کے شوقین یورپیوں کو بہت بھایا۔ کیونکہ مذہبی پابندیاں ان کی مذموم تمنائیں پوری نہیں ہونے دیتی تھیں۔ چناں چہ عوام کو بادشاہت اور جاگیرداری سے آزاد کرانے کے بہانے انھیں حکومتوں کے خلاف ابھارا گیا۔ یوں بیسویں صدی کے آتے آتے یورپی و امریکی شہری اتنے زیادہ خودمختار و بااختیار ہو گئے کہ اپنی مرضی سے خدا کو اپنانے یا رد کرنے لگے۔ یوں خفیہ یہود نے کیتھولک عیسائیت کو شکست دے ڈالی۔

آج امریکا اور برطانیہ سمیت تمام یورپی ممالک میں دہریوں یعنی خدا پر یقین نہ رکھنے والوں کی اکثریت ہے۔ جو خدا کو مانتے ہیں، ان کی زندگیوں میں بھی مذہب برائے نام رہ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے، مغربی معاشروں میں فحاشی کا دور دورہ ہے کیونکہ اس پر روک ٹوک لگانے والی مذہبی پابندیاں کب کی مردہ ہو چکیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ الومناتی، فری میسنری وغیرہ کے دانشوروں کو ایک جرمن یہودی بنیا خاندان، روتھ شیلڈ (Rothschild) سرمایہ فراہم کرتا تھا۔ آج امریکا اور برطانیہ میں اصل حکومت جن امیر یہود کے ہاتھوں میں ہے، روتھ شیلڈ خاندان ان کا پیش رو سمجھا جاتا ہے۔ یہ خاندان برطانیہ، فرانس، اٹلی، آسٹریا اور امریکا میں آج بھی بینکاری و مالیات کے شعبوں میں سرگرم عمل ہے۔

بانیانِ امریکا خفیہ تنظیموں کے ایجنٹ نکلے

ان گروہوں کا تذکرہ جنھوں نے مغرب میں عیسائیت کو شکست دی اور مغربی باشندوں کو مذہب مخالف بناڈالا

محمد قاسم

یہ 2010ء کی بات ہے، میرے ایک چچا امریکا گئے۔ وہاں انھوں نے امریکی شہروں کی سیاحت کی اور اس غرض سے فلاڈلفیا شہر بھی گئے۔ یہ شہر کسی زمانے میں امریکا کا عارضی دارالحکومت بھی رہا ہے اور اسی شہر میں امریکی اعلان آزادی پر دستخط ہوئے۔ چناں چہ اس شہر میں امریکی تحریک آزادی سے متعلق کئی عمارات واقع ہیں اور یہ آج بھی امریکا کے اہم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔

میرے چچا تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ خصوصاً انھیں مذہبی علوم کی تاریخ کا مطالعہ بہت بھاتا ہے۔ چناں چہ فلاڈلفیا میں وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں کئی عمارتوں پر یہودیوں کی مشہور خفیہ تنظیموں ''الومناتی'' (Illuminati) اور فری میسنری (Free Masonary) سے وابستہ نشانات ثبت تھے۔ مثال کے طور پر دیکھتی آنکھ اور ہرم نما پہاڑ۔

نوٹ

منی آرڈر یا کتابیں بنام ادارہ ارسال فرمائیں۔ دستی دیتے وقت ادارے کی رسید وصول کریں۔ شخصی نام پر ہرگز ارسال نہ فرمائیں۔ شکریہ

بغیر نمود و نمائش

تعلیم القرآن، دین کی نشر و اشاعت اور انسانیت کی فلاح کے لیے، بغیر نمود و نمائش دیے گئے عطیات کا ادارہ خیر مقدم کرتا ہے۔ اپنے عطیات بذریعہ چیک یا ڈرافٹ ارسال کرنا چاہیں تو ڈرافٹ یا چیک آمنہ جنت فاؤنڈیشن اکاؤنٹ نمبر 02745 ایم سی بی چونیاں برانچ نمبر 0240 کے نام بھجوائیں۔ آن لائن بھی جمع کرا سکتے ہیں۔

اس صورت میں مطلع ضرور کریں۔

آن لائن اکاؤنٹ ایم سی بی PK86MUCB0673440401002745 ٹائٹل اکاؤنٹ آمنہ جنت ویلفیئر فاؤنڈیشن ایم سی بی چونیاں برانچ

نوٹ: ادارہ گورنمنٹ سے منظور شدہ ہے۔ ادارے کو دیے جانے والے تمام عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں، مزید رابطے کے لیے:

پرنسپل رضیہ پروین: آمنہ جنت فاؤنڈیشن
ماڈل اسکول چونیاں ضلع قصور
فون نمبر: 0322-7614497 -0300-4735932

محترمی ومکرمی جناب.........................

السّلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

کیا آپ کے پاس ایک قرآن مجید ہے؟

تمام مسلمان بہن بھائیوں اور خصوصاً آپ سے التجا ہے کہ آپ کے پاس اگر ایک سے زیادہ مترجم قرآن مجید، قائدے، سپارے، بخاری شریف یا حدیث کی کوئی کتاب یا دیگر اسلامی کتابیں موجود ہوں تو ضائع نہ کریں بلکہ ادارہ آمنہ جنت کی لائبریری کو عطیہ کریں۔ جب تک طالبات ان کو پڑھتی رہیں گی ثواب بھی آپ کو ملتا رہے گا اور یہ صدقہ جاریہ ہے۔

اپنے والدین اور مرحومین کے بلند درجات کے لیے؟

ادارہ کو تفاسیر قرآن کریم، کتب حدیث اور دیگر اسلامی کتابیں خود تشریف لا کر پہنچا دیں یا ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر بنام ادارہ ارسال فرما دیں۔ ہم تفسیر قرآن کریم بازار سے لے کر رسید آپ کو بھجوا دیں گے۔ ان شاء اللہ

دعوت

آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ ماسوائے اتوار کے کسی بھی دن کسی بھی وقت جب آپ کو آسانی ہو، ادارے کا وزٹ فرمائیں، ہمارے کام تعلیم القرآن وعصری تعلیم کو چیک کریں۔ اگر دل گواہی دے کہ کام بطریق احسن سے ہو رہا ہے تو پھر تفاسیر قرآن کریم وکتب حدیث عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

CELEBRATING
60
Years
QUALITY THROUGH GENERATIONS
BMA
Since 1952
وِگورین®
چلڈرن سیرپ
بچوں کی اچھی صحت اور بہترین نشوونما کے لیے
یقیناً بہترین!
VIGURINE

گاہیں (Resorts) ہیں جہاں سیاحوں کو ہر طرح کی سہولت حاصل ہے۔ جزیروں کے مابین آمد و رفت کے لیے ''دھونی'' (مقامی ساختہ خاص طرز کشتی) اور سپیڈ بوٹ سے لے کر سی پلین (سمندری ہوائی جہاز) تک ہر طرح کی سہولت دستیاب ہے۔ مالے سے دور دراز جزیروں پر واقع تفریح گاہوں تک جانے کے لیے سمندری ہوائی جہازوں کا پورا فلیٹ موجود ہے۔

آبی کھیلوں اور سکوبا ڈائیونگ کے علاوہ مالدیپ کی سب سے اہم اور قابل ذکر تفریح زیر آب سیاحت ہے جو ''وہیل آبدوز'' کے ذریعے کروائی جاتی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی مسافر آبدوز ہے جو مسافروں کو سطح آب سے ۱۵۰ فٹ نیچے تک لے جاسکتی ہے۔ جرمن ساختہ اور مکمل طور پر ائرکنڈیشنڈ یہ آبدوز حفاظت کے عالمی معیار رکھتی ہے۔ ۵۰ مسافروں کو اپنے دامن میں بھر کر ۱۵۰ فٹ نیچے تک غوطہ لگانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ نیز اس میں ہنگامی حالات کے پیش نظر آکسیجن اور پانی سمیت کھانے پینے کی اشیا کا ۱۰۰ گھنٹے تک چلنے والا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔

یہ آبدوز صبح ۹ بجے سے رات ۸ بجے تک ہر نوے منٹ بعد ایک غوطہ لگاتی ہے۔ اس منفرد اور حیرت انگیز سفر کے مسافروں کو پہلے ایک چھوٹے جہاز کے ذریعے وہیل ہاؤس پہنچایا جاتا ہے جو مالے ہوائی اڈے سے ۲۰ منٹ کی دوری پر واقع ہے۔ اور وہاں سے آبدوز میں سوار کر کے زیر آب سیر کرائی جاتی ہے۔

وہیل آبدوز کا پہلا سٹاپ ۲۵ میٹر نیچے ہے جہاں مسافر مونگے کی رنگین اور حیرت انگیز دنیا کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اسی مقام پر ان کی ملاقات مچھلیوں کے رنگ برنگے غولوں سے ہوتی ہے جو شفاف پانی میں اپنی دلفریب تیراکی کے جوہر دکھاتے نظر آتے ہیں۔ تب مونگے کی

مان میرا احسان

''اتنی زیادہ رقم کا بل......؟'' آپریشن کے بعد ایک مریض نے سرجن کا بل دیکھ کر احتجاج کیا۔
''میرے دوست!'' سرجن نے مشفقانہ لہجے میں کہا ''اگر تمھیں معلوم ہو جاتا کہ تمھارا کیس کتنا پیچیدہ تھا اور کس طرح میں نے تمھارے آپریشن کو پوسٹ مارٹم میں تبدیل ہونے سے روکا، تو تم اس سے تین گنا بل بھی خوشی سے ادا کر دیتے۔''

چٹانوں سے اٹھکیلیاں کرتی نیلی اور پیلی سبز مچھلیاں اور رنگ برنگے سمندری کچھوے دعوت نظارہ دیتے ہیں۔

ان ساری دلچسپیوں کے باوجود تشویش ناک بات یہ ہے کہ مالدیپ کو کئی طرح کے ماحولیاتی خطرات کا سامنا ہے۔ ان میں سب سے بڑا خطرہ سمندروں میں پانی کی روز بروز بلند ہوتی سطح ہے۔ حکومت مالدیپ نے کچھ عرصہ قبل اقوام عالم کی توجہ اس سنگین مسئلے کی طرف مبذول کروانے کے لیے ایک عالمی گلوبل وارمنگ کانفرنس بھی منعقد کی تھی۔ اس کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ یہ کانفرنس سمندر کے اندر پانی میں منعقد ہوئی تھی اور کئی روز تک عالمی ذرائع ابلاغ میں خبروں کی زینت بنی رہی۔

لیکن عالمی برادری کی طرف سے تاحال اس سلسلے میں کوئی ٹھوس اقدامات سامنے نہیں آئے۔ بہرحال اپنی مدد آپ کے تحت حکومت مالدیپ نے ایک منصوبہ ترتیب دیا ہے۔ وہ یہ کہ سیاحت سے حاصل ہونے والی آمدنی سے ایک مخصوص فنڈ قائم کر دیا گیا۔ اس میں جمع ہونے والی رقم سے آئندہ چند برسوں میں سری لنکا یا بھارت میں زمین خرید کر نئی بستیاں بسائی جائیں گی جب بھی ملک ڈوبنے کا خطرہ ہوا، تو وہیں اہل مالدیپ کو آباد کر دیا جائے گا۔

باعث مالدیپ کو جن بڑے چیلنجوں کا سامنا ہے، ان میں سے ایک تیزی سے بڑھتی آبادی بھی ہے۔ ۱۹۹۶ء میں ملک کی کل آبادی ۲۵۶۱۵۷ تھی۔ تاہم ۲۰۰۴ء کے سُونامی طوفان میں بہت سی جانی نقصان ہوا۔اس کے باوجود ملک کی حالیہ آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔

آبادی کا بڑا حصہ دارالحکومت مالے اور اس کے قریبی جزیروں پر آباد ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ ترقیاتی بجٹ کا کثیر حصہ مالے میں بسنے والوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے پر خرچ ہوتا ہے۔ دارالحکومت مالے ہی سیاسی اور معاشی زندگی کا مرکز ہے۔گنجان آبادی والا یہ شہر چار انتظامی ضلعوں میں منقسم ہے۔اس کی گلیاں تنگ اور بھول بھلیوں جیسی ہیں۔اس میں ۳۰ کے لگ بھگ مساجد اور کئی مارکیٹیں ہیں۔

سیاحوں کے لیے سب سے زیادہ پرکشش مقام ''نیشنل میوزیم'' ہے جس میں سرلنکن ، عرب اور مقامی ثقافت کے فن پارے رکھے ہیں۔دیگر قابلِ دید مقامات میں سلطان پارک، اسلامک سنٹر، سنہری مرکزی جامع مسجد ، ''دھی موج'' یعنی پرانا صدارتی محل جسے اب سپریم کورٹ کے لیے وقف کردیا گیا ہے اور'' میدھوزیارائے مگو'' یعنی ابو البرکات بغدادی کا مقبرہ شامل ہیں۔ جبکہ '' ہیوکیورو مسکئی'' یعنی ۱۶۵۶ء میں سلطان ابراہیم سکندر کے زمانے میں تعمیر کی جانے والی قدیم مسجد اپنے پیچیدہ پتھریلے نقوش و نگار کی وجہ سے منفرد پہچان رکھتی ہے۔

سمندر میں گھرے اس دیس میں ایک اُعجوبہ روزگار تفریح گاہ مالے میں بنا مصنوعی ساحل سمندر ہے۔ یہ مقامی لوگوں کی پسندیدہ تفریح گاہ ہے، خاص طور پر ان شہریوں کے لیے جو تیراکی کے شوقین ہیں لیکن کسی سیاحتی جزیرے (Resort) پر نہیں جاسکتے۔اس ساحل کے گردا گرد بہت سے بینچ اور مقامی کھانوں کی رنگی برنگی دوکانیں خوب صورت نظارہ پیش کرتی ہیں۔

قابل ذکر مارکیٹوں میں مچھلی منڈی سب سے اہم ہے جہاں سے لوگ مچھلیاں خریدتے ہیں۔ اس مارکیٹ میں چہل پہل سہ پہر کے بعد جوبن پر آتی ہے جب کشتیاں تازہ مچھلیاں لیے لوٹتی ہیں۔مقامی لوگ تازہ مچھلی کھانے کے عادی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہر روز بلا ناغہ مچھلی منڈی آنا اکثر مقامی لوگوں کا معمول ہے۔

مالدیپ اپنے معتدل موسم ، نیلی سمندری جھیلوں، ریتلے ساحلوں ، چھوٹے چھوٹے پرسکون جزیروں اور زیر آب خوبصورت تفریح گاہوں کی بدولت سیاحوں کے لیے خاص کشش کا باعث ہے۔مالدیپ میں تقریباً ۹۱ تفریح

مالدیپ کا لوک رقص

اور رسم الخط عربی سے مشابہ ہے۔ دراصل مالدیپ کے جزائر بحری تجارتی راستے پر واقع ہیں۔ اس لیے ان کا عربوں، ہندوستانیوں اور افریقیوں سے متاثر ہونا بعید از قیاس نہیں۔ اہل مالدیپ کے رہن سہن، کلچر اور شکل وشبہات میں اس کا واضح اثر دیکھا جاسکتا ہے۔

چاول اور مچھلی لوگوں کی عام غذا ہے۔ سبزیاں بہت کم کھائی جاتی ہیں۔ کھانے کے بعد پان چبایا جاتا ہے جسے "فوہ" کہتے ہیں۔ پرانے لوگ حقے سے مشابہ "گڈوگڈا" پیتے ہیں۔ چوپایوں کا گوشت صرف خاص مواقع پر کھایا جاتا ہے کیونکہ مالدیپ میں چوپائے نہیں پائے جاتے۔ اس وجہ سے عیدالاضحیٰ پر عام قربانی بھی نہیں ہوتی۔ لوگوں کا پسندیدہ اور عوامی مشروب "را" ہے جو ناریل کے گودے سے بنتا ہے۔

ملک کی ۴۵ فیصد خواتین کو سرکاری ملازمت کے مواقع میسر ہیں۔ یہ خواتین تعلیم، صحت، رفاہ عامہ، سیاحت، ٹرانسپورٹ اور کمیونی کیشن کے شعبوں میں خدمات انجام دیتی ہیں۔ بقیہ گھروں میں کام کاج نبٹاتی اور فارغ وقت میں رسہ بٹنے اور ساحل سے سیپیاں چن کر قومی آمدنی کو فروغ دینے کی کوشش کرتی ہیں۔

مالدیپ میں کوئی باقاعدہ فوج یا پولیس موجود نہیں۔ ایک ہی نیشنل سیکورٹی فورس کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہی ملک میں بیک وقت فوج، پولیس اور کوسٹل گارڈ کے فرائض انجام دیتی ہے۔ کم آبادی اور وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے جزیروں پر الگ الگ فوج رکھنا ناممکن ہے۔

اعلیٰ عدلیہ یا ہائی کورٹ ایک چیف جسٹس اور دیگر چار ججوں پر مشتمل ہے۔ البتہ ہر مرجانی جزیرے کا ایک چیف اور ہر صوبے کا ایک سربراہ ہوتا ہے۔ وہ سرکاری احکامات پر عمل درآمد کروانے کا پابند ہے۔

مالدیپ میں جائیداد کی خرید وفروخت کا تصور ایسا نہیں جو ہمارے وطن یا دیگر متمدن ممالک میں ملتا ہے۔ مالدیپ میں زمین سرکار کی ملکیت ہے۔ لیکن عوام الناس کو ان کے آبائی علاقوں میں گھروں کی تعمیر کے لیے مفت مہیا کی جاتی ہے۔ تاہم سرکاری ملازمین اپنی تعیناتی کے علاقوں میں زمین لیز پر حاصل کر سکتے ہیں۔ غریب اور کم وسیلہ لوگ ناریل کے پتوں اور ٹین کی چھتوں سے بنے گھروں میں رہتے ہیں۔ امیر اور صاحب حیثیت لوگ مونگے کی بجری سے بنی ٹائلوں والی چھتوں والے گھروں میں بستے ہیں۔

مقامی کرنسی روفیہ کہلاتی ہے۔ ایک روفیہ سولاری کے برابر ہے۔ ایک ڈالر کم وبیش چھ روفیہ جتنا ہے۔ کرنسی نوٹ ایک، دو، پانچ، دس، بیس، پچاس، سو اور پانچ سو روفیہ کی مالیت میں دستیاب ہیں۔ جبکہ سکے ایک، دو، پانچ، دس، پچیس اور پچاس لاری کی مالیت میں ملتے اور گردش کرتے ہیں۔ مالدیپ کا معیاری وقت پاکستان کے برابر ہے۔

سطح سمندر سے کم بلندی، محدود رقبے اور وسائل کے

یہ مضمون کس کا ہے؟

مالدیپ پہ لکھا یہ خوب صورت مضمون دفتر اردو ڈائجسٹ میں کچھ عرصہ قبل بذریعہ ای میل موصول ہوا تھا۔ اتفاقاً مضمون بھیجنے والے کا ای میل ضائع ہوگیا۔ جب کہ اس پہ مصنّف کا نام بھی عنقا تھا۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ بذریعہ ای میل اپنی تحریر بھجواتے ہوئے اس پہ اپنا نام ضرور تحریر کریں۔ اس مضمون کے لکھاری اپنی تحریر پڑھیں تو ہم سے رابطہ کریں۔ (ادارہ)

صدی میں یہاں آئے۔ تاہم مالدیپ کی مستند روایات کے مطابق عوام کے قبول اسلام کا سبب تبریز کے فارسی صوفی یوسف شمس الدین بنے۔ بہرحال ان دونوں بزرگوں کے مقابر مالے میں واقع اور آج بھی مرجع خلائق ہیں۔

مالدیپی عوام کے طرز معاشرت میں اسلام کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاحتی ملک ہونے کے باوجود اسلامی اقدار پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ خلاف اسلام شعار کا کھلے عام اظہار قانوناً ممنوع ہے۔ خواتین کی اکثریت حجاب پہنتی ہے۔ سیاحتی مقامات کے علاوہ شراب نوشی پر ہر مسلم و نان مسلم پر یکساں پابندی عائد ہے۔ چونکہ عوام کی اکثریت سنی العقیدہ مسلمان ہے اس لیے محافل ذکر و میلاد کا کثرت سے اہتمام کیا جاتا ہے۔ سالانہ سرکاری تعطیلات میں بھی اسلامی شناخت غالب ہے۔

قومی دنوں کے علاوہ اہم اسلامی مواقع جیسے عید میلاد النبی، یکم رمضان، عید الفطر، عید الاضحیٰ، یوم عرفہ اور نئے اسلامی سال کے آغاز یعنی یکم محرم کو عام تعطیل ہوتی ہے۔ عوام میں مکمل مذہبی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ عام کاروباری مراکز صبح سویرے کھل جاتے ہیں۔ دن بھر نمازوں کے اوقات میں دکانیں پندرہ منٹ کے لیے بند رکھی جاتی ہیں۔

مالدیپ میں شادی کی عمر ۱۸سال ہے تاہم نصف سے زیادہ خواتین ۱۵برس کی عمر میں ہی بیاہی جاتی ہیں۔ ہندو پس منظر رکھنے کے باوجود یہاں شادی کا عمل آسان اور فضول رسوم و رواج سے پاک ہے۔ ایک سے زائد شادیاں کرنے کا رواج عام ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص صبح گھر سے کام پر نکلے، تو شام کو اپنی منکوحہ کے ساتھ گھر واپس لوٹتا ہے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ بھی جب یہاں آیا تو اپنے قیام کے دوران اس نے چار شادیاں کی تھیں۔

روزگار کے مواقع کم ہونے کے باعث یہاں عزت کا معیار تعلیم اور خاندان سے زیادہ صاحب ثروت ہونا ہے۔ حالانکہ ملک میں شرح خواندگی کا تناسب ۹۸ فیصد جنوبی ایشیا میں بلندترین ہے۔

وطن عزیز کی طرح مالدیپ میں بھی تین طرح کے نظام تعلیم رائج ہیں: اول روایتی مذہبی سکول جنھیں ''مکتب'' کہا جاتا ہے اور وہ قرآن پاک پڑھانے کے ساتھ ساتھ بنیادی حساب سکھاتے اور مالدیپی زبان کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ دوم مالدیپی میڈیم سکول اور سوم انگلش میڈیم سکول۔ نظام تعلیم برطانوی طرز کا ہے۔ پرائمری تعلیم کا دورانیہ پانچ سال رہتا ہے۔ جبکہ سکینڈری تعلیم دو حصوں میں مکمل ہوتی ہے: پہلے پانچ سال نچلی سطح اور دو سال ہائر سطح پر۔

مالدیپ کی سرکاری اور عام زبان، مالدیپی اینگلو یورپین سمجھی جاتی اور سری لنکا کی قدیم سنہالی زبان سے مشابہ ہے۔ اُسے دائیں سے بائیں لکھتے ہیں۔ حروف تہجی

مالے کی ایک معروف سڑک

کی ۸۰ فیصد برآمدات بھی منجمد و ڈبہ بند مچھلیاں ہیں۔

مالدیپ الگ تھلگ ہونے کے باوجود استعمار کے پنجوں سے بچ نہیں سکا۔ سقوط غرناطہ سے شہہ پا کر یورپی اقوام جب دنیا کے وسائل پر تصرف جمانے اور ملکوں کو زیر اثر لانے نکلیں تو افریقہ کے بعد ان کی نظر ہندوستان پر پڑی۔ تب برصغیر میں ایک بہت بڑی اور مستحکم بادشاہت تھی۔ مضبوط اعصاب والے جنگجو مغلوں کا دور تھا۔ اتنے بڑے ملک پر ایک دم سے قابض ہونا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس لیے تجارت کے بہانے آنے والے یورپیوں کو ذرا دم لینے کے لیے رکنے کے واسطے مالدیپ سے بہتر کوئی پناہ گاہ دکھائی نہ دی۔

چنانچہ سب سے پہلے پرتگالیوں نے (۱۵۵۸ء تا ۱۵۷۳ء) مالدیپ کو اپنے شکنجے میں جکڑے رکھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ سونے کی چڑیا (ہندوستان) پر گدھوں کی طرح جھپٹنے والی یورپی اقوام کئی سو سال تک بحر ہند میں باہم برسرپیکار رہیں۔ اور بالاخر شاطر انگریز سب پر غالب آگئے۔ تب (۱۸۸۷ء میں) مالدیپ کو بھی انگریزوں کی زیر محافظت آنا پڑا۔ تاہم حکمرانوں نے دفاع اور خارجہ امور کی ذمہ داری انگریزوں کو سونپ کر داخلی خودمختاری برقرار رکھی۔

۱۹۳۲ء میں مالدیپ کے سلطان نے پہلا قانون منظور کیا اور مملکت موروثی کی بجائے انتخابی ہوگئی۔ مالدیپ نے مکمل خودمختاری ۱۹۶۵ء میں پائی اور اسی سال وہ اقوام متحدہ کا رکن بھی بنا۔ ۱۹۶۸ء میں نقش کہن مٹانے کے لیے سلطنت کا خاتمہ کردیا گیا اور یوں سلطانی جمہور کا آغاز ہوا۔ ۱۱ نومبر ۱۹۶۸ء کو ایک منتخب صدر کے ساتھ جمہوریہ مالدیپ معرض وجود میں آگئی۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ حضرت انسان کو ایسی پرخطر اور کم وسائل والی جگہ پر آباد ہونے کا خیال کیونکر آیا؟ اہل تحقیق اس بارے میں خاموش ہیں تاہم ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق ان جزائر پر اولین انسان پانچ سو قبل مسیح میں ہندوستان اور سری لنکا سے ہجرت کرکے یہاں آئے۔ وہ عقیدے کے لحاظ سے بدھ مت تھے۔ آج بھی مسلمان ہونے کے باوجود مالدیپیوں کے عقائد میں مافوق الفطرت اثرات کا پایا جانا اس امر کی تائید کرتا ہے۔ بعض مورخین کا دعویٰ ہے کہ یہ جزائر سب سے پہلے صومالی ملاحوں نے دریافت کیے جو سونے کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے یہاں آئے تھے۔ نیز تب کوڑیوں کو کرنسی کی حیثیت حاصل تھی اور مالدیپ کے جزائر اس دولت سے مالا مال تھے۔

مالدیپ کے عوام بارھویں صدی میں دین اسلام سے روشناس ہوئے۔ حتیٰ کہ تیرھویں صدی میں اسلام یہاں کا سرکاری مذہب بن گیا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ کے مطابق اہل مالدیپ میں اس مذہبی انقلاب کا سبب ایک عرب ملاح ابوالبرکات بغدادی کی تعلیمات بنیں جو تیرھویں

دنیا میں عموماً دو طرح کے جزائر ملتے ہیں: آباد جزیرے اور بے آباد جزیرے۔ لیکن مالدیپ میں ایک تیسری قسم کے جزیرے بھی پائے جاتے ہیں جنھیں آپ غائب جزیرے کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایسے جزیرے ہیں جو زمینی کٹاؤ یا پانی کی سطح بلند ہونے یا دوسرے جزائر کے ساتھ ضم ہوجانے کی وجہ سے غائب ہوچکے۔

مالدیپ کے بارے میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ سطح سمندر سے صرف چند میٹر بلند ہے۔ مالدیپ کی اوسط بلندی صرف ۱ء۵ میٹر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرزمین مالدیپ کو سمندروں کی روز بروز بلند سطح سے زبردست خطرہ لاحق ہے۔

یاد رہے، مرجانی جزائر ملک کی قدرتی گروہ بندی ہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ مالدیپی جزیرے دراصل زیر آب اگنے اور نشوونما پانے والی مونگے کی کالونیاں ہیں جو ہزاروں لاکھوں سال میں بڑھ کر بڑی بڑی چٹانوں کی شکل اختیار کرچکیں۔ ان چٹانوں کے جن حصوں نے ابھر کر پانی سے سر نکالا، وہ جزیرے بن گئے۔ ایسی زیر آب ایک چٹان سے ابھرنے والے چھوٹے بڑے جزائر کے ایک گروہ کو مرجانی جزیرہ کہتے ہیں۔

مالدیپ ایسے ۲۶ مرجانی جزائر پر مشتمل ہے۔ ان جزیروں کے کئی حصے ابھی ابھر کر پانی سے باہر نہیں نکلے اور نیچے سے جھانکتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گیارہ سو بانوے جزائر میں سے صرف دو سو کے لگ بھگ آباد ہیں۔ دارالحکومت مالے بھی تین جزیروں مالے، ولنگلی اور ہل ہلے پر مشتمل ہے۔ ہل ہلے جزیرہ مالے سے صرف دو میل کی دوری پر واقع ہے اور اتنا چھوٹا ہے کہ اس پر صرف ہوائی اڈہ ہی تعمیر کیا جاسکا۔

مالدیپ کا شمار متوسط آمدن والے ممالک میں ہوتا ہے۔ پانی میں گھرے چھوٹے جزیروں پر بسنے والوں کے ذرائع آمدن کیا ہوسکتے ہیں؟ پیشہ آبا صدیوں سے ماہی گیری چلا آرہا ہے۔ تاہم گزشتہ چند دہائیوں میں حکومت سیاحت کے فروغ پر خصوصی توجہ دے رہی ہے۔ نتیجے میں اب قومی آمدنی کا تقریباً ساٹھ فیصد زرمبادلہ سیاحت سے حاصل ہوتا ہے اور بقیہ ماہی گیری، کشتی رانی اور کشتی بانی سے۔ فی کس آمدن سارک ممالک میں سب سے زیادہ ہے یعنی ۸۷۳۱ ڈالر۔

افرادی قوت کی کمی اور مخصوص طبعی ساخت کی وجہ سے صنعت وحرفت اور زراعت نہ ہونے کے برابر ہیں۔ البتہ بہت پرانے جزائر کی بالائی سطح بھربھری مٹی بن گئی ہے لیکن وہ بھی اتنی زرخیز نہیں کہ اس پر منافع بخش فصلیں کاشت کی جاسکیں۔ بس ناریل کے درخت اور محدود پیمانے پر سبزیاں بمشکل کاشت ہو پاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کو دیگر اجناس بیرون ملک سے درآمد کرنا پڑتی ہیں۔ تاہم عوام کی عمومی خوراک کا ایک بڑا حصہ آبی حیات ہے۔ ملک

مالے میں واقع ایک خوبصورت مسجد

دنیا

کے نقشے پہ نظر دوڑائیے، بھارت آپ کو ایک خنجر سے مشابہ دکھائی دے گا۔ اس کے دستے پر نیپال اور بھوٹان نگینے کی طرح جڑے ہیں جبکہ نوک خنجر پر سری لنکا آنکھ سے ٹپکے آنسو کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ وہ غالباً ہند کی آنکھ سے ٹپکا اور بحر ہند میں جا گرا۔

نقشے میں سری لنکا کے بائیں جانب دیکھیے تو آپ کو بے ترتیب نقطوں کی دو قطاریں یعنی بے شمار آنسو نظر آئیں گے۔ یہ جمہوریہ مالدیپ ہے، ڈوبتے ابھرتے جزیروں کا دیس جو اپنی خوبصورتی، منفرد جغرافیائی ساخت کے باعث دنیا کے خوبصورت ترین سیاحتی مقامات میں سے ایک ہے۔

گیارہ سو بانوے جزائر پر مشتمل یہ ملک رقبے اور آبادی کے لحاظ سے ایشیا کا سب سے چھوٹا ملک ہے۔ قدرتی طور پر چہار اطراف سے پانی میں گھرا ہوا ہے۔ یوں تو اس مملکت کی حدود لگ بھگ نوے ہزار مربع کلومیٹر پر محیط ہیں لیکن خشکی پر مشتمل رقبہ صرف دو سو اٹھانوے مربع کلومیٹر ہے۔

گویا یہ واحد ملک ہے جس کا ننانوے فیصد رقبہ پانی پر اور بقیہ ماندہ ایک فیصد خشکی پر مشتمل ہے۔ وہ بھی زمین نہیں بلکہ سطح آب سے جھانکتی مرجانی یا مونگے کی چٹانیں (Atolls) ہیں جنھوں نے سطح سمندر پر نمودار ہو کر چھوٹے بڑے جزائر کی شکل اختیار کر لی۔ یہ جزائر ایک دوسرے سے الگ تھلگ سمندر میں بے ترتیب بکھرے پڑے ہیں۔ گویا کائنات تخلیق کرنے کے بعد جو فالتو ملبہ بچا، وہ خالق کائنات نے بحر ہند میں پھینک دیا اور یوں بیچ سمندر بنی نوع انسان کا منفرد مسکن معرض وجود میں آ گیا۔

جمہوریہ مالدیپ اسلامی مملکت ہے۔ اور سعودی عرب کے بعد دنیا کا واحد ملک جس کی سو فیصد آبادی مسلم ہے۔ ملک میں اسلام کے کسی اصول سے متصادم قانون نافذ نہیں ہو سکتا۔ نیز دستور کے مطابق کوئی غیر مسلم ملک کا شہری نہیں بن سکتا۔ اسے کسی مالدیپی عورت سے شادی کرنے اور مملکت میں جائیداد خریدنے کا بھی حق حاصل نہیں۔

۹۶۰ کلومیٹر کی طوالت پر پھیلا مالدیپ صدارتی جمہوریہ ہے۔ حکومت اور ریاست کا سربراہ صدر ہے۔ صدر بذریعہ انتخابات پانچ سال کے لیے منتخب ہوتا ہے۔ اسی طرح اس مرجانی جزیرے کے پارلیمنٹ ممبران بھی پانچ سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ تاہم ان کی تعداد کا تعین آبادی کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ ۲۰۰۹ء میں منتخب ہونے والے ارکان کی تعداد ۷۷ تھی۔ واضح رہے کہ اس وقت ملک کی کل آبادی دو لاکھ ستر ہزار کے لگ بھگ تھی۔

۹۸ فیصد شرح خواندگی والے ملک مالدیپ میں ووٹ ڈالنے کی اہل عمر ۲۱ سال ہے۔ قانون ساز اسمبلی جو "مجلس" کہلاتی ہے، ۱۵۰ ارکان پر مشتمل ہے۔ پارلیمنٹ کے دو رکن مالے اور باقی دیگر انتظامی مرجانی جزائر سے چنے جاتے ہیں۔ ۱۸ ارکان کو صدر منتخب کرتا ہے۔ تمام رکن مجلس کے اجلاس میں شرکت کرنے کے مجاز ہیں لیکن ووٹ کا حق صرف منتخب کو ہی حاصل ہے۔

جمہوریہ مالدیپ کا کل رقبہ ۲۹۸ مربع کلومیٹر ہے۔ وہ گیارہ سو بانوے جزائر پر مشتمل ہے۔ تاہم انتظامی لحاظ سے مالدیپ سات صوبوں اور اکیس ڈویژن میں منقسم ہے۔ ہر صوبہ کئی جزیروں پر مشتمل ہے۔ سب سے بڑا جزیرہ "جن" ہے جو لاموصوبے پر واقع ہے جبکہ سب سے چھوٹا جزیرہ "راکیدھو" ہے جو دارالحکومت مالے سے ۹۲ کلومیٹر کے فاصلے پر "واویو" مرجانی جزیرے پر واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ صرف ۶۳۰ میٹر ہے۔ "واویو" صوبے کے کل ۱۹ جزیروں میں سے صرف پانچ آباد ہیں۔ ان پانچ کی کل آبادی دسمبر ۲۰۰۷ میں صرف ۲۲۱۵ تھی۔

سمندر میں مٹی کے بکھرے دیپ

نیلی سمندری جھیلوں، ریتلے ساحلوں اور خوب صورت پُرسکوں جزائر کے اچھوتے دیس کا جان فزا ذکر جہاں دنیا بھر کے سیاح کشاں کشاں کھنچے چلے آتے ہیں

زبیدہ نے تینوں گھڑے اُٹھائے۔ دو سر پہ رکھے، ایک بغل میں دابا اور دبے پاؤں پانی بھرنے نکل گئی۔ یہ ان دنوں کا تذکرہ ہے جب زمینوں نے گہری آغوش میں چھپایا میٹھا پانی نہیں اگلا تھا۔ نہر کے قریب ایک آدھ گھر میں ہاتھ کا نل لگا تھا اور باقی اس امید پہ جی رہے تھے کہ آنے والے کسی بھی سال وہ بھی سیراب ہونے والے ہیں۔

زبیدہ معمول کی طرح کنوئیں پہ پہنچی۔ پہلے سلطان اُس کے ساتھ آتا، تو وہ بوکے کی رسی کھینچتا۔ مگر آج وہ تنہا تھی۔ متواتر برستے بادلوں کی وجہ سے کنوئیں کی جگت بھی گیلی تھی۔ اُس نے گھڑے جگت پہ رکھے اور دونوں پاؤں مٹی کی لکر پہ رکھ کے ٹک گئی۔

سرخ گاڑی پچھلی سڑک کا چکر کاٹ آئی تھی۔ اب سبز کھیتوں کے درمیان بیر بہوٹی بنی بھاگی جا رہی تھی۔ ایک مرتبہ اُس کا دل چاہا، وہ گاؤں کی طرف پیٹھ کر لے اور گاڑی کے پیچھے دوڑتی جائے...... دوڑتی جائے...... دوڑتی جائے۔ اس نے لاشعوری طور پر پاؤں سے چپل اُتار بھی لی مگر اسی وقت سلطان بھاگتا آ گیا۔

"آپا! تم اکیلی آ گئیں؟ اماں پریشان تھی۔ آج تو بادل بھی ہے۔ تم اکیلے پانی کیسے نکالتی؟ لاؤ میں بوکا کھینچتا ہوں۔" وہ لوہے کی ٹینڈیوں کے پاس دھری رسی اُٹھا لایا۔

زبیدہ نے گھڑے لبالب بھرے۔

سلطان کہتا بھی رہا "آپا ایک مجھے دے دو۔ ایک تو میں اُٹھا ہی لوں گا۔ تم دونوں کیسے......" مگر زبیدہ نے دو سر پہ رکھے، ایک بغل میں دابا اور گھر کی طرف چل سو چل۔ پھر اس قصے پہ ایسی مٹی پڑی کہ زبیدہ سمیت سب نے اسے گہری قبر میں دفن کر دیا۔ کبھی کبھار خوشی غمی کے موقع پہ خاندان والیاں اکٹھیں ہوئیں، تو کوئی نہ کوئی اسے کریدتے ہوئے کف افسوس مل کے کہتی:

"ہاہ...... نی زبیدہ، آج اپنے گھر کی ہوتی، تو بھائی کے برتن دھونے کے بجائے اپنا بال بچہ کھلاتی۔"

"جانے دو۔" اماں بلبلا کے کہتی۔ "اپنا سلطان احمد بیاہنے چلی ہوں۔ زبیدہ اس کے بچے کھلائے گی۔ بھائی کے بچے بھی اپنی ہی ہوتے ہیں۔"

لیکن جب بیاہ کے دوسرے ہی مہینے بھرجائی نے چولھا چوکا سنبھال لیا، تو زبیدہ عورتوں کے درمیان سوچوں کی لکن میٹی کھیلتے ایک ہی بات سوچ رہی تھی "اب میں کیا کروں؟"

> "تم تھوڑی سی ہمت سے کام لو، تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ساری زندگی دوسروں کا کامی بننے سے بہتر ہے تم اپنا گھر بسا لو۔"

شام ڈھلی، تو عورتوں کی محفل بھی سونی ہو گئی۔ ایک ایک کر کے سب اُٹھ گئیں۔ زبیدہ نے وضو کیا اور مغرب کی نماز پڑھنے مصلے پہ کھڑی ہوئی۔ اماں نماز پڑھ کے اُٹھ گئیں، وہ وہیں بیٹھی رہی۔ انھوں نے پھر نماز عشا پڑھی۔ اماں اُٹھ گئی، پر زبیدہ پتا نہیں کب اُٹھی۔ جب اماں فجر کو اُٹھی، زبیدہ پہلے سے جائے نماز پہ بیٹھی تھی۔ اس کا سر عالم استغراق میں ہل رہا تھا۔ پھر نہ اماں نے اسے چھیڑا نہ اُس نے اسے بلایا۔

ہفتہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ بھرجائی چپکے سے روٹی پانی لا کر جائے نماز پہ رکھنے لگی۔ چچی نے ایک آدھ مرتبہ جھانکا پھر سر ہلا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ محلے والیاں کہنے لگیں:

"اب بچوں پہ پھونک مروانے، آٹے اور چینی پہ دم کروانے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں، اپنی زبیدہ جو ہے۔ اُسے تو جیسے بھرجائی کے آنے کا انتظار تھا۔ راج پاٹ اُس کے حوالے کر وہ اللہ والی ہو گئی ہے۔"

پہلے پہل ماں اور باپ اس کی صورت دیکھ دیکھ کر روئے۔ پھر انھوں نے اپنے سارے خواب سلطان احمد کے پاس رہن رکھ دیے۔ بیٹی سمیت تینوں کھلی آنکھوں سے آنگن کو سلطان کے بچوں سے بھرا ہوا تکنے لگے۔

زبیدہ اُن کے گورے گورے بدنوں پہ تیل کی مالش کرتی۔ انھیں نل تلے بازوؤں میں لے کے نہلاتی۔ ننھے وجود گھٹنوں تلے دبا کے اُن کی آنکھوں میں سرمہ لگاتی۔ انھیں روٹی کھلاتی۔ ذرا بڑا ہونے پہ اُن کا بستہ اٹھا کے ساتھ ساتھ چلتی اسکول تک جاتی۔ واپسی پہ گاؤں سے باہر تک آ کے اُن کی راہ تکتی۔ وہ دیر تک اپنا وجود اُن سے لپیٹے دن کو رات اور رات کو دن کرتی رہی۔ ایک روز کمال احمد المعروف سیشن جج ایک مرتبہ پھر اُس کے دروازے پہ آ گیا۔

سرما کی گیلی شام تھی۔ بادل آہستہ آہستہ برس رہا تھا۔ گلیاں بازار سب سونے پڑے تھے۔ لوگ باگ گھروں میں دبک گئے تھے۔ دروازوں کی دہلیزوں پہ صرف آوارہ کتے بیٹھے تھے۔ چولھے کے پاس جولائی کی سی گرمی تھی۔ زبیدہ لپاچھپ گول گول پھولی پھولی چپاتیاں اُتارے جاتی تھی۔ تبھی گھر کے سامنے موٹر آ کے رکی۔ دائیں بائیں کھلتی کھڑکیوں سے جھانکتے سروں نے دیکھا کہ گاڑی سرخ رنگ کی ہے۔ لمبے سفر کا کیچڑ کھا کے وہ ایسے شرارتی بچے کی طرح لگ رہی تھی جو مٹی سے منہ دھو کے گھر آ جائے، مگر دیکھنے والوں کو اُس کے خفتہ حسن کا یقین ہوتا ہے۔

کمال دین نے بڑے اعتماد سے صحن پار کیا اور گھنڈ کاڑھتی بیوی کو دیکھتا اماں کے سرہانے جا بیٹھا۔ پھر روایات برتی گئیں۔ اخلاق بگھارے گئے۔ دیگچہ بھر کے مرغ پلاؤ دم پہ لگایا گیا۔ دیسی انڈوں کا خاگینہ پکا۔ چھوٹی الائچی اور ہلکی پتی ڈال کے دودھ اُبالا گیا۔

اماں ابا داماد کے سامنے بچھ بچھ گئے مگر جب اُس نے زبیدہ کو ساتھ لے جانے کی بات کی، دونوں صاف انکاری ہو گئے۔

''گوشت سے ناخن جدا نہیں کیا جا سکتا۔'' اماں بولی۔ ''ہم نہ خاندان چھوڑ سکتے ہیں نہ بیٹی سے دور رہ سکتے ہیں۔''

''مگر یہ زیادتی ہے۔'' کمال دین نے پھر اپنی تمام تر وکیلانہ صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے دلائل کی بساط بچھائی، مگر ''زمین جنبد نہ جنبد گل محمد'' کے مصداق اماں ابا انچ بھر نہ سر کے تو وہ بولا ''مجھے ایک مرتبہ زبیدہ سے ملنے دیں۔''

اماں اُسے کمرے میں لے آئیں۔ زبیدہ نے اُسے دیکھ کر پھر گھنڈ کاڑھ لیا۔

''دیکھ زبیدہ!'' کمال دین کھنکھارا ''اس سارے قصے میں ہمارا قصور کوئی نہیں، مگر نقصان صرف ہمیں ہی ہو رہا ہے۔ تم تھوڑی سی ہمت سے کام لو تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ساری زندگی دوسروں کا کامی بننے سے بہتر ہے تم اپنا گھر بسا لو۔''

''یہ میرے ماں باپ کا گھر ہے۔'' زبیدہ مِن مِن کرتی بکری بن گئی۔

''یہ صرف تمہارے بھائی کا گھر ہے۔ اور کل کو آنے والی تمہاری بھرجائی کا بھی۔'' کمال دین نے خوب چبا چبا کے کہا۔ ''ہوش کے ناخن لو کیوں اپنی زندگی برباد کرتی ہو؟''

''میں اور سلطان الگ نہیں ہیں۔'' بکری پھر منمنائی۔

کمال دین کا دل سوکھے آلو بخارے کی طرح چرمر ہو گیا۔ دس منٹ کم پورا گھنٹا وکیل صاحب دلیلیں دیتے رہے۔ پھر مقدمہ ہار کے جیسے آئے تھے ویسے ہی پلٹ گئے۔ گاڑی نے گیلی مٹی پہ ٹائروں کے نشان چھوڑے اور ہوا ہو گئی۔

امتحان پاس کرلیا ہے۔ پنج وقتہ نمازی ہے۔ پان، سگریٹ کچھ نہیں پیتا۔ ابھی نوکری پہ لگا نہیں مگر ادھر ہمارے تھلوں میں سب اُسے سیشن جج بولتے ہیں۔"

غلام علی، فیروز کے ساتھ جا کے خود اُسے مل آیا۔ لڑکا اُس کے دل کو بھا، تو آس پاس سے معلومات کرانے کا ڈول ڈالا۔ سب نے نیک ہونے کی گواہی دی، تو بات آگے بڑھی۔ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ بعد اُدھر سے گاڑی بھر کے مرد عورتیں آئے اور زبیدہ کی ہتھیلی پہ مٹھی بھر روپے رکھ بات پکی کر گئے۔ ٹھیک چار ماہ بعد زبیدہ کی ڈولی سسرالی گھر میں اُتری، تو سردیوں کی دھوپ پیلی پڑنے لگی تھی۔ ریتیلی زمین پہ ہونکتی گرمی دھیرے دھیرے سانس چھوڑ رہی تھی، مگر ماحول پہ اس کی تمازت کا اثر ابھی باقی تھا۔

دلھن کو کھلے صحن میں بٹھایا گیا۔ منہ دکھائی کی رسم شروع ہوئی۔ میراثنوں نے سُر سے تال ملائی۔ کنبے برادری کی عورتیں "ویلیں" دینے لگیں۔ تبھی "ساقا" گلے میں ڈھول کا پٹہ ڈالے اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے کا رنگ سوکھے کیکر کی چھال سا تھا۔ ساری زندگی ڈھول بجا بجا کے اس کی انگلیوں میں گٹھے پڑ گئے تھے۔ وہ ایک خاص رخ پہ قدرے ٹیڑھی ہو گئی تھیں۔ صحن میں آتے ہی اس نے ڈھول پہ تھاپ دی اور پاٹ دار آواز میں بولا: "خیر ہو سرکار کی، شالا بھاگ لگے رہن۔"

ساقے کی ساتھی دلھن کے پیچھے تالیاں بجا بجا کے میراثنوں کو ہلا شیری دے رہی تھی۔ اُس نے وہیں سے اپنا بازو اُٹھایا اور جوابی سُر میں لہک کے بولی: "اوچی ماڑیاں قائم رہیں۔ بوٹے لگے رہن، پھلن پھولن۔"

دُلھے کی پھوپھی میراثنوں کی ہر لے پہ دس دس روپے کے نوٹ نچھاور کر رہی تھی۔ وہ یکدم آبدیدہ ہو گئی۔ نوٹوں بھری چنگیر زمین پہ رکھ کے بولی:

"آج میاں جی زندہ ہوتے، تو دیکھتے کہ پوتے کی بارات کس چاؤ سے چڑھی ہے۔ بستی کے بچے بچے نے پیالہ بھر بھر بوٹیاں کھائیں اور شوربہ پیا ہے۔ زردے پلاؤ کی اتنی دیگیں اتریں کہ پیٹ بھر گئے مگر طشت خالی نہ ہوئے۔"

قریب بیٹھی ایک بوڑھی عورت نے پوپلی زبان خالی منہ میں رولی اور بولی "نیک بختے کیا یاد دلا دیا۔ خود تو ساری عمر منگلی پہ چمڑا کوٹتے اور چنے پہ طلا چڑھاتے رہے مگر اولاد کو علموں پار لگا گئے۔ سیانے آدمی کی یہی نشانی ہے۔ خود موٹا جھوٹا کھا کے بچوں کو پڑھایا۔ آج وہ کرم داد جوتا سینے والے کے بجائے محمد علی سیشن جج کا دادا کہلوایا۔"

> سیانے آدمی کی یہی نشانی ہے۔ خود موٹا جھوٹا کھا کے بچوں کو پڑھایا۔ آج وہ کرم داد جوتا سینے والے کے بجائے محمد علی سیشن جج کا دادا کہلوایا۔"

دلھن کے ساتھ اُس کی خالہ آئی تھی۔ بڑھیا کی بات سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُس وقت تو چپ رہی، مگر واپس آ کر وہ فیل مچایا کہ خاندان بھر نے یہ کہتے ہوئے غلام نبی کا حقہ پانی بند کر دیا:

"تم نے موچیوں میں بیٹی دے کر ہم سب کی ہیٹی کر دی۔ اب خاندان رکھو یا رشتہ نبھاؤ۔"

غلام علی نے ہزار سمجھایا۔ اس کا سمدھی خود چل کر آیا۔ فیروز نے گواہی دی کہ لڑکے کے دادا نے حالات سے تنگ آ کر کچھ عرصہ یہ کام کیا، ورنہ ہیں تو اصیل جاٹ۔ بے شک پچھلی پیڑھیاں نکلوا کے دیکھ لو۔ پھر حق حلال کی کمائی میں میہنا کیسا؟ مگر برادری نے انکار کر دیا...... اور زبیدہ نے باپ کی دہلیز پکڑ لی۔

ہے۔ کل تک صغریٰ تجھے وارے میں نہ تھی، آج ہاتھ کا پھپھولا بنا کے اُٹھائے پھرتا ہے۔"

☆

اماں کی ایک پھوپھیری بہن تھی۔ صغریٰ اسی کی نند کی بیٹی تھی۔ کھانا پکانا خوب جانتی تھی۔ گھر بھر کے کپڑے سلائی کر لیتی۔ شکل صورت گزارے لائق تھی۔ چند ایک سال مکتب جاتے رہنے کی وجہ سے خط پڑھ لیتی۔ سودے سلف کا حساب بھی رکھتی۔ جب اتنے گن پورے تھے، تو اماں کو سلطان احمد کا رشتہ ڈالنے کی ہوئی۔ اُدھر سے معمولی پس و پیش کے بعد ہاں ہوگئی۔ مگر بیٹے کے کان میں ماں کے ارادوں کی بھنک پڑی، تو بدک گیا کہ صغریٰ جیسی "گھگو" کو بیوی نہ بنائے گا۔ اماں نے بہتیری منت سماجت کی۔ زمانے کی اونچ نیچ بتائی۔ چار بندے بلا کے سمجھایا بھی۔ آخر اپنا دوپٹہ بیٹے کے قدموں میں ڈال پھپھک کر رو دی اور کہا:

"خاندانی لوگوں کے ہاں زبان ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ کیوں بڑھاپے میں میرے بالوں میں راکھ ڈالتے ہو؟"

آخر سلطان احمد ان منے دل سے صغریٰ کو بیاہ لایا۔ اب وہ اپنے ہی تھوکے کو پوری قلبی رضامندی سے چاٹنے پہ تل گیا تھا۔ صغریٰ نے ساس کا بین سنا، تو دھپ دھپ کرتی اندر کمرے میں چلی گئی۔ زبیدہ ابھی تک عورتوں کے جھرمٹ میں جا گو میٹی کھیل رہی تھی۔ اس کا سارا وجود باری کا بخار بنا ہوا تھا۔ رہ رہ کر دماغ میں ایک ہی خیال پھنک رہا تھا: "اب میرا کیا ہوگا؟"

زبیدہ کا باپ ضلع کچہری میں محرر تھا۔ مہینے کے مہینے گھر آتا۔ چھے بیگھے زمین کا مالک تھا۔ وہ حصے پہ دے کے ہاتھ جھاڑ بیٹھا تھا۔ لڑکے کی طرف سے اسے چنداں فکر اس لیے نہ تھی کہ اس کی پشت پہ ماں کا ہاتھ بہت مضبوط تھا۔ دوسرے وہ خود بھی پیدائشی سیدھا تھا۔ نہ اپنے ہم سنوں کی طرح دھینگا مشتی کرتا نہ کسی مسئلے کا باعث بنتا۔ ناک کی سیدھ پہ اسکول جاتا اور واپس گھر آ کے آپا سے کھیلتا جو دن بدن تاڑ کی طرح لمبی ہوئی جاتی تھی۔ آخر غلام نبی محرر کے کان یہ سوچ سوچ کر کھڑے ہونے لگے کہ اس کی جگہ کہاں بنائے؟

کوئی چچیرا بھائی ہوتا، تو اس مشکل گھڑی بازو بنتا۔ مگر سارے خاندان میں لڑکوں کا ایسا کال پڑا کہ اگر حساب لگاتے، تو ایک ایک لڑکے پہ چار چار لڑکیاں پڑتیں۔ اب اس کلجگ میں زبیدہ کہاں فٹ کی جاتی۔ سو غلام نبی نے قانونی مسئلوں اور مقدماتی لغات سے سر اُٹھا کر ارد گرد نظر دوڑانی شروع کر دی، تو اس کی مڈبھیڑ فیروز سے ہوگئی۔ فیروز کچہری میں اشٹام فروشی کرتا تھا۔ اس کا خاندان ضلع خوشاب سے اُدھر کہیں تھلوں میں آباد تھا۔ وہ کچہری میں دن کو دکانداری کرتا اور رات کو وکیلوں کے تھڑوں پہ چارپائی بچھائے تاروں تلے غلام فرید کی کافیاں گاتا۔

ایک دن فیروز غلام نبی کے پاس پہنچا، تو وہ اضطراری کیفیت میں ٹانگ پہ دھرا پیر جھلاتے ہوئے فون پہ کسی سے بات کر رہا تھا:

"دیکھ لے، دیکھ لے۔ سلطان احمد کو ایک چھوڑ دس رشتے ہیں۔ پھر بھی اگر وٹے پہ بات بنتی ہے تو کوئی حرج نہیں۔ مگر رشتہ جوڑ کا ہونا چاہیے۔ اور برکتے کا لڑکا زبیدہ سے لگ بھگ دس سال چھوٹا ہے۔"

بھرجائی نے آگے سے جو کچھ بھی کہا، غلام نبی دائیں بائیں سر ہلا ہلا کر ناں ناں کرنے لگا۔ فیروز لاتعلق سا بیٹھا کان میں تنکا گھماتا رہا۔ غلام نبی نے کسی بات پہ جھلا کر فون بند کیا، تو دھیمی سی آواز میں بولا:

"دھی رانی کا ایک رشتہ میرے پاس بھی ہے۔ اُدھر ہمارے تھلوں میں بڑا لائق فائق لڑکا ہے۔ وکالت کا

بڑے فخر سے آویزاں کیے جاتے۔گلی میں پھیری لگانے والوں سے بھوسی اور خشک روٹیوں کے بدلے مٹی کے پیالے خریدے جاتے۔ ایک ایک گلاس کے اوپر پیالے دھر کے ان کی گنتی بھلا دی جاتی۔ساس کے پاس بھی ایک سے ایک بھاری برتن موجود تھا۔ خود اس کی ماں نے جہیز دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ پڑچھتیاں بھر گئیں' تو لوہے کی پیٹیوں اور ان پہ دھرے جست اور ٹین کے ٹرنکوں کی باری آئی۔ ہر دفعہ ٹرنک کھولنے سے پہلے برتنوں کا ازدحام جذباتی مدوجزر کی طرح اترتا چڑھتا رہتا۔

پھر رواج بدلا اور تام چینی کی جگہ سلور' اسٹیل اور تانبے کی جگہ پلاسٹک نے لے لی۔ قلعی شدہ برتن پہلے نیچے اترے پھر گھروں کے پچھلے کمروں اور کوٹھڑیوں میں ڈالے گئے۔ وہاں سے نکل نیلام گھروں میں جا پڑے۔ باورچی خانے نت نئے رنگوں اور پھولوں والے برتنوں کی کھنک سے بھر گئے اور اب سلطان احمد کی بیگم نے بھی پرانے برتن اٹھا سیلی کوٹھڑی میں ڈال دیے۔

محلے والیاں بظاہر اماں سے ہمدردی جتانے اور اندر خانے معاملے کی ٹوہ لینے آتی رہیں۔ صحن میں بیری کا چھترا سا درخت لگا تھا۔ اس کے نیچے محفل جم گئی۔ زبیدہ چار عورتوں کے درمیان بیٹھی سوچوں کی لکن میٹی کھیل رہی تھی۔ سکینہ' نسیم اور رضیہ اپنے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ زیادہ سے زیادہ الفاظ اور کم سے کم وقت میں پیش کرنے پہ تلی تھیں۔ اماں گاہے گاہے حقے کی نالی گھما کے پیچھے کرتی اور اپنی ران پہ دوہتڑ مار کے کہتی:

''اری! ہم سے کیا کہتی ہو؟ جا کے اس صغریٰ بی بی سے پوچھو یا پھر سلطان سے جس نے بیوی کے آتے ہی آنکھیں ماتھے پہ رکھ لیں۔

سکینہ نے دوپٹے سے خشک آنکھیں پونچھیں اور بولی ''خیر بیٹے تو بابا آدم کے زمانے سے بیویوں ہی کے رہے ہیں۔ کون ماں ایسی ہے کہ بیٹا بیاہنے کے بعد بھی پہلے کی سی ہری بھری رہے؟ پر ادھر ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں' میاں بیوی چار دن تو صبر کرتے۔''

صغریٰ نے تازہ مکّھن کا دیسی گھی بنایا تھا۔ وہ گھی کا کھٹا ناند میں گرانے آئی تو سکینہ کے بول کانوں میں پڑے۔ وہ آگ کھائی شرلی کی طرح بھڑکتی آئی اور داہنا بازو تلوار کی طرح فضا میں لہراتے ہوئے بولی: ''ایسا ہی پدی کا جگر تھا تو بیاہا کیوں؟ سینے سے لگا کے رکھتیں اپنے لاڈے بیٹے کو!''

بہو کی کڑکتی آواز نے اماں کے گرد جیسے جادو کی چھڑی گھما دی۔ وہ کھڑے ہو دونوں ہاتھوں سے زور زور سے اپنا سینہ پیٹنے لگی۔ شور کی آواز سن کے دائیں بائیں دیواروں سے ہمسائیوں کے سر ابھرنے لگے۔ دیورانی بھی سنگھار چھوڑ کے کمرے کی دہلیز پہ آ کھڑی ہوئی۔

سلطان کسی کام سے گھر آیا' تو بیری تلے کی رونق دیکھ کے اس کا لہو رگوں میں تیز ہو گیا۔ جب وہ بولا' تو اس کی آواز میں بجلی تڑتڑ کرنے لگی:

''کیوں پھوڑی ڈال کے بیٹھی ہو اماں؟ کون مر گیا ہے تمہارا۔''

''چل وے چل۔'' اماں نے سینہ کوٹتے دو ہتڑ کو بیٹے کی کمر پہ دے مارا۔ ''آ تجھے بتاؤں' تیری جننے والی آج مر گئی۔ اُسے بھول کے تو بیوی کو ماں بنا بیٹھا ہے۔''

''اماں!'' بیٹے نے انگشت شہادت یوں اس کی طرف اٹھائی' جیسے اُسے متنبّہ کر رہا ہو۔ ''دیکھ لو' تم بات بڑھا رہی ہو۔ گھر کی بات گلی میں نکل کے رلنے لگی ہے۔ اب دنیا میرے منہ پہ تھوکے گی' تو تم خوش ہو گی۔''

اماں بدستور بین ڈال رہی تھی۔ ''ارے دنیا کے تھوکے کی پروا کرتا ہے۔ دیکھ تیرا اپنا تھوکا تیرے منہ پہ آ رہا

ہاتھ ہوگا۔ وہی گھر کے سیاہ وسفید کی مالک بن چکی۔ آئے گئے کا حساب وہی رکھے گی۔ کنبے برادری میں لین دین کی ذمہ داربھی وہی ہوگی۔

چاچی نے سب سنا اور بے نیازی سے شیشے کے سامنے کھڑی چہرے کی روؤں پہ ہاتھ پھیرتی رہی۔ اماں نے صرف اتنا کہا ''دلھن! دو چار دن تو ٹھہر جاتی۔ آخر سلطان احمد کی روٹی پہلے بھی تو پکتی تھی۔''

وہ چمک کے بولی ''مگر پہلے اس کا بیاہ تو نہ ہوا تھا۔''

دلھن کا جواب سن کے اماں کے وجود پہ ناقابل فہم سا رعشہ طاری ہو گیا۔ چہرے کی جھریاں ہولے ہولے تھرکنے لگیں۔ سلطان احمد چپکا پڑا سب سنتا تھا۔ اماں کی بات سن کے ایک دم اُٹھا اور زخمی بھینسے کی طرح فوں فوں کرتا بیگم کی طرف گیا۔ باورچی خانے سے برتن پٹخنے کی آوازیں آئیں۔ خود سلطان احمد کی آواز اونچی ہو کے نیچی ہوئی۔ لوہے کا جگ دھڑام سے نیچے گرا۔

''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' کی آوازیں پورے صحن میں پھیل گئیں۔

جب سلطان احمد واپس اماں کی طرف آیا' تو اس کی داہنی مونچھ نم آلود ہونے کے ساتھ آہستہ سے پھڑک رہی تھی۔ چال میں ایسے نوزائیدہ جرنیل کا سا نشہ تھا جو ابھی فتح وشکست سے آشنا نہ ہوا ہو۔ بولا ''اماں! زبیدہ کی اپنی جگہ ہے' پر گھر تو اب صغریٰ کا ہے نا؟

''بیٹا! یہ تم نہیں تمہارے نویلے بیاہ کا خمار بول رہا ہے۔'' اماں نے کہنا چاہا مگر آواز حلق میں خرخر کرنے لگی۔ سلطان احمد باہر نکل گیا۔ وہ سارا دن زبیدہ نے چارپائی پہ گزارا۔ اماں وقفے وقفے سے اُسے دیکھتی اور رہ رہ کر اُسے اُکساتی رہی:

''اُٹھ جا زبیدہ' کچھ کھا پی لے۔ تم تو بالکل ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھیں۔ اس طرح کھٹیا پہ پڑی رہوگی تو میدان دشمنوں کے لیے خود خالی کر رہی ہو۔'' پھر اونچی آواز میں سنانے کو بولی ''تمہاری جگہ کوئی لے سکتا ہے بھلا؟ تمہارے باپ کا گھر ہے۔ اگلے اسے جہیز میں لے کے نہیں آئے۔''

مگر شام تک اس کی آواز نیچی ہوتی ہوتی بالکل پست ہوگئی۔ دلھن نے اپنے جہیز کے برتن بھانڈے لا کے باورچی خانے میں رکھے۔ ایک ایک رکابی اور گلاس بڑی فنکاری سے پرچھتیوں پر سجائے۔ اور تمام زیراستعمال برتن سرکنڈوں سے بنے ٹوکرے میں ڈال متروکہ اشیا والی کوٹھڑی میں ڈال آئی۔

وہ خود کو ایسی سلطنت کا بے تاج بادشاہ سمجھنے لگی تھی جس کی منہ زور رعایا بادشاہ کے لیے قابل اعتنا نہیں ہو۔ وہ داہنے کان کی بات بائیں سے نکال دیتی۔

اماں معزول حکمران کی طرح کوٹھڑی کے دروازے پہ کھڑی تھی۔ ضبط کی شدت سے اس کی گردن کی رگیں پھول گئیں۔ آنکھوں کے پپوٹے جلنے لگے۔ اس کا سارا اکل کھرا پن سلطان احمد کی منہ زوریوں کے سامنے گھٹنے ٹیک بیٹھا تھا۔ آس پاس والوں نے جانا کہ اب اس کا بولنا خالی برتن بجنے کے سوا کچھ نہیں۔

ٹوکرا کوٹھڑی کے بیچوں بیچ دھرا تھا۔ اس میں پچھلے چالیس سال کی تاریخ دھری تھی۔ جب وہ بیاہ کے آئی تو پیتل' کانسی اور تانبے کے برتنوں کا رواج تھا۔ پیتل کی بڑی بڑی سینیاں' تانبے کے کٹورے اور کانسی کے طشت' قلعی شدہ گلاسوں کے ساتھ دیوار تا دیوار جڑی چھتیوں پہ

سلطان کے بیاہ کو دو ماہ بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ ایک صبح اس کی بہن، زبیدہ مرغ کی پہلی بانگ ہوتے ہی صحن میں آ نکلی۔ گرمیوں میں ویسے بھی راتیں اونگھتی جاگتی رہتی ہیں اور چولھے رات گئے تک بجھے بجھتے صبح تڑکے پھر سلگ اُٹھتے ہیں۔

اُس نے سوکھی لکڑیوں کے ڈھیر سے دو جھانکڑ گھسیٹے مگر صحن کے بیچوں بیچ لگے چولھے تک لاتے ہوئے پاؤں جہاں کے تہاں رہ گئے۔ چولھے پہ سلطان کی بیوی اکڑوں بیٹھی تھی۔ اوپر نیچے جوڑ کے دو لکڑیاں سوکھے گوبر تلے دھری تھیں۔ وہ تھوڑی سی جھک کر وقفے وقفے سے اُن پہ پھونکیں مار رہی تھی۔

''یہ تو کیا کر رہی ہے صغریٰ؟'' زبیدہ نے پوچھا۔

''دیکھ نہیں رہی، آگ جلا رہی ہوں۔'' صغریٰ بولی۔ اس کا لہجہ ایسا سوکھا اور تڑخا ہوا تھا کہ زبیدہ کے سینے میں کھدبد کرتے لفظ گونگے ہو گئے۔ زبان پر کانٹے سے اُگنے لگے۔

چند منٹ کی خاموشی چھائی رہی۔ پھر مرغے نے دوسری بانگ دی، تو زبیدہ بولی ''پر تو اس کا کرے گی کیا؟''

صغریٰ نے جلتی لکڑیوں پہ پتیلا رکھا اور باہوں کے گوکھڑو گول گول گھماتے بولی ''پانی گرم کروں گی، سلطان احمد کے لیے روٹی ڈالوں گی اور اماں کی چلم میں انگارے بھروں گی۔''

یہ سن کر زبیدہ کو اپنا آپ بے پیندے لوٹے کی طرح لگا جس کا سارا پانی ایک ہی ہلے میں مٹی سے جا ملا ہو۔ وہ غیرمحسوس طریقے سے پیچھے مڑی اور اندر جا سر سے پاؤں تک چادر لپیٹ کر لیٹ رہی۔

اماں نے اُسے گربہ پا لوٹتے اور اوندھے منہ چارپائی پہ پڑتے دیکھا، تو اچنبھے سے بولی ''کیا ہے ری زبیدہ، نور پیر کے وقت کھاٹ پہ چڑھ گئی، کوئی بات ہے؟''

زبیدہ کی ساکت چادر میں ایک سلوٹ تک نہ ابھری۔

اماں کھنکھار کے اُٹھ بیٹھی۔ نیچے دھری چپلیاں پاؤں سے تلاش کرتے ہوئے بولی ''بولتی کیوں نہیں؟ کہیں پسلی کا درد تو نہیں اُبھر آیا؟''

زبیدہ نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ اماں کھڑی ہو گئی۔ وہ پرانے وقت کی کھری عورت تھی۔ بیچ صحن کے کھڑے ہو کر سینہ ٹھونک کہتی تھی، دن چڑھے تک سونا شریفوں کی بہو بیٹیوں کا کام نہیں۔ پھر دزدیدہ نظروں سے اپنے دیور کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے اونچی آواز میں بولتی:

''یہ تو اوتروں نکھتروں کی نشانی ہے۔''

زبیدہ کی شہر سے بیاہ کر آنے والی دیورانی غیر برادری سے تھی۔ چہرہ رنگتی اور بھنوؤں کے بال نوچتی تھی۔ جب زبیدہ ناشتے کے جھوٹے برتن دھونے نل تلے رکھتی، تو وہ جمائیاں لیتی منہ پہ ہاتھ رکھے کمرے سے نکلتی۔ اونا پونا منہ دھوتی اور ٹرے میں ناشتا سجا پھر کمرے میں گھس جاتی۔ دو چار منٹ پر محیط اس کارروائی پہ اماں لاکھ فضیحتہ کرتی سر، منہ پیٹتی۔ ناک پہ انگلی دھر کے آس پاس والیوں سے دل کے پھپھولے پھوڑتی۔ مگر زبیدہ کو یک گونہ سکون کا احساس ہوتا۔ وہ خود کو ایسی سلطنت کا بے تاج بادشاہ سمجھنے لگی تھی جس کی منہ زور رعایا بادشاہ کے لیے قابلِ اعتنا نہیں ہو۔ وہ داہنے کان کی بات بائیں سے نکال دیتی۔ دھائیں دھائیں برتن مانجھتی انھیں آئینہ کرتی رہتی۔

دوپہر تک یہ خبر سارے گھر میں پھیل کے باہر نکل گئی کہ سلطان احمد کی بیوی نے چولھا چوکا سنبھال، زبیدہ کو کھڈے لائن لگا دیا ہے۔ آج سے ہانڈی روٹی پہ اس کا

جیتی جاگتی زندگی

ساس، بہو اور بیٹی کی

سلطنت

فرسودہ خاندانی روایات کی بھینٹ چڑھنے والی معصوم دوشیزہ کا المناک فسانہ، بچاری جن سہاروں پر تکیہ کیے بیٹھی تھی، وہ بھی پتوں کے مانند بکھر گئے

نجمہ ثاقب

جاتی؟ میں تو ہمیشہ اُس کا منتظر رہا تھا۔ ہاں زبان پر کبھی ایک لفظ بھی ایسا نہ لایا جو میرے مدعا کو اس پر منکشف کر دیتا۔ میرے لیے ایسا کرنا ہمیشہ ناممکن ہی رہا۔ اس لیے نہیں کہ میں بزدل ہوں۔ ہوسکتا ہے، یہ صحیح بھی ہو۔ میں نے اپنے اوپر اخلاق اور ضبط کی چادر جو اوڑھ رکھی ہے۔ میں یہی سمجھتا رہا کہ ابھی وہ لمحہ نہیں آیا۔ ابھی وہ منزل دور ہے۔

آخر وہ منزل آ ہی گئی ہے! میں نے فوراً سوچ لیا۔ آدمی لمحوں کا قیدی ہوتا ہے، جذباتی لمحوں کا! ایسے لمحوں میں وہ بڑے بڑے فیصلے کر لیتا ہے، جو عام طور پر عقل اور دلیل سے کام لینے پر نہیں کیے جا سکتے!

میں نے فیصلہ کر لیا، اب اس سے دل کی بات کہہ ہی دوں تو اچھا ہے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا میز پر جھکا ہوا سر اوپر اُٹھایا اور کہا ''میری طرف دیکھیے تو! مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے کیونکہ میں آپ کے دکھوں کا خود کو بھی بڑی حد تک ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ لوگوں نے اگر آپ کو غلط سمجھا ہے تو میری ہی وجہ سے! میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ آپ کے پتی، سسر اور سب گھر والے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ آپ بھی چاہیں تو مجھے قصور وار ٹھہرا سکتی ہیں۔ لیکن اس کا حل صرف یہی ہے۔ آپ اب اپنا گھر بار چھوڑ کر میرے پاس آ جائیں۔ میرے گھر میں، جو طویل عرصے سے آپ ہی کی راہ دیکھ رہا ہے! میں سچ مچ آپ سے محبّت کرتا ہوں۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ مجھ پر یقین کیجیے۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ میری طرف دیکھیے تو!''

وہ حیران سی بیٹھی رہ گئی۔ جیسے یقین نہ آیا ہو کہ میں نے جو کچھ اس کے سامنے کہہ دیا، کیا وہ واقعی میری ہی زبان سے نکلا ہے......؟

وہ دیر تک میری طرف اسی طرح دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو بھرے ہوئے تھے۔ کچھ قطرے گالوں پر بھی چمک رہے تھے۔ ڈھیلے ڈھیلے بال اس کی گردن کے پیچھے بہت بڑا پھن سا بنا کر پھسل گئے تھے۔ ہم ایک دوسرے کو فریب نہیں دے رہے تھے، میں واقعی اسے چاہتا تھا۔ وہ سچ مچ بہت دکھی تھی۔ اسے میری ہی ضرورت تھی، میرے ہی جیسے محبّت کرنے والے آدمی کی!

ہم ایک دوسرے کو فریب نہیں دے رہے تھے، میں واقعی اسے چاہتا تھا۔ وہ سچ مچ بہت دکھی تھی۔ اسے میری ہی ضرورت تھی، میرے ہی جیسے محبّت کرنے والے آدمی کی!

اسے یقین دلانے کے لیے میں مسکرایا، تو اس نے یکایک آنسو پونچھ ڈالے۔ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی، ایک لفظ بھی کہے بغیر باہر جانے کے لیے تیار۔ میں نے پوچھا ''چل دیں؟''

''ہاں۔'' میری طرف نہ دیکھتے ہوئے اس نے رندھے گلے سے جواب دیا۔

''کہاں؟''

''اپنے گھر!''......

''لیکن وہاں تو سب پاگل بستے ہیں! آپ کو بہت تکلیف پہنچاتے ہیں نا!''

''پھر بھی انھیں میری بڑی ضرورت ہے۔ میں انھیں چھوڑ کر چلی آئی تو سب اچانک حیران رہ جائیں گے۔ دکھ سے بالکل گونگے بن جائیں گے۔ پھر ایک ایک کر کے مرنے لگیں گے۔ میں جانتی ہوں، وہ واقعی اتنے کمزور ہیں لیکن میں نہیں چاہتی کہ وہ میری وجہ سے مر جائیں! یہ عذاب تو میں کبھی برداشت نہ کر سکوں گی! بھلے ہی ان کی گالیاں سنتے سنتے میری اپنی جان نکل جائے!''

یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گئی!!

باتوں میں ہرگز نہ آئیں گے۔ سدھا تو سمجھ دار ہی نکلی لیکن گیلانی بہت کمزور ثابت ہوا۔ اسی وجہ سے میں نے اُن کے یہاں آنا جانا بہت کم کر دیا۔ وہ اب قریب قریب بالکل ہی ختم ہو چکا تھا۔

کافی ختم کر کے اُس نے پوچھا ''کیا سوچ رہے ہیں؟''

میں نے جواب دیا ''آپ ہی کی الجھنوں کے بارے میں۔''

بولی ''لیکن اس وقت میں جس طرح کی الجھن میں گرفتار ہوں' اُس کا آپ کو اندازہ نہیں ہوسکتا!''

میری سمجھ میں واقعی کچھ نہ آ سکا کہ وہ کہنا کیا چاہتی ہے؟ پلک جھپکائے بغیر میں اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

اُس نے کہا ''میری دو نندیں ہیں۔ ایک تو جنم جنم سے کم عقل ہے۔ جو بڑی ہے آپ تو جانتے ہیں' اُس کی شادی نہ ہوسکی۔ لیکن اُسے گھر کے ہر معاملے میں فوقیت حاصل ہے۔ جو وہ کہے گی' وہی بات مانی جائے گی۔ میرے سسر اور ساس اُسے دکھی آتما سمجھ کر اُس کا لحاظ کرتے ہیں۔ اُسے خوش رکھنے کے لیے وہ غلط سے غلط فیصلہ کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ چھوٹی نند' نیلما تو آفت کی پرکالہ ہے۔ اُس کے لیے رشتہ ڈھونڈنے میں میرے تلوے تک گھس چکے۔ کیونکہ شادی سے پہلے ہی کئی جگہ رومان لڑا چکی۔

''شادی کے دو ہی مہینے بعد وہ اپنے پتی سے لڑ جھگڑ کر گھر آ بیٹھی۔ کہتی ہے مجھے اُس سے ڈر لگتا ہے۔ بیچارا راجیش! اتنا سلجھا ہوا' شریف اور خوبصورت لڑکا ہے کہ کیا بتاؤں؟ میں نے کیا کیا نہ چھپا کر یہ رشتہ طے کرایا تھا۔ بعد میں اسے سب کچھ معلوم ہو گیا لیکن اُس نے مجھ سے کبھی شکایت نہ کی۔ وہ اب بھی چاہتا ہے' نیلما کسی طرح اُس کے گھر واپس چلی آئے۔ اُس کے ڈر کو بے بنیاد اور وہم بتاتا ہے۔ الٹا اُس کی اپنی جان عذاب میں پھنسی ہوئی ہے۔''

میں چپ چاپ سنتا رہا۔ مجھے یقین تھا ابھی وہ اور بہت کچھ کہے گی۔ میں نے جیسے ایک پکے ہوئے پھوڑے میں نشتر چبھو دیا تھا۔

وہ بول رہی تھی ''وہی لڑکی اب میرے منہ پر آپ کا نام لے کر مجھے الزام دیتی ہے۔ میں نے اسے اُس کے ماضی کی غلطیاں یاد دلا کر راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ صرف اس خیال سے کہ اُس کی زندگی سنور جائے' وہ اپنے گھر لوٹ جائے۔ اس سے بڑا ظلم آج کل یہ ہو رہا ہے کہ میرے سسر جو اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں' دن رات مجھے کوستے رہتے ہیں۔ آپ کا اور میرا نام لے لے کر شور مچاتے ہیں جسے سب لوگ سنتے ہیں۔ پورے محلے کے لوگ! مجھ پر ہنستے اور نظروں سے میرا پیچھا کرنے لگتے ہیں۔ کہاں جاتی ہوں؟ کہاں بیٹھتی ہوں؟ کس کس کے ساتھ بات کرتی ہوں؟''

یہ کہتے کہتے وہ رو پڑی اور میز پر سر ڈال دیا۔ کچھ دیر بعد پھر بولی ''آپ تو جانتے ہیں، میں آپ کے پاس اس خیال سے کبھی نہ آئی۔ میری نیت میں کوئی فتور ہوتا تو میں اسی زمانے میں آپ کے ساتھ نہ ہو لیتی جب ہم ساتھ دورہ کیا کرتے تھے! ہم نے تو اس طرح کبھی نہ سوچا تھا! نہ میں نے نہ آپ ہی نے!''

میرے بارے میں اُس کا خیال کچھ غلط ہی تھا۔ میں اکثر اس کے بارے میں سوچتا کہ کاش وہ میرے دل کی آواز کبھی سن سکے' میرے اندر دبی ہوئی آواز کو سمجھ جائے۔ میں اُس کے بارے میں آخر اس طرح کیوں نہ سوچتا! جو عورت اتنی خوبصورت ہے! اتنی پڑھی لکھی ہے! میرے قریب ہے اور میری تعریف کرتی ہے' وہ میری کیوں نہیں بن

ہے؟ خاص طور پر عورت کے معاملے میں۔"
وہ چمک کر بولی "اس میں حرج ہی کیا ہے؟" کوئی اگر ایسی تعریف کے قابل ہے تو کیا اُس کے بارے میں کچھ بھی نہ کہا جائے؟"
"لیکن اپنا شوہر اگر اتنا فراخ دل نہ ہو تو ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ وہ غلط فہمی میں پڑ سکتا ہے!"
"غلط فہمی کیسی؟" وہ پھر چمک اُٹھی۔
مجھے اُس کی معصومیت پر ہنسی آ گئی۔ کہا "بھئی وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ میری بیوی میرے بجائے دوسرے آدمی کو چاہنے لگی ہے۔ جبھی وہ اس کی تعریف کرتی ہے!"
"بھلے ہی اپنے شوہر میں ویسے گن ہرگز نہ ہوں! یہی نا! یہ سن کر تو اسے اپنے آپ کو بدلنا چاہیے۔ اپنے اندر ویسی ہی خصوصیات پیدا کرنی چاہئیں!"
مجھے یاد آیا' وہ گیلانی کو اکثر نکھٹّو اور بور کہا کرتی ہے۔ جب کہ وہ نکھٹّو ہرگز نہ تھا۔ ہر مہینے اچھی خاصی رقم کما کر لے ہی آتا تھا۔ ہاں خوش مزاج وہ یقیناً نہ تھا اور حد درجہ سیاسی ذہن کا مالک۔ ایسے معاملات میں بہت سنجیدہ ہو کر بولتا۔ اختلاف کرنے پر لڑنے پر اُتر آتا۔ چاہتا تھا کہ دوسرے بھی اُس کے ساتھ اتفاق کریں۔ اسی کے نقطہ نظر کو قبول کر لیں۔ اس طرح کی بحثوں کے بعد ہمارے درمیان اکثر تناؤ پیدا ہو جاتا۔
میں نے کہا "یہ کسی حد تک ٹھیک ہے۔ لیکن وہ آپ سے بے اندازہ محبّت کرتے ہیں' اس سے تو آپ انکار نہیں کر سکتیں!"
مسز سدھا گیلانی نے جواب دیا "لیکن عورت مرد کے درمیان صرف محبّت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی! اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے! کیا یہ سب بھی عورت ہی کو سکھانا چاہیے؟ اور زندگی بھر سکھاتے ہی رہنا چاہیے؟"
میں نے ہنستے ہوئے کہا "آپ کی کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ پہلے اسے پی لیجیے!"
وہ جلدی جلدی کافی پینے لگی۔
جو کچھ اُس نے کہا وہ سو فیصدی غلط نہ تھا۔ اُس نے مجھ سے پہلے بھی بارہا گیلانی کی شکایت کی تھی۔ جب وہ بھارت سیوک سماج میں تھی' میں اکثر اُن کے دفتروں کی جانچ پڑتال کرنے جا پہنچتا تھا۔ اُس زمانے میں اُن کے سارے فنڈ میں ہی منظور کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک بے حد دلچسپ باتونی عورت رہی ہے اور آزاد خیال بھی۔ میرے ساتھ دور دراز کے دیہات تک ہو آتی۔ جتنی دیر ساتھ رہتا' اُس کا ایک لمحہ بھی غیر دلچسپ نہ ہوتا۔

> آدمی لمحوں کا قیدی ہوتا ہے' جذباتی لمحوں کا! ایسے لمحوں میں وہ بڑے بڑے فیصلے کر لیتا ہے' جو عام طور پر عقل اور دلیل سے کام لینے پر نہیں کیے جا سکتے!

حساب کتاب میں گڑبڑ ہو جانے پر میں کبھی اُس کے خلاف رپورٹ بھی دے دیتا تو وہ بُرا نہ مانتی تھی' اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو فوراً قبول کر لیتی۔ اُس کے نیچے کام کرنے والا عملہ ہی بہت بے ایمان تھا' انھیں قانون کے حوالے کر دینے میں اُس نے کبھی تامل نہ کیا تھا۔ وہی لوگ اتنی بڑی قومی تنظیم کی ناکامی کے ذمہ دار تھے۔
اسی زمانے میں میرے کانوں میں کچھ افواہیں پہنچنے لگیں۔ لوگ میرے اور اُس کے بارے میں طرح طرح کے اسکینڈل گھڑنے لگے۔ اُس کے بھی وہی لوگ ذمہ دار تھے جنھیں ہم روپیہ خرد برد کرنے سے روک دیتے۔ وزرا تک کے پاس میرے خلاف شکایتیں بھجوائی گئیں۔ ایک بار تو اسمبلی میں بھی سوال کر دیا گیا۔ لیکن مجھے مسز گیلانی اور اُس کے شوہر پر پورا بھروسہ تھا۔ مجھے یقین تھا' وہ لوگوں کی

''گیلانی صاحب اب بھی ٹریکٹرز آرگنائزیشن میں ہیں نا؟''

''جی۔'' اُس نے مختصر سا جواب دیا اور میری طرف دیکھا۔

''اور آپ؟ کیا ابھی تک بی ایس ایس (بھارت سیوک سماج) میں ہیں؟''

وہ بہت عرصے سے ملی نہ تھی۔ بی ایس ایس کا تجربہ ناکام ہو چکا تھا۔ دراصل پنڈت نہرو کے زمانے ہی میں ایسا نظر آنے لگا تھا۔ اسی لیے خیال گزرا' وہ اُس سے الگ ہو چکی ہوگی۔

بولی ''میرے لیے گھر پر ہی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ اُس سے تو میں نے پچھلے ہی سال استعفیٰ دے دیا تھا۔

اتنے میں کافی آ گئی۔ میں نے الماری میں سے بسکٹوں کا ڈبا نکلوا کر اُس کے سامنے رکھ دیا اور کہا...... ''گھر پر کون کون سی ذمہ داریاں ہیں آپ کی؟''

جس عورت کے ایک بھی بچہ نہ ہو' وہ ذمہ داریوں کا رونا روئے تو کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے! میں نے اس کی طرف بہت غور سے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر کون کون سے تاثرات اُبھرتے ہیں! وہ مجھ سے کچھ چھپاتی ہے یا سب سچ سچ کہہ ڈالے گی!

خلاف توقع اُس کے چہرے پر کرب سا اُبھر آیا۔ آنکھیں بھی چھلچھلا اُٹھیں۔ ہونٹوں پر ایسی کپکپاہٹ نظر آئی جس سے صاف معلوم ہوا کہ کچھ کہنے کے لیے وہ الفاظ تلاش کر رہی ہے۔ پھر جیسے وہ ہار سی گئی۔ لیکن آنکھوں میں شکایتی کیفیت لا کر بولی ''یہ سب آپ ہی کی وجہ سے ہے! جو کچھ مجھ پر بیت رہی ہے' جو کچھ میں محسوس کرتی ہوں' جو کچھ دوسرے اپنے اپنے طور پر سوچتے رہتے ہیں' اُس کے آپ ہی ذمہ دار ہیں!''

آخری الفاظ پر پہنچتے پہنچتے اُس کا لہجہ زیادہ مضبوط ہو گیا اور کچھ تیز بھی! مجھے بہت حیرانی ہوئی۔ اُس کے ساتھ فوراً ہی اتفاق کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ میں نے خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا۔

میری خاموشی توڑنے کے لیے اُس نے کہا ''آپ نے جب سے ہمارے گھر آنا چھوڑا ہے' لوگوں کو جیسے زبان مل گئی ہے۔ وہ طرح طرح سے مجھے طعنے دیتے ہیں۔ کبھی اشاروں میں' کبھی صاف صاف!''

''کون سے لوگ؟'' مجھے پوچھنا پڑا۔

کچھ دیر تک اُس نے جواب دینے سے احتراز کیا۔ میری طرف گہری نظر سے دیکھتی رہی۔ جیسے پوچھ رہی ہو۔ کیا یہ بھی بتانا پڑے گا؟''

پھر میں نے خود ہی پوچھ لیا ''کیا گیلانی صاحب کچھ کہتے ہیں؟''

''وہ بھی اور گھر کے دوسرے لوگ بھی!''

''آخر کیا کہتے ہیں وہ؟ لیکن انھیں کہنے کا حق ہی کیا ہے؟ میرے اور آپ کے درمیان کبھی کوئی ایسی بات ہی نہ ہوئی!''

یہ کہہ کر میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ ایک ہی لمحے میں گزشتہ چھے سات سال کے طویل فاصلے پر ایک بے چین پنچھی کی طرح پنکھ پھیلائے اُڑتا پھرا۔ پھر جیسے اچانک پر سمیٹ کر ایک جگہ بیٹھتے ہوئے بولا ''ہو سکتا ہے اس میں آپ ہی کا قصور زیادہ ہو! میں جانتا ہوں آپ دوسروں کی تعریف کرنے میں کافی دریا دل ہیں۔ اسے میں آپ کا غیر محتاط ہونا ہی کہوں گا۔ آپ نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ اپنے شوہر کے سامنے دوسرے مرد کی کبھی تعریف نہ کرنی چاہیے۔ مرد کی ذات عورتوں سے بھی زیادہ حاسد ہوتی

دوسرے ہی لمحے وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ لیکن اُسے دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ میری ہی ہم عمر (تیس سال) میری ہی طرح نظر کا چشمہ لگائے، لیکن بے حد دلکش عورت سر سے پاؤں تک بھیگی ہوئی تھی۔ میں نے کہا ''بلی اگر باہر سے بھیگی ہوئی اندر آئے تو یقین کر لینا چاہیے کہ واقعی بارش ہو رہی ہے!''

وہ اپنے بھیگے ہوئے بال اور کپڑے چھو کر مجسّم معذرت سی بنتی ہوئی بولی ''مسٹر آنند! میری معذرت قبول فرمائیے۔ مجھے اس حالت میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ لیکن میں جیسے ہی جی پی او سے نکلی، بادل ٹوٹ کر برس پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمبخت میرا ہی منتظر ہے۔ بچ نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہ رہ گیا!''

میں نے ہنستے ہوئے کہا ''بادل تو اس لیے برسا کہ آپ نے کئی مہینوں کے بعد میرے دفتر کا رخ کیا! لیکن میں دس منٹ میں اپنے وزیر کے بنگلے پر نہ پہنچا تو اُس کے غصے کا بادل مجھ پر بھی برس سکتا ہے! آپ کو تھوڑی دیر بیٹھنا پڑے گا۔ جب تک کمرا اندر سے بند کر کے کپڑے سکھا لیجیے۔ ہیٹر چل رہا ہے۔ چپراسی سے میں کہہ دیتا ہوں، آپ کو کافی بھی لا کر دے جائے! میرے لوٹنے تک جائیے گا نہیں!''

اُس نے مسکرا کر مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن اُس کی آنکھیں یہ بھی کہہ رہی تھیں...... تم نے میرے ساتھ ہمیشہ یہی سلوک کیا ہے!''

وزیر کے ہاں پہنچتے ہی مجھے مطلع کیا گیا کہ انھیں وزیرِاعلیٰ نے طلب کر لیا تھا۔ اس لیے وہ اپنے پی اے کو ہدایت کر گئے تھے کہ مجھ سے متعلّقہ فائل لے کر رکھ لے۔ میں دل ہی دل میں بھگوان کا شکر بجا لایا۔ جیپ بھگاتا ہوا اپنے دفتر میں واپس آ گیا۔ لیکن تب بھی آنے جانے میں تو آدھ گھنٹا لگ ہی گیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ دستک دینے پر ایک آدھ منٹ میں کھل گیا۔

مسز سدھا گیلانی اپنی بھیگی ساڑی سکھا کر پھر پہن چکی تھی۔ سر کے بال البتہ کھلے ہوئے تھے۔ لمبے لمبے لہراتے ہوئے بال جنھیں اُس نے تولیہ اسٹینڈ پر پڑے ہوئے میرے تولیے سے جھٹک لیا تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنے بالوں کو ربن سے باندھ دیا۔

میں نے پوچھا ''کافی پی؟''

بولی ''ایک پیالی پی چکی ہوں۔ ایک اور پیوں گی آپ کے ساتھ!''

اُس کی بے تکلّفی کو میں نے پسند کیا۔ ہمیشہ سے پسند جو کرتا آیا تھا۔ فائلوں سے بھری ہوئی اپنی چوڑی میز کے سامنے بیٹھ کر گھنٹی بجائی۔ چپراسی نمودار ہو گیا، تو اُس سے کہا ''دو پیالے کافی اور لے آؤ۔ خوب گرم ہوں!''

پھر سدھا کی طرف دیکھ کر پوچھا ''آج مجھ پر کیسے مہربانی کی؟''

اُس نے میز پر سے ایک پیپر ویٹ اُٹھا لیا۔ اسے گھماتے ہوئے بولی ''گیلانی صاحب کو ٹرنک کال کرنے آئی تھی۔''

''خیریت تو ہے؟ کہاں گئے ہوئے ہیں وہ؟''

''خیریت کہاں ہے! اُن کے پتا جی کو کئی ہفتوں سے دورہ پڑ رہا ہے۔ کل سے تو ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اسی لیے انھیں ہر دوئی ہی واپس آ جانے کے لیے کہا ہے۔''

مجھے یاد آیا، مسز سدھا گیلانی کے سسر کو کچھ سال پہلے بھی اسی طرح کا دورہ پڑا تھا۔ تب اُنھیں پاگل خانے میں بھی داخل کرایا گیا تھا۔ سدھا اور اُس کے شوہر میرا ہی خط لے کر انتظامیہ کے پاس گئے تھے۔

ہندی کہانی

نسوانی فطرت کا شاہکار رخ تو دیکھیے

پاگل پریوار

اہل خانہ سے دق ایک عورت کا فسانہ، وہ خوشیوں بھری زندگی کی نوید سننے پہ بھی ستم پروروں کو چھوڑ نہ سکی

رام لال

میرے چپراسی نے ٹھیک اُس وقت میرے سامنے ایک چٹ لا کر رکھ دی جب میں ایک بہت ہی ضروری فائل لے کر وزیر صاحب کے پاس جانے والا تھا۔ انھوں نے مجھے فون کر کے فائل منگوائی تھی۔ اس وقت کسی بھی مہمان سے ملنا ناممکن تھا۔ اسی لیے چپراسی پر مجھے تھوڑا سا غصہ بھی آیا۔ وہ ایسی چٹ لے کر آیا ہی کیوں؟

لیکن چٹ پر نظر پڑتے ہی میں چونک کر کھڑا ہو گیا۔ جلدی جلدی پنسل سے اُس چٹ پر خانہ پری کی گئی تھی۔ میں وزیر کے پاس لے جانے والی فائل لیے کھڑا رہا اور چپراسی سے کہا ''بلا لاؤ انھیں۔''

اور آمادہ شرارت رہتے ہیں۔ وہ اس قسم کے بیہودہ سوال کرنے سے نہیں چوکتے کہ جناب والا! آپ نے جو مزدوروں کی تنخواہ بڑھانے کا وعدہ کیا ہے تو اس پر کیسے عمل ہوگا؟ ایسے وقت چوکنا رہے۔ بغلوں کی طرف نہ دیکھے، سر نہ کھجائے، بلکہ سر اونچا رکھے۔ ذرا سا مسکرائے، سنجیدہ صورت بنائے، اخبار والے کو گھور کر دیکھے۔ چشمہ اتارے اور پھر کہے:

''سنو، ہم ذمہ دار لوگ ہیں۔ ہر مسئلے کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد منہ کھولتے ہیں۔ وقت آنے پر ہم تفصیلات بتائیں گے اور عوام کو اس راز سے آگاہ کریں گے کہ ہماری سوچ اور ہمارا منصوبہ کیا ہے۔ ابھی ہم حزب اختلاف کو کیوں اس اہم بات سے آگاہ کریں؟'' جواب گول مول ہونا چاہیے جس سے کوئی پکڑ ممکن نہ ہو۔ یہ نفسیاتی نکتہ ہے تاکہ وقت آنے کا انتظار بے چینی سے کیا جائے۔ لیکن وہ وقت کبھی نہیں آتا جب راز افشا کیے جائیں، یہاں تک کہ خود افشا کنندہ کا وقت آجاتا ہے۔

ہم نے مختصراً کتاب کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ ہر سبق ذہن نشین کرانے کے لیے اس میں تصویریں بھی ہیں۔ مثلاً تقریر کرتے ہوئے مختلف پوز ہیں، ہاتھ اٹھاتے، تھپڑ دکھاتے، جوتے کی طرف اشارہ کرتے، منہ اتنا بھینچے ہوئے کہ نچڑا لیموں لگتا ہے اور اتنا کھولے ہوئے کہ کوا تک نظر آرہا ہے۔ حاکم کے سامنے بیٹھنے کا انداز، پٹی ہوئی مسکراہٹ، ہاتھ باندھے اور غریب غربا کے سامنے ہمالہ کی طرح بلند بالا کھڑے ہوئے۔ یہ تھا حصہ اول۔

حصہ دوم میں بتلایا گیا ہے کہ مخالفوں کی پگڑی اچھالنے، دُم مروڑنے، سر پھوڑنے، ہاتھ پاؤں توڑنے کے لیے غنڈے پالنے کا سلسلہ کیسے قائم کیا جاتا ہے۔ مختلف قسم کے پرمٹ، الاٹ منٹ، بیرون ملک دورے کرنے کے گر کیا ہیں۔ جب کرسی اقتدار پر براجمان ہو جائے تو پائے کا کیا انتظام کرے، بیوروکریسی کی جیب کی سیون میں کس طرح گھسے، فوجی پاؤں کا موزہ بن کر بوٹ میں کس طرح محفوظ ہو تاکہ اس کا اور جملہ اعزا، ناتی پوتوں کا مستقبل بھی محفوظ ہو جائے۔ نیز یہ کہ نکاح ثانی کس سے اور کس بہانے سے کرے۔ مختلف سڑکیں، چوک، بازار، پلازہ وغیرہ کس طرح اس کے نام کی یاد دلائیں تاکہ آخر کار پیشہ سیاست کی کامیابی کے ذریعے وہ شیر بیشہ سیاست کے نام سے یاد کیا جائے۔

مجھے اس نادر اور بیش قیمت کتاب سے جو فائدہ پہنچا وہ محتاج بیان نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ خدا کے فضل سے میں ایک کامیاب سیاست گر بن چکا۔ میں نے نوٹس لینے کے بعد اصل مسودہ تلف کر دیا تاکہ کمبخت حزب مخالف کے لیڈر کے ہاتھ نہ لگے اور وہ مقابلے پر نہ آجائے، اس لیے کہ آخر وہ بھی تو جھونپڑی میں رہتا اور محلوں کے خواب دیکھتا ہے۔

علم کا راستہ

ارسطو سکندر اعظم کو پڑھانے لگا، سکندر اعظم جو شہزادہ تھا، اکتا گیا۔ اس نے ارسطو سے پوچھا: ''علم کے حصول کا کوئی راستہ آسان نہیں؟''

''ہمارے ملک میں دو قسم کے راستے ہیں۔'' ارسطو نے کہا۔ ''ایک قسم کچے اور دشوار راستوں کی ہے جن پر کسان، مزدور اور عام لوگ چلتے ہیں۔ راستوں کی دوسری قسم شاہی خاندان کے لیے مخصوص ہے۔ یہ راستے پکے اور خوبصورت ہیں۔ لیکن علم کی منزل تک ایک ہی راستہ جاتا ہے جس پر شاہ و گدا اکٹھا چلتے ہیں۔''

میں وطن اور ہی کچھ ہے"۔ اگر لبرل اور ساڑی پوش خواتین کا جلسہ ہو تو "وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ"، وغیرہ استعمال کرو۔ لیکن خواتین از کار رفتہ، عمر رسیدہ ہیں اور برقعے اوڑھے بیٹھی ہیں تو ایسے ابیات استعمال کرو جیسے "بہل اے دختر ک ایں دلبری را" یا "تہی آغوش زن" کا ذکر کرو۔ ان شاء اللہ دعائیں لوگے اور جگ جگ جیو گے۔

محولہ بالا اسباق سے معلوم ہوا کہ سیاست گری کے لیے کن تیاریوں کی ضرورت ہے۔ ہم آگے چل کر ان کی مشق کرائیں گے۔ جب یہ تیاریاں مکمل ہو جائیں تو مبتدی حسب ذیل اصول ذہن نشین کر لے۔

پہلا اصول یہ ہے کہ سیاست گر اپنے جلسے میں لوگوں کے جذبات ابھارے لیکن خود کبھی جذبات کا شکار نہ ہو۔ یہ نہیں کہ آپ غریبوں کا ذکر کریں، کسانوں کی تکلیفیں بیان کریں اور فرط ہمدردی سے خود بھی انھی میں شامل ہونے کی غلطی کر بیٹھیں۔ یاد رکھو کہ سیاست گری لفظی بازی گری ہے اور کچھ نہیں...... آج کل سیاست کا محور دو چیزیں ہیں: زمین اور عوام۔ اگر قومی سیاست اور لیڈری سے رغبت ہے تو سیاست گر ملک کے ہر حصے کو مقدس قرار دے۔ سوائے مخالف پارٹی والوں کے ہر ایک کو دل و جگر کا ٹکڑا بنا لے۔ اگر سیاست گر صوبائی یا علاقائی سیاست کا پرچارک ہے تو اس کی تہذیب و زبان کو قدیم ترین بتلائے۔ بلکہ موقع ملے تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ جنت سے نکلنے کے جب اماں حوا نے حضرت آدم سے ملاقات کی تو وہ اسی علاقائی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ بعد میں عبرانی، سریانی، عربی زبانیں اسی کی کوکھ سے پیدا ہوئیں۔

جمہوری دور میں سیاست کا سب سے بڑا جھنجھٹ یہ ہے کہ اس میں عوام کا بہت ذکر کرنا پڑتا ہے۔ سیاست گر کے لیے ضروری ہے کہ وہ عوام کا لفظ اپنی نوک زبان اور باقی پارٹیوں کو عوام دشمن گردانتے ہوئے جوتی کی نوک پر رکھے۔ لیکن ایک نصیحت گرہ میں باندھ لے کہ عوام کی ساری عمر خدمت کرتے رہنے کا وعدہ کرنا تو ضروری ہے، ان وعدوں کا وفا کرنا ضروری نہیں بلکہ خطرناک اور بڑی تکلیف دہ دردسری ہے۔ مبتدی یاد رکھے کہ معشوق اور سیاست گر کا کام صرف وعدہ کرنا ہے، انھیں وفا کرنا نہیں۔ لہٰذا وہ ہرگز اس چکر میں نہ پڑیں ورنہ ان کا بڑا عبرتناک حشر ہوگا۔

> **مبتدی یاد رکھے کہ معشوق اور سیاست گر کا کام صرف وعدہ کرنا ہے، انھیں وفا کرنا نہیں۔ لہٰذا وہ ہرگز اس چکر میں نہ پڑیں ورنہ ان کا بڑا عبرتناک حشر ہوگا۔**

سیاست گری کا مقصد عوام کی سیڑھی لگا کر بلند مرتبت خواص میں شامل ہونا ہے۔ اگر کسانوں میں تقریر کر رہا ہے تو وعدہ کرے کہ اقتدار میں آ کر لگان معاف کر دے گا۔ ہر کسان کو دو بھینسیں، ایک ٹریکٹر سو مرلے زمین دے گا، ہر کھیت میں نل لگوائے گا، یا کھیت کی مینڈھ کے پاس سے نہر گزارے گا لیکن زمینداری و جاگیرداری کو ختم کرنے کا ذکر گول کر جائے۔

رات کو جب وہ زمیندار یا ذیلدار کے یہاں پلاؤ، بھنا ہوا تیتر اور مرغ مسلم کھانے دعوت میں جائے تو اسے سمجھا دے کہ فی زمانہ یہ تقریر اقتدار کے لیے ضروری ہے۔ جب اقتدار ہاتھ آئے گا تو زمینداروں کے پوبارہ ہوں گے۔ بلکہ وہ خود بھی ہزار پانچ سو ایکڑ اپنے نام الاٹ کرائے گا اور ان کی برادری میں شامل ہو جائے گا۔

مبتدی کو یاد رکھنا چاہیے کہ اخبار والے چالاک ہوتے

جیسا کہ مندرجہ بالا اسباق میں بتایا جا چکا، سیاست میں گلا کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ وجہ یہ کہ سیاست گر کو ہر وقت گلے سے کام لینا پڑتا ہے...... جلسوں میں تقریریں کرنے، ووٹروں سے ووٹ مانگنے، اہل غرض سے وعدے کرنے اور بلطایف الحیل ٹالنے، مخالفوں یعنی گناہ گاروں کو ڈانٹنے ڈپٹنے، جھاڑنے اور دھمکانے، دوزخ کی آگ کا کندہ بنانے اور حوروں کی خوبصورتی بیان کرنے، حاکم سے پرمٹ لینے اور پلاٹ الاٹ کرانے غرض ہر موقع کے لیے ایک اچھا گلا، جس میں سے ہارمونیم کی طرح مختلف قسم کے سُر حسب موقع برآمد کیے جا سکیں، بڑا ضروری ہے۔ ظاہر ہے، اسی ایک گلے سے کبھی چنگھاڑنا، دہاڑنا اور کبھی روغن قاز ملنے اور فاختہ کی نرم آواز نکالنے کے لیے استعمال کرنا پڑتا ہے۔

مبتدی یہ بات ذہن نشین کر لے کہ سیاست گر تقریر کرنے کے لیے دو چیزوں پر خصوصاً انحصار کرتا ہے: ایک اسلام، دوسرے اقبال۔

ہمارے ہاں ہر چند سال کے وقفے سے جمہوریت کا ذکر یا وظیفہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے مگر اسے ہم آگے بیان کریں گے۔ یاد رکھو کہ تم اسلام کے کام آؤ یا نہ آؤ، اسلام ہمیشہ تمھارے کام آتا ہے، خصوصاً سیاست گری کے پیشے میں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر تقریر میں مبتدی اسلام کا تکیہ کلام کے طور پر استعمال کرے۔ پیروں فقیروں کے دل پر اثر کرنے، حیرت میں ڈالنے والے اور نیندیں اڑا دینے والے کشف و کرامات کے افسانے اگر جلدی میں یاد نہ آئیں تو گھڑ لے۔ ذرا سی مہارت سے یہ کام آسان ہو جائے گا۔

چونکہ ہمارا معاشرہ ابتدائی دور میں ہے، بہتر یہ ہے کہ جاگیرداروں اور وڈیروں وغیرہ کے مظالم کے سلسلے میں اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت ہرگز نہ کرے۔ گول مول بات کرے اور بس اتنا کہہ کر آگے بڑھ جائے کہ اسلام نجی جائیداد کے خلاف نہیں ہے۔

اب دوسرے نکتے کی طرف آؤ، یعنی اقبال مرحوم بڑے کام کا شاعر گزرا ہے۔ سمجھ لو کہ وہ شاعری کا امرت دھارا تھا جو ہر قسم کے مرض کا علاج ہے۔ خواہ پلیٹ فارم مولویانہ ہو یا ملحدانہ، ہر جگہ اقبال ہی کام آتا ہے۔ مرحوم خود کہا کرتے تھے:

وہ اک مردِ تن آساں تھا، تن آسانوں کے کام آیا

جمہوری دور میں سیاست کا سب سے بڑا جھنجھٹ یہ ہے کہ اس میں عوام کا بہت ذکر کرنا پڑتا ہے۔ سیاست گر کے لیے ضروری ہے کہ وہ عوام کا لفظ اپنی نوک زبان اور باقی پارٹیوں کو عوام دشمن گردانتے ہوئے جوتی کی نوک پر رکھے۔

اقبال کے کچھ اشعار تو روزمرہ استعمال کے لیے ہیں۔ یہ بنیادی غذا یعنی اسٹیپل ڈائٹ ہے مثلاً ''عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی''، 'اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں'، یا ''تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر'، یا 'عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں'، یا 'عروق مردہ مشرق میں خون زندگی دوڑا'، یا 'خودی کو کر بلند اتنا' وغیرہ کافی ہیں۔

بعض اشعار نیشنلسٹ طبقے کو توپ دم کرنے کے لیے کامیابی سے استعمال ہو چکے، وہ بعض موقع پر سیاسی پلیٹ فارم سے آج بھی کارگر ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ''گفتار سیاست

"سانپ اور سیاست گر کی متعدد قسمیں ہیں مگر چند صفات مشترکہ ہیں اور سب قسموں میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً سانپ خواہ کالا ہو، کوڑیالا ہو، بھورا ہو، دھاری دار ہو، دو منھ کا ہو یا اڑنے والا، وہ ہمیشہ پھنکارتا، ڈستا، بین پر جھومتا اور خطرے کی بو پا کر بل میں گھس جاتا ہے۔

سیاست گر بھی قسم قسم کے ملیں گے: مسٹر، مولوی، مسٹر اور مولوی کا کراس، فرقے والا، یونین والا، دائیں بازو کا، دائیں سے دائیں کا، بائیں بازو کا، بیچ کی راس، بیچ سے دایاں، بیچ سے بایاں، بینگن ٹائپ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہر ایک دہاڑتا، اچھلتا، کودتا، بل کھاتا، ہوا سے لڑتا، ہاتھ، ڈنک اور ڈنڈی مارتا، اقتدار کی بین پر جھومتا اور خطرہ دیکھ کر زیر زمین چلا جاتا ہے۔ جس طرح قدرت نے سانپ کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کو "نیولا" بنایا، اسی طرح کرسی والوں نے سیاست گر کے پرخچے اڑانے کے لیے "لا" بنایا۔ جیسے ہر فرعو نے راموسیٰ، ہر سیاست گرے را عصا، موسوی نہیں وردی والا عصا۔

مبتدی کے لیے لازم ہے کہ وہ پہلے یہ طے کرے، کس قسم کی سیاست سے آغاز کرنا چاہتا ہے کہ اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ سب سے آسان تو مولویانہ سیاست ہے۔ لیکن سب سے کامیاب مرکب مسٹرانہ و مولویانہ ہے۔ اس میں زمین مسٹرانہ ہوتی ہے مگر اس پر مولویانہ ملمع، طغرے اور خطاطی کے نمونے بنائے جاتے ہیں جو کلب یا گھر جا کر اتارے جا سکتے ہیں۔

مبتدی یاد رکھے کہ سیاست گری میں گلا اور گردن کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ گلا پھاڑنا اور گردن بچانا پہلا سبق ہے۔ اس کی تفصیل یاد کر لو۔ روزانہ رات کو نمک اور پھٹکری کا غرارہ کرے، گلے پر گاؤ زبان سائیدہ جو شانیدہ لیپ کر مہوبے کے پان کا پتا باندھ کر سوئے۔ ڈاڑھ کے نیچے لونگ رکھے، غذا میں پرہیز کرے، یعنی بکری، مرغی، تیتر کا گوشت، کباب، پستہ و بادام شیریں، ہر قسم کے پھل، بالائی اور دوسری مقوی غذائیں زیر استعمال رہیں۔ ان شاء اللہ کچھ دن میں گلا ایسا خستہ کرارا ہو جائے گا کہ حسب ضرورت اور بہ لحاظ موقع شیر کی دہاڑ، ہاتھی کی چنگھاڑ، گھوڑے کی ہنہناہٹ، چڑیوں کی چہچہاہٹ، فاختہ کی کوکو، قمری کی حق سرہ، غرض جو چاہو اور جب چاہو اسی واحد حاضر گلے سے برآمد کر لو اور حسب منشا استعمال کرو۔

> پہلا اصول یہ ہے کہ سیاست گر اپنے جلسے میں لوگوں کے جذبات ابھارے، لیکن خود کبھی جذبات کا شکار نہ ہو۔ یہ نہیں کہ آپ غریبوں کا ذکر کریں، کسانوں کی تکلیفیں بیان کریں اور فرط ہمدردی سے خود بھی انھی میں شامل ہونے کی غلطی کر بیٹھیں۔

گلا فٹ ہو جانے کے بعد مبتدی لباس کی طرف توجہ دے۔ مولویانہ سیاست گری کے لیے سب جانتے ہیں کہ لمبا چغہ، موٹا عصا، کتری لبیں، نیچی ڈاڑھی، اونچا پاجامہ، منہ میں پان، آنکھیں سرمہ دان اس پیشے کا جزو لاینفک ہیں۔ لیکن عموماً سیاست کار کے لیے شلوار قمیص اور بنڈی بھی کافی ہے۔ جلسوں میں پشاوری چپل بھی خوب چلتی ہے۔ (نوٹ: کئی سال پہلے جناح کیپ اور شیروانی سیاست گر اور سیاست داں کی وردی تھی۔ جب سے قائداعظم نے پردہ فرمایا اور لوگوں نے ان کی رسموں کو پردے میں بٹھایا، وہ چالو نہیں ہیں۔ ہاں وزارت یا سفارت مل جائے تو لباس مطابق نوٹیفکیشن اسلامی جمہوریہ پاکستان استعمال کرے)

ناواں اور نام دونوں کی آرزو تھی۔ میرا ایک بچپن کا دوست ہے۔ ایک دن اس سے گفتگو ہوئی تو بڑی سنجیدہ صورت بنا کر رائے دی "برادرم! سیاست کا پیشہ اپنا لو، تمھارے تو وارے نیارے ہو جائیں گے اور یاروں کا بھی کام بن جائے گا۔"

میں نے کہا "یار تم نرے احمق ہو۔ سیاست اول تو پیشہ نہیں، دوسرے میرے پاس پیسہ نہیں، تیسرے سیاست کی تربیت نہیں لی اور چوتھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

جس پر وہ گویا ہوا "ارے میرے حبیب بدنصیب! اور کچھ ہو نہ ہو، تیرے گاؤدی ہونے میں شبہ نہیں۔ اول تو سیاست ایک پیشہ ہے، دوسرے اس میں بہت پیسہ ہے، تیسرے یہ واحد پیشہ ہے، جس کے لیے کوئی ڈگری، تربیت، کورس وغیرہ ضروری نہیں، صرف کار بہ کثرت کا معاملہ ہے۔ اس کے بھی گر ہوتے ہیں، وہ کوئی بھی سیاست گر بتلا دے گا۔ یاد رکھو میں نے "سیاست گر" کا لفظ استعمال کیا، سیاست داں نہیں کہا۔

وہ تو چرچل اور قائداعظم بھی تھے۔ تم ان کی لائین پر نہیں چل سکتے۔ تم سیاست گر بن جاؤ جیسے کاری گر، قلعی گر، کوزہ گر وغیرہ، اس میں تھیوری کم، تجربہ زیادہ چلتا ہے۔"

چناں چہ میں نے طے کر لیا کہ سیاست گری کے پیشے کو اپنالوں۔ اس کے گر معلوم کرنے کے لیے چند گرگ باراں دیدہ، پائے کرسی اقتدار چشیدہ لیڈر ان کرام سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ بعض کے پاس وقت نہ تھا، بعض دورے پر رہتے تھے، بعض امراض خبیثہ کا علاج کرانے لندن و امریکا گئے تھے۔ بعض نے چلمیں بھروائیں، بتایا کچھ نہیں۔ بعض نے سیکیورٹی کے پیش نظر ملنے سے ہی انکار کر دیا۔ بعض کے پاس پہنچ نہ ہو سکی اس لیے کہ انھوں نے کتے پال رکھے تھے، جو بھونکتے، بھنبھوڑتے اور مالک کے قریب نہ پھٹکنے دیتے۔ جان ضیق میں آ گئی۔

لیکن قدرت نے تو میرے مقدر میں محل، باغات اور پلاٹ لکھ دیے تھے لہٰذا ایک ریٹائرڈ معمر سیاسی مبصر سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ موصوف پچھلے چالیس برسوں میں بہت سے سیاستدانوں اور لیڈروں کو نمٹا اور اکثر کو دفنا چکے۔ انھوں نے اپنی جیب اور میرے مستقبل کی خاطر ایک پمفلٹ تیار کیا جس کے سرورق پر یہ تحریر تھی:

مکمّل سیاست ماسٹر باتصویر، جلد اول یعنی ہدایت نامہ سیاست گراں۔ سیاست گری کے آسان اور آزمودہ نسخے، طریقے اور پینترے، چالیس سالہ تجربوں کا نچوڑ، مبتدیوں اور کہنہ مشقوں کے لیے یکساں مفید...... آزمائش شرط ہے۔ فائدہ نہ ہونے پر دام واپس (نوٹ: دس جلدیں خریدنے والے کو مکمّل مرغی خانہ باتصویر، ہدایت نامہ خاوند معہ خفیہ لفافہ اور ہارمونیم ماسٹر مفت۔ تمام پڑھنے والے مصنّف کو دعائے خیر سے یاد کریں۔)

> سیاست واحد ایسا پیشہ ہے جس کے لیے ڈگری، تربیت، کورس وغیرہ ضروری نہیں۔

پمفلٹ کیا ہے اکسیر ہے، اسم اعظم ہے، ۱۰۰ سالہ سنیاسی بابا کے تجربات کا نچوڑ ہے جس سے محبوب باؤلا ہو کر قدموں میں آ پڑے۔ جج اندھا ہو کر جھوٹا مقدمہ جتا دے، ممتحن نمبر دیتے وقت ایک کی جگہ سو لکھ جائے، لڑاکا بیوی روٹھ کر میکے چلی جائے اور اچھا خاصا لڑاکا میاں بے دام کا غلام بن جائے...... آپ بھی اس نادر رسالے کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

"مکمّل سیاست ماسٹر" کے مصنّف تمہید میں لکھتے ہیں

۴۰ سالہ سیاسی بابا کے تجربوں کا نچوڑ

ہدایت نامہ سیاست گراں

جسے پڑھ کر نامی گرامی بیروزگار، چور اُچکے اور فقیر کامیاب سیاست گر بن گئے......آزمائش شرط ہے

مختار زمن

نمبر

کم تھے اس لیے میڈیکل میں داخلہ نہیں ملا۔ مجبوراً قانون کی ڈگری لی۔ وکالت نہیں چلی تو اخباروں میں ملازمت کے لیے چکر لگائے۔ شاید ہمارا جدید طرز مالکان اخبار کو پسند نہ آیا چناں چہ یہ درازہ بھی بند پایا۔ دست غیبی والے محکمات مثلاً پولیس اور کسٹم والے خود ساری گھاس کھا گئے تھے کہ ہم جیسے کارآمد شخص کو ذرا سی بھی نہ ڈالی۔ اسکول ٹیچری وغیرہ خود ہمیں پسند نہیں، کمبخت جاہل لونڈوں سے دن بھر سر کھپاؤ اور چپراسی سے بھی کم تنخواہ پاؤ۔ اس سے تو اپنا سگریٹ کا خرچ بھی پورا نہیں ہوسکتا، سو یہ بندہ عاجز بھی بے روزگاروں کی فوج ظفر موج میں بھرتی ہو گیا۔

حالات اچھے نہیں تھے لیکن یہ فقیر ہمیشہ ''سمپل لونگ اینڈ ہائی تھنکنگ'' کا قائل رہا ہے۔ بامحاورہ اردو میں اس کا ترجمہ ہے ''رہو جھونپڑوں میں، خواب دیکھو محلوں کے'' (ریختی میں اسی خیال کو ذرا دوسری طرح ادا کیا گیا ہے ''اے ہے، شکل چڑیلوں کی سی مزاج پریوں کا'') ہاتھ تنگ تھا تو کیا ہوا، میں تو اپنی خانہ ساز انا کی معجون فلک سیر کھاتا رہا۔ مجھے نہ ٹیچر بننا تھا نہ پھٹیچر، یہاں

جنگجوؤں سے عمر میں بڑا اور شاید ان کا لیڈر ہے۔ اس کے کہنے پر میں اسے ماموں کہہ کر پکارنے لگا۔ وہ میرے ساتھ لطف و کرم سے پیش آیا۔ میرے ہاتھ ڈھیلے کر دیے اور مجھے چائے پلائی۔

دوران گفتگو کہنے لگا کہ ترک حکومت اسلام سے دور جا چکی۔ ہم چاہتے ہیں کہ تمام اسلامی ممالک کی حکومتیں مغرب کے اثر سے نکل آئیں۔ رخصت ہوتے وقت اس نے ساتھیوں کو تلقین کی کہ وہ میرے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ اس ہدایت کا مثبت نتیجہ نکلا۔ جنگجو پھر میرا خیال رکھنے لگے۔ ایک نے مجھے کیلے دیے۔ دوسرے نے جرابیں، تاکہ میرے پیر گرم رہ سکیں۔

لیکن یہ اچھے دن جلد ہی ختم ہو گئے۔ میرے ''ماموں'' کو آئے تیسرا دن تھا کہ اس نے بتایا ''قاضی نے تمھارے خلاف فیصلہ سنایا ہے۔ کیونکہ تم ایسے اخبار میں کام کرتے ہو جو مسلمانوں کے مفادات کا خیال نہیں رکھتا۔''

یہ سن کر قدرتاً میں بہت پریشان ہو گیا کیونکہ بطور سزا مجھے پھانسی ہونا یقینی تھا۔ ''ماموں'' بھی میری حالت دیکھ کر متوحش ہو گیا۔ کہنے لگا ''اگر فیصلہ میرے ہاتھ میں ہوتا، تو میں تمھیں معاف کر دیتا۔ لیکن میں تمھیں فائرنگ سکواڈ کے سامنے مرنے نہیں دوں گا، یہ بے عزتی کی بات ہے۔ بلکہ میں تمھارا گلا کاٹوں گا۔ تم اچھے مسلمان ہو۔''

یہ سن کر مجھے اپنی رگوں میں خون جمتا محسوس ہوا۔ میں پھر دم بخود بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ ایک طرف کھائی تھی، تو دوسری طرف موت! بچنے کا واحد راستہ یہ تھا کہ میں اس نامعلوم مقام سے فرار ہو جاؤں۔

لیکن میں پَر کٹے پرندے کی طرح ان کے شکنجے میں پھنسا اپنی موت کا انتظار کرتا رہا۔ آخر وہ دن آ پہنچا جب میرا سر قلم کیا جانا تھا۔ صبح ہوئی، دوپہر اور پھر شام...... لیکن جنگجوؤں میں سے کوئی بھی میرے سیل میں نہیں آیا۔ حتیٰ کہ وہ نوجوان بھی نمودار نہ ہوا جو مجھے وضو کرانے اور نماز پڑھانے لے جاتا تھا۔

اب طرح طرح کے خیالات اور سوال مجھے ستانے لگے۔ ''کیا وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں تاکہ میں بھوک و پیاس کے ہاتھوں مارا جاؤں؟'' یا ''وہ دوران جنگ ہلاک ہو گئے؟'' ماحول میں چھائی خاموشی بلی کی ''میاؤں میاؤں'' نے توڑی۔ اس وقت مجھے دنیا میں سب سے بڑی نعمت یہی لگی کہ کاش میں بلّی کو گود میں لے کر اسے ہلا سکوں۔

تین دن میں بھوکا پیاسا سیل میں قید رہا۔ آخر جنگجو نمودار ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ مخالف تنظیم نے ان کے علاقے پر دھاوا بول دیا تھا۔ ایک جنگجو نے مجھ سے پوچھا ''کیا تم اپنے ''ماموں'' کو دیکھنا چاہتے ہو؟'' میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

جنگجو مجھے اس کمرے میں لے گیا جہاں وہ بم اور دھماکہ خیز اشیا تیار کرتے تھے۔ میں یہ دیکھ کر لرز گیا کہ وہاں ''ماموں'' خون میں لت پت لیٹا تھا۔ تبھی میں نے اس کا چہرہ پہلی بار دیکھا۔ اس کے ماتھے پہ گولی کا نشان ثبت تھا۔ وہ اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔

اس کی موت نے مجھے مزید پریشان کر ڈالا۔ میرا اکلوتا دوست دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اگلے ہی دن جنگجو مجھے نئے مقام پر لے گئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرا آخری وقت آ پہنچا۔ مگر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ترک کمانڈوز وہاں آ پہنچے۔ انھیں دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ زندہ بچ جانے پر میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

◆◆◆

شام و عراق کے وسیع علاقے پر حکومت کرنے والی تنظیم دولت اسلامیہ (آئی ایس) نے القاعدہ سے جنم لیا۔ القاعدہ کے مانند یہ تنظیم بھی عالم اسلام میں کثیر حامی اور مخالفین رکھتی ہے۔ بعض مسلمان دولت اسلامیہ کے جنگجوؤں کو مجاہدین کہتے ہیں۔ دوسروں کی نظر میں یہ دور جدید کے خوارج ہیں۔

دولت اسلامیہ کے رہنما اسلامی دنیا میں خلافت راشدہ کے مانند اپنی خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم ان کے بعض نظریے بہت سے مسلمانوں کو قابل قبول نہیں۔ مثلاً غیر مسلموں کو زبردستی مسلمان بنانا، جزیہ نہ دینے پر ظلم و ستم کرنا۔

ان کا ایک متنازع نظریہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کے خلاف جہاد سے قبل اسلامی معاشروں کی تطہیر وصفائی ضروری ہے۔ چونکہ وہ فلسطینی تنظیم، ''حماس'' کو اسلامی نہیں سمجھتے، لہٰذا درج بالا نظریے کی رو سے دولت اسلامیہ کے جنگجو اسرائیل پر حملہ آور ہونے سے پہلے ''حماس'' پر دھاوا بولنا چاہتے ہیں۔

دولت اسلامیہ کی بنیاد ۳/جنوری ۲۰۱۴ء کو رکھی گئی۔ تنظیم کی فوج میں پچاس ہزار فوجی شامل ہیں۔ اس کا موجودہ سربراہ، ابوبکر البغدادی ہے جو اب امیر المومنین ابراہیم کہلاتا ہے۔

وقت دیر تک عبادت الٰہی میں مصروف رہتے۔ اکثر مجھے بتاتے کہ وہ میدان جنگ میں شہید ہونے کی تمنا رکھتے ہیں۔

وہ کرۂ ارض پر خلفائے راشدین کی طرح خلافت قائم کرنا چاہتے تھے جہاں کتاب وسنت کے احکامات پر عمل ہو۔ سب لوگ قانون کی نظر میں برابر ہوں اور انھیں عدل و انصاف میسر آسکے۔

انھوں نے مجھے ترک زبان میں لکھی جہاد کے متعلق ایک کتاب دی۔ پھر قرآن پاک کا تحفہ دیا۔ بعض جنگجو چاہتے تھے کہ میں بھی میدان جنگ جا کر شامی فوج سے نبرد آزما ہوں۔ کچھ مجھے خودکش بمبار بنانا چاہتے تھے۔ میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہتا۔

میں نے کسی جنگجو کو گانا گاتے یا سیٹی بجاتے نہیں سنا۔ وہ سگریٹ بھی نہیں پیتے اور نہ ہی عورتوں کے متعلق باتیں کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ امریکا کا ساتھ دینے کی وجہ سے (ترک وزیراعظم) اردگان اور دیگر ترک وزرا کافر ہو چکے۔ اسی بنا پر وہ انھیں واجب القتل سمجھتے۔

پچیسویں دن معلوم ہوا کہ ایک قاضی میرے مقدمے کا جائزہ لے رہا ہے۔ بعض جنگجو مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ترک جیلوں میں داعش کے کئی قیدی تکلیف سے دوچار ہیں۔ میرے قتل سے ان کا بدلہ لیا جانا مقصود تھا۔ یہ سن کر سرتاپا میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

چند دن بعد ایک فرشتہ سیرت رہنما وہاں آپہنچا۔ وہ سرد اور تاریک رات تھی جب کچھ لوگ میرے سیل میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک میرے قریب بیٹھا اور گفتگو کرنے لگا۔

بولا، مجھے معلوم ہے کہ تم اذیت ناک وقت سے گزر رہے ہو۔ پتا چلا کہ وہ دس سال افغانستان میں القاعدہ کے ساتھ گزار چکا تھا۔ جب امریکیوں نے حملہ کیا، تو وہ گرفتار ہوگیا۔ پھر پوچھ گچھ کے دوران تشدد کا نشانہ بنا۔ بعدازاں اسے رہا کر دیا گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ دیگر

آئی ایس (ISIS) یا عراق یا شام کی اسلامی ریاست بھی کہلاتی ہے۔

بن یامین پھر چالیس دن تک داعش کی قید میں رہا۔ آخر ترک کمانڈوز اس کی مدد کو آ پہنچے۔ وہ شام میں ۲۰ کلومیٹر تک اندر گھس آئے اور انھوں نے ترک صحافی کو جنگجوؤں کے قبضے سے آزاد کرایا۔ بعدازاں بن یامین نے چالیس دنوں کی روداد ''ملت'' میں قلمبند کی جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

☆

یہ ۱۵ نومبر کا واقعہ ہے، میں فری سیرئین آرمی (Free Syrian Army) کے ایک کمانڈر کی معیت میں شام پہنچا۔ حال ہی میں داعش کے جنگجوؤں نے ترک نژاد شامیوں کے دیہات میں کئی افراد قتل کر دیے تھے۔ میں اسی قتل عام پر رپورٹ مرتب کرنا چاہتا تھا۔

مجھے علم نہ تھا کہ دیہات میں ابھی داعش کے جنگجو چھپے بیٹھے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے موقع پاتے ہی ہمیں اغوا کر لیا۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ ہاتھ بھی پشت پہ کر کے باندھے گئے۔ اس کے بعد جنگجو ہمیں مختلف مقامات پر لیے پھرتے رہے۔

کسی مقام پر مجھ سے پوچھ گچھ کی جاتی۔ تب سیاہ نقاب پہنے ہوئے اور ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس جنگجو میرے سامنے ہوتے۔ ان کا رویہ بہت سخت ہوتا۔ وہ مجھ سے پوچھتے ''کیا تم مسلمان ہو؟ سنّی ہو یا علوی؟ فلاں دعا پڑھ کر سناؤ۔''

ایک دفعہ دوران تفتیش مجھے حکم ملا ''اپنے تمام یوزر نیم اور پاس ورڈ ہمیں بتاؤ۔ تم نے فیس بک میں عورتوں سے بھی دوستیاں کر رکھی ہیں، یہ جرم ہے۔ کیا تم شراب پیتے ہو؟ تم کس کے لیے کام کر رہے ہو؟ ہمیں ان کے نام بتاؤ۔ تمھارا اصل نام کیا ہے؟''

رفتہ رفتہ ہر مقام پر مجھ سے اسی قسم کے سوال پوچھے جانے لگے۔ حتیٰ کہ میرا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ مجھے وقت کا کوئی اندازہ نہیں رہا۔ آج سوچوں، تو وہ چالیس دن مجھے چالیس سال جتنے لگتے ہیں۔

لیکن میں آئی ایس آئی ایس کے خلاف زیادہ نہیں لکھنا چاہتا۔ ترکی میں کئی لوگ اس تنظیم سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

جنگجوؤں نے مجھے مجبور کیا کہ میں پانچ وقت کی نماز پڑھنے لگوں۔ صرف اسی وقت وہ آنکھوں پر بندھی پٹی اتارتے اور میرے ہاتھ کھولتے۔ جنگجو اکثر کہتے ''اگر تم مسلمان ہو، تو تمھیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن تم جھوٹے نکلے، تو فوراً مار دیے جاؤ گے۔''

ہمیں قید ہوئے سترہ دن ہو چکے، تو مجھے اور فری سیرئین آرمی کے رہنما، ہاشم تقی کو علیحدہ کر دیا گیا۔ میں نئے مقام پر پہنچا تو وہاں داعش کے بیشتر جنگجو ترک تھے۔ مجھے خیال آیا کہ اب میری جان بخشی ہو گی یا موت میرا مقدر بن سکتی ہے۔

ترک جنگجو ترکی یا جرمنی سے آئے تھے۔ انھوں نے منہ پر نقاب پہنے ہوتے، مگر ترک زبان بولنے کے باعث پہچانے جاتے۔ بہرحال انھوں نے میرے ساتھ دیگر جنگجوؤں کی نسبت اچھا سلوک کیا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ابوغریب جیل (عراق) میں نہ تھا جہاں امریکیوں نے عراقیوں کو وحشیانہ و غیر انسانی سلوک کا نشانہ بنایا تھا۔

سبھی جنگجو نوجوان تھے۔ بعض نے یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ وہ دن کو لڑتے اور رات کے

مہم جوئی

عراق و شام میں سرگرمِ عمل تنظیم

داعش کی قید میں چالیس دن

عراقی جنگجوؤں کے نظریات و خیالات عیاں کرنے والی ایک ترک صحافی کی داستانِ اسیری

یہ ۲۰۱۱ء کی بات ہے جب بن یامین بیگ شام پہنچا۔ وہ ترکی کے مشہور اخبار، ''ملت'' سے وابستہ صحافی ہے۔ وہ شام کی خانہ جنگی رپورٹ کرنے وہاں پہنچا تھا۔ بن یامین پھر شام میں آتا جاتا اور اپنی رپورٹیں تیار کرتا رہا۔

نومبر ۲۰۱۳ء میں وہ آخری بار شام گیا۔ مگر اسے خبر نہ تھی کہ موت اس کے تعاقب میں ہے۔ ہوا یہ کہ داعش تنظیم کے جنگجوؤں نے اسے اغوا کرا لیا۔ یہ تنظیم آئی ایس

بن یامین جنگجوؤں کی حراست میں

ظفر اقبال

متاثرین سیلاب
شمالی وزیرستان
قحط زدگان تھرپارکر
بلوچستان بحالی مہم
قربانی کی کھالیں
فلاح انسانیت فاؤنڈیشن
کو دیجئے
عطیہ قربانی کیجئے
گائے 56 ہزار
حصہ 8 ہزار
بکرا 13 ہزار
عیدالاضحیٰ کے موقع پر تھرپارکر کے قحط زدگان بلوچستان کے مستحقین قبائلی علاقہ جات کے لاکھوں بے گھر افراد مساکین و مہاجرین کو گوشت کی فراہمی کیلئے
بروقت قربانی کے جانور یا ان کی قیمت فلاح انسانیت فاؤنڈیشن کے مراکز، دفاتر یا مسئولین کو جمع کروا کر انہیں بھی عید قرباں کی خوشیوں میں شامل کیجئے
مرکزی کیمپ
مرکز القادسیہ چوبرجی لاہور
0322-4442905
0301-4506531
ڈیفنس/کینٹ 0321-4326346
ماڈل ٹاؤن/فیصل ٹاؤن 0300-4340443
جوہر ٹاؤن/واپڈا ٹاؤن 0321-4120821
اقبال ٹاؤن/سبزہ زار 0322-7570006
مصطفیٰ ٹاؤن/منصورہ 0300-8064484
نیو ڈیفنس/بیدیاں روڈ 0312-4992409
گلبرگ 0321-3000304
سمن آباد/اچھرہ 0321-4925416
ٹاؤن شپ/گرین ٹاؤن 0300-4428627
قینچی/چونگی 0321-4186294
بحریہ ٹاؤن/ای ایم ای 0300-4599384
اندرون شہر 0321-4809555
گڑھی شاہو/گوالمنڈی 0321-4506958
گلشن راوی/اسلام پورہ 0300-8096702
بلال گنج/کریم پارک 0322-6602705
باغبانپورہ/شالامار 0321-4568081
شادباغ 0322-4360965
چاہ میراں 0333-4073526
مغل پورہ/سلامت پورہ 0321-8865573
صدر/مصطفیٰ آباد 0323-4004598
بادامی باغ/فروٹ منڈی 0321-4895319
شادمان/مزنگ 0323-4385749
کوٹ عبدالمالک/بیگم کوٹ 0300-6970391
شاہدرہ/فیروزوالہ 0301-4670267
کاہنہ 0300-8576116
جلو 0323-4153053
منڈی فیض آباد 0300-4293611
شرقپور 0302-4002787
نارنگ منڈی 0300-7347247
مریدکے 0322-4747211
راوی ریان 0301-4888521
مانگا منڈی 0300-4789883
رائیونڈ 0321-4746873
تاجران 0300-4020446
جنوبی انڈسٹریز 0300-4429560
شمالی انڈسٹریز 0321-8400021
غربی انڈسٹریز 0321-4162616
فلاح انسانیت 0300-4340443
شعبہ ملازمین 0300-9406242
تعلقات عامہ 0322-7777564
وکلاء 0323-5010000
طلباء 0331-4773010
اساتذہ 0322-4644606
شعبہ گونگے بہرے 0301-4226581
شعبہ نابینا 0321-7027745

اجتماعی قربانی

سابقہ سالوں کی طرح ادارہ آمنہ جنت فاؤنڈیشن اس سال بھی قربانی کا اہتمام کر رہا ہے آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ قربانی کریں اپنے لیے، اپنے والدین اور مرحومین کے بلند درجات کے لیے۔

اس سال قربانی کے جانور اور حصے کی تفصیل یہ ہے

دنبہ	وزن	درمیانہ	1عدد	8ہزار روپے
چھترا	وزن	درمیانہ	1عدد	10ہزار روپے
بکرا	وزن	درمیانہ	1عدد	15ہزار روپے
گائے	بھاری	فی حصہ	1عدد	9ہزار روپے، مکمل: 63ہزار روپے
گائے	فی حصہ	فی حصہ	1عدد	7ہزار روپے، مکمل: 49ہزار روپے
اونٹ	بھاری	فی حصہ	1عدد	10ہزار روپے
اونٹ	درمیانہ	فی حصہ	1عدد	8ہزار روپے

اجتماعی قربانی میں شامل ہونے والے تمام احباب کو قربانی سے ایک دن پہلے تک اپنے حصے کی تمام رقم ادارہ ہذا میں جمع کرانا ہوگی۔ مقامی احباب چاہیں تو گوشت قربان گاہ سے خود وصول کرلیں یا اپنا مکمل پتا دیں، ادارے کی طرف سے بلا معاوضہ پہنچا دیا جائے گا۔ قربانی میں شامل ہونے والے تمام احباب 10 دن پہلے اپنا نام درج کرا دیں۔ شکریہ!

بیرون احباب سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں اجازت دیں کہ ہم ان کے حصے کا گوشت یہاں تقسیم کر دیں، یہ اجازت سے ہوگا۔ نیز جانوروں کی خریداری شروع کر دی گئی ہے۔ جو احباب جانور دیکھ کر شامل ہونا چاہیں تو وہ شام 5 بجے سے 7 بجے کے درمیان تشریف لا کر ملاحظہ فرمالیں۔

آپ اپنی قربانی کی رقم بذریعہ: چیک یا ڈرافٹ ارسال کرنا چاہیں تو ڈرافٹ یا چیک آمنہ جنت فاؤنڈیشن اکاؤنٹ:02745 ایم سی بی، چونیاں برانچ نمبر:0240 کے نام بھجوائیں۔ رقم آن لائن بھی جمع کرا سکتے ہیں۔ اس صورت میں مطلع ضرور کریں۔ آن لائن اکاؤنٹ ایم سی بی:PK86MUCB0673440401002745

ٹائٹل اکاؤنٹ: آمنہ جنت ویلفیئر فاؤنڈیشن ایم سی بی چونیاں برانچ۔

مزید رابطے کے لیے:

رضیہ پروین: پرنسپل آمنہ جنت فاؤنڈیشن، ماڈل اسکول۔ چونیاں، ضلع قصور۔

فون:0322-7614497 -0300-4735932

لیں۔ چیخ کر باتیں نہ کی جائیں۔ صبح سو کر اٹھنے اور سوتے وقت گرم پانی نمک میں ملا کر غرارے کیجیے۔ نمک کی مقدار اس میں اتنی ہی ہو جتنی کھانے میں شامل کی جاتی ہے۔

ورم لوزتین کے علاج میں خصوصاً سیاہ شہتوت بہت مفید ہیں۔ ان کے رس سے تیار ''شربت توت سیاہ'' بازار میں مل جاتا ہے۔ چائے کا ایک چمچہ شربت دو، دو گھنٹے بعد آہستہ آہستہ نگلا جائے۔ نگلنے کا انداز چوسنے والا ہو تاکہ حلق میں لگتا ہوا جائے۔ اس شربت کو مزید موثر بنانے کے لیے اس میں نصف گرام ''ڈیکامالی'' (ایک پودے کا گوند) یا ''نمک چرچٹہ'' (ایک بوٹی کا نمک) باریک پیس کر ملا لیتے ہیں۔ شہتوت کے پتوں سے غرارے کرنا بھی سود مند ہے۔ دس پتوں کو تھوڑے سے نمک کے ساتھ دو پیالی پانی میں اچھی طرح جوش دیجیے۔ اس کے بعد چھان کر نیم گرم پانی سے صبح اور سوتے وقت غرارے کیجیے۔

دوسری موثر دوا ''مغز املتاس'' ہے۔ املتاس کی پھلی سے نکلنے والا یہ گودا دوا فروشوں سے مل جاتا ہے۔ ویسے بھی املتاس کے درخت شہروں میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ انھیں سڑکوں کی دونوں جانب یا باغوں میں لگایا جاتا ہے۔ مارچ اور اپریل کے مہینے ان درختوں میں زرد رنگ کے پھول لڑیوں کی شکل میں لگتے ہیں۔ پھر تقریباً دو فٹ لانبی پھلیاں لگتی ہیں، جن کی رنگت ابتدا میں سبز ہوتی ہے۔ پکنے پر سیاہ ہو جاتی ہے۔

سیاہ پھلیوں کا گودا ہی ''مغز املتاس'' کہلاتا ہے۔ اس سے تیار کردہ دوا کو ''لعوق خیارشنبر'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے دو چمچے ایک پیالی گرم پانی میں ملا کر سوتے وقت اور صبح پییں۔ یہ کھانسی اور قبض میں بھی مفید ہے۔ مغز املتاس سے غرارے بھی کرائے جاتے ہیں۔ ۲۵ گرام مغز کو ایک پیالی دودھ اور ایک پیالی پانی میں ملا کر ہلکا جوش دیجیے۔ جب ایک جوش آ جائے تو چھان کر نیم گرم پانی سے غرارے کیجیے۔ مرض کے آغاز میں ہی معالج سے مشورہ کرنے سے مزید پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوتیں اور جلد آرام آ جاتا ہے۔

نپولین

☆۔ جنگ کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ لوگ مر جاتے ہیں، لیکن تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ ہم انھیں فراموش کر دیتے ہیں، جنھوں نے وطن کی آن پر جان دی۔ ان کا نام آخری نسل تک زندہ رہنا چاہیے۔

☆۔ جنگ میں اخلاقی قوتیں تین چوتھائی اہمیت رکھتی ہیں، مادی قوتوں کا کردار ایک چوتھائی ہے۔

☆۔ میں اپنے حریفوں پر اس لیے غالب آتا ہوں کہ وہ چند لمحوں کو کچھ نہیں سمجھتے مگر میں ان لمحوں کی قدر و قیمت خوب سمجھتا ہوں۔

☆۔ لکڑیاں علیحدہ علیحدہ جلاؤ تو دھواں دیتی ہیں، اکٹھی جلاؤ تو روشنی فراہم کرتی ہیں۔

☆۔ احمق وہ ہے جو یہ سمجھے کہ اسے دوسرا موقع بھی مل سکتا ہے۔

☆۔ اتحاد جنگ کا سب سے زیادہ مہلک ہتھیار ہے۔

☆۔ دنیا میں نیک کام کر کے مر جانا آب حیات پینے سے زیادہ بہتر ہے۔

(انتخاب: حسنین بشیر، پشاور)

رکھتی ہے۔ پانی میں بھیگنا، سردی لگنا، کھٹی چیزوں یا بہت تیز مرچ مسالے کا کثرت سے استعمال اور چکنائی والی اشیا کھانے کے بعد پانی پی لینا بھی ورم لوزتین پیدا کرتا ہے۔

ایسے لوگ بھی، جو بہت چیخ چیخ کر باتیں کریں یا اونچی آواز میں گانے کا شوق رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں اعتدال سے کام نہیں لیتے، اپنا گلا خراب کر لیتے ہیں۔ چھوٹے بچوں میں چیونگم، ٹافی اور چاکلیٹ کے زیادہ استعمال اور دانت صاف نہ کرنے سے یہ بیماری جنم لیتی ہے۔ بہت چھوٹے بچے جنھیں چسنی چوستے رہنے کی عادت ڈال دی جائے، ان کے لوزتین بھی اکثر خراب رہتے ہیں۔ چسنی مستقل طور پر چوستے رہنے سے منہ و حلق پر زور پڑتا ہے۔

بعض امراض کے نتیجے میں بھی ورم لوزتین پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً جوڑوں کا درد، خواہ بڑے جوڑوں میں ہو یا چھوٹے میں۔ اس کے علاوہ ورم لوزتین بہت دنوں تک رہے اور اس کا مناسب علاج نہ کیا جائے تو قلب متاثر ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ خصوصاً دل پر استر کرنے والی جھلیوں میں سوزش ہو جاتی ہے۔ دل کے والو بھی خراب ہو جاتے ہیں ۔یہی وجہ ہے ، ورم لوزتین کا علاج پوری سنجیدگی کے ساتھ کرنا چاہیے۔

کبھی کبھی یہ مرض بطور وبا پھیلتا ہے۔ اس مرض کی شروعات عموماً گلے کی خرابی سے ہوتی ہے۔ نتیجتاً گلے میں تکلیف ہو جاتی ہے۔ درد بڑھنے کی صورت میں ٹیسیں کانوں تک پہنچتی ہیں۔ اگر مرض کا حملہ شدید ہو تو سردی لگ کر بخار چڑھ آتا ہے۔ منہ کھول کر اگر حلق کا معائنہ کیا جائے، تو زبان کی جڑ کے ساتھ ساتھ دونوں جانب لوزتین گلٹیاں سرخ اور بڑھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ باہر کی جانب زیریں جبڑے کے نیچے ہاتھ لگانے سے ورم محسوس ہوتا ہے۔ کوئی چیز کھائیں تو نگلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی درد بھی ہوتا ہے۔

مناسب علاج اور غذا و پرہیز سے عام طور پر پانچ دن میں ورم اور تکلیف کم ہونے لگتی ہے۔ آٹھ دس دن میں آرام آ جاتا ہے۔ اگر یہ مرض بار بار ہوتا رہے اور لوزتین کی ساخت بھی خراب ہو جائے تو پھر ان کا معائنہ کرتے وقت سفید یا زردی مائل پیپ کے دھبے بھی نظر آتے ہیں۔ یہ تشویشناک صورت حال ہے۔ ایسی صورت میں انھیں آپریشن کے ذریعہ نکالنا ہی مناسب ہے۔

چھوٹے بچوں میں اگر اس مرض کے حملے بار بار ہوں تو ان کی جسمانی نشوونما رک جاتی ہے۔ وہ دن بہ دن کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ذرا سی بے احتیاطی یا بدپرہیزی سے ان کا گلا خراب ہو جاتا ہے۔ کبھی مرض کے بار بار حملے لوزتین کو سخت کر دیتے ہیں، خصوصاً کمزور نوجوانوں میں۔ کبھی یہ اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے......اور آواز تبدیل ہو جاتی ہے۔

جس زمانے میں یہ مرض وبا کی صورت پھیلے، تو غذا میں بہت احتیاط کرنی چاہیے۔ بازاری غذائیں، بہت تیز مرچ مسالے اور کھٹی چیزیں ترک کر دیں۔ صاف ماحول میں وقت گزاریے۔ منہ اور دانتوں کی صفائی پر توجہ دیجیے۔ بہت تیز ٹھنڈا پانی بھی مضر ہے۔ مریض کو چاہیے کہ وہ اپنا گلاس و تولیہ وغیرہ الگ رکھے تاکہ دوسروں تک بیماری نہ پہنچ سکے۔

چھوٹے بچوں کو پیار کرنے میں بھی احتیاط برتنی چاہیے۔ چھوٹے بچے بہت نازک ہوتے ہیں۔ بیماری کے جراثیم جلد قبول کر لیتے ہیں۔ کھانستے اور چھینکتے وقت تولیہ یا رومال منہ پر رکھیں اور اپنا منہ دوسری جانب پھیر

کسی مرض کے جراثیم جسم کے اندر داخل ہونے لگیں تو یہ انھیں اپنے میں جذب کر کے ختم کر دیتی ہیں۔ لیکن جب بار بار جنگ کا سلسلہ جاری رہے یا جراثیم بھرپور طریقے سے وار کریں تو پھر یہ کمزور ہو جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سوزش اور ورم پیدا ہو جاتا ہے۔

جسم میں حلق ایک ایسا مقام یا جنکشن ہے، جہاں سے کئی راستے شروع ہوتے ہیں یا ان کا اختتام ہوتا ہے۔ مثلاً جہاں منہ کی حدود ختم ہوں، وہاں سے غذا و ہوا کی نالیاں شروع ہوتی ہیں۔ دونوں کانوں اور آنکھوں سے بھی ایک باریک ٹیوب حلق میں جا کر کھلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی دوا کان یا آنکھ میں ڈالی جائے تو کچھ ہی دیر بعد اس کا ذائقہ منہ میں محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح روتے وقت آنسو ناک و حلق میں پہنچ جاتے ہیں۔ ناک کے سوراخوں کا اختتام بھی حلق میں ہوتا ہے۔

انہی وجوہ کی بنا پر حلق کو جنکشن کیا جا سکتا ہے، جہاں جراثیم ایک راستے سے آ کر دوسرے میں داخل ہوتے ہیں۔ اس لیے وہاں بیماری پھیلنے کے خطرات ہر وقت رہتے ہیں۔ حلق کی اسی ''فوجی اہمیت'' کے پیش نظر قدرت نے وہاں مضبوط ''چیک پوسٹ'' قائم کر دی اور اس حفاظتی چوکی پر پہرے دار بٹھا دیے۔ غالباً یہ وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ پہرے دار ''لوزتین'' یا ''ٹانسلز'' ہیں۔ یہ حلق کے ذریعے حملہ آور ہونے والے جراثیم روک کر انھیں ہلاک کرتے ہیں، تاکہ انھیں نقصان پہنچانے کی مہلت نہ مل سکے۔

لیکن جب بار بار یہ غدود جراثیم سے آلود ہوں، تو خود بھی کمزور پڑ جاتے ہیں۔ ان میں سوزش اور ورم رہنے لگتا ہے۔ لیکن اس باعث لوزتین کو جسم سے نکال دیا جائے تو کئی راستوں سے جراثیم کی یلغار حلق میں روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ نتیجتاً انھیں بڑھنے اور خطرناک امراض پیدا کرنے کی کھلی چھٹی مل جائے گی۔ جس طرح کسی ملک میں سرحدوں کی نگرانی کرنے والی فوجوں کو ہٹا دیا جائے اور دشمن بلا کھٹکے اندر دور تک گھستا چلا آئے۔

یہ ضرور ہے کہ بعض صورتوں میں لوزتین نکالے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ مثلاً ان کی ساخت اتنی خراب ہو جائے کہ جراثیم کا قلع قمع کرنے کے بجائے خود ان کی آماجگاہ بن جائیں۔ ان میں پیپ پڑ جائے اور وہ گندگی غذا و پانی کے ذریعہ جسم کے اندرونی حصوں تک پہنچے اور جسم کو خطرات سے دوچار کر دے۔ تاہم بہتر یہی ہے کہ خراب لوزتین نکلوانے سے پہلے انھیں ٹھیک کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ لوزتین نکلوا دینے سے مختلف بیماریاں مثلاً حلق و پھیپھڑوں کے امراض، پیٹ کی خرابی اور ناک کے امراض انسان کو گھیر لیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جدید تحقیق کی رو سے لوزتین ہمیں مختلف بیماریوں سے بچانے والے ٹی خلیے (T. Cells) پیدا کرتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگر کسی شخص کے لوزتین بار بار متاثر ہوں، ان میں تکلیف بڑھ جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مریض میں بعض جراثیم مستقل مرض پیدا کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ لیکن لوزتین آڑے آنے کی وجہ سے وہ مرض اپنے قدم نہیں جما پا رہا۔

ورم لوزتین عام طور پر بچوں یا جوانوں کو لاحق ہوتا ہے۔ یہ ایک سے دوسرے کو لگ جانے والی بیماری ہے۔ زیادہ تر موسم سرما میں چمٹتی ہے۔ وہ لوگ بھی اس مرض کا شکار ہوتے ہیں جو ایسے تنگ و تاریک مکانات میں رہیں جن میں صاف ہوا کی آمدورفت کا معقول انتظام نہیں ہوتا۔ واضح رہے، دھوپ خود بہت تیز جراثیم کش اثرات

ہمیں بیماریوں سے محفوظ رکھنے والے

حلق کے چوکیدار
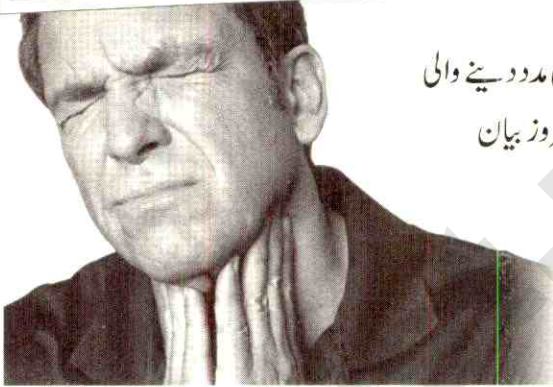
انسان کو تندرست رکھنے میں مدد دینے والی بافتوں کا معلوماتی افروز بیان

حکیم عبدالحنان

آپ نے خواتین کو پریشان لہجے میں یہ کہتے ضرور سنا ہوگا ''منے کو ٹانسلز ہو گئے ہیں۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ ''ٹانسلز'' کوئی بیماری نہیں بلکہ یہ بافتوں کے ایک مجموعے کا نام ہے۔ یہ بافتیں (Tissues) انسان کو تندرست رکھنے میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ البتہ جب یہ 'ٹانسلز' (Tonsils) خود خراب ہو جائیں تو انسان بھی بیمار پڑ جاتا ہے۔

پہلے بہتر ہے کہ 'ٹانسلز' کا تعارف کرا دیا جائے۔ انسانی حلق کے اندر لوزیا بادام کی شکل کی دو چھوٹی چھوٹی گلٹیاں ہوتی ہیں۔ انھیں اردو و عربی میں ''لوزتین'' کہا جاتا ہے۔ یہی ٹانسلز ہیں۔ اگر منہ کھول کر حلق کا معائنہ کیا جائے تو انھیں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ انہی گلٹیوں کا ورم ''ورم لوزتین'' یا ''ٹان سیلائٹس'' کہلاتا ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ چند بار لوزتین میں ورم ہوا اور گلا دکھنے آیا تو ان گلٹیوں کو آپریشن کر کے نکال دیا جاتا ہے۔ کیا واقعی لوزتین اتنے ہی غیر ضروری ہیں کہ خرابی کی صورت انھیں جسم سے نکال کر باہر پھینک دیا جائے؟ اور کیا انھیں نکال دینے سے صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا؟ ان باتوں کا ہمیں بغور جائزہ لینا چاہیے۔

ہمارے جسم کو امراض سے محفوظ رکھنے کے لیے قدرت نے ''نظام لمفاوی'' یا ''لمفیٹک سسٹم'' بنایا ہے۔ اسی نظام کے تحت چھوٹی چھوٹی گلٹیاں ان جسمانی راستوں پر پیدا کی گئی ہیں جہاں سے جراثیم جسم میں داخل ہو کر امراض پیدا کر سکتے ہیں۔ دراصل یہ گلٹیاں چوکیدار کے فرائض انجام دیتی اور ہمہ وقت چوکس رہتی ہیں۔ اگر

ٹیلی وژن اور وی سی آر دینے کی پیشکش کی تاکہ وہ الحاج صاحب کو راضی کر لے۔

ایک دن رات کو بارہ بجے الحاج صاحب گھر پہنچے تو پیر صاحب مانکی شریف کو تشریف فرما دیکھا۔ انھوں نے مہمان کو خوش آمدید کہا اور ان کی چائے وغیرہ سے تواضع کی۔ لیکن اس وقت الحاج کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب دوران گفتگو پیر صاحب کھڑے ہوگئے اور دامن پھیلا کر بولے ''آج میں آپ سے کچھ مانگنے آیا ہوں۔''

الحاج صاحب نے قدرتاً شرمندگی محسوس کی اور ان کے گھٹنے چھو کر کہا کہ حکم کیجیے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ لیبر کے ساتھ ساتھ وزیر اوقاف، زکوٰۃ اور حج بھی ہیں لہٰذا شاید پیر صاحب کسی کو زکوٰۃ یا محکمہ اوقاف میں ضلعی یا صوبائی خطیب لگوانے کی بات کریں گے۔ مگر انھوں نے اس کے برعکس کہا ''آپ مغل انسپکٹر کا تبادلہ نہ کریں۔

الحاج شمیم الدین یہ سن کر حیران رہ گئے۔ بہرحال انھوں نے کہا کہ آپ خیر سے اسلام آباد تشریف لے جائیے۔ میں ان شاء اللہ اس مسئلے پر ایک دو روز میں نظر ثانی کرلوں گا۔ تب آپ کو اطلاع مل جائے گی چناں چہ پیر صاحب دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

اگلے ہی دن الحاج صاحب کو پھر حیرانی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب وہ گھر پہنچے تو مرکزی وزیر اوقاف، مسٹر ترین جن کا تعلق بلوچستان سے تھا، ان کے منتظر تھے۔ وہ بھی اس راشی انسپکٹر کی سفارش کرنے آئے تھے۔ الحاج صاحب نے پیر صاحب کی طرح یقین دہانی کے ساتھ انھیں بھی رخصت کر دیا۔ اب تو سفارشوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ اسی بارے میں بااثر افراد کے ٹیلی فون بھی آئے۔ بقول الحاج صاحب ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس تبادلے کی وجہ سے سیاسی و سماجی حلقوں میں بھونچال آ گیا ہو۔ اُدھر اس انسپکٹر نے محکمے سے چھٹی لے لی اور

توجہ فرمائیے: شمارہ ستمبر میں پیسٹنگ کی غلطی سے زیرِنظر مضمون کا آخری صفحہ شامل اشاعت نہ ہو سکا۔ اب مکمل تحریر پیش خدمت ہے۔ آئندہ خیال رکھا جائے گا کہ ایسی انوکھی غلطی جنم نہ لے۔

ڈیوٹی دینے ملیر نہیں گیا۔ اس رسہ کشی میں اسلام الدین شیخ کا فون آیا۔ موصوف وفاق میں وزیر تھے۔ ان کے پیر صاحب پگارا اور محمد خاں جونیجو وزیراعظم سے ذاتی تعلّقات تھے (انھیں بعد میں وزارت سے سبکدوش کر دیا گیا)۔ انھوں نے نہایت کڑک دار آواز میں کہا ''الحاج! انسپکٹر کا تبادلہ منسوخ کر دو۔''

الحاج صاحب نے کہا ''میں یہ معاملہ دیکھ لوں گا۔''

انھوں نے نہایت بدتمیزی سے کہا ''کرتے یا نہیں یا میں پھر کوئی اور طریقہ اختیار کروں؟''

الحاج صاحب نے کہا ''ابھی کرتا ہوں، اسے میرے پاس بھیج دیں۔''

تھوڑی دیر بعد جیسے ہی وہ انسپکٹر دفتر میں داخل ہوا' الحاج شمیم الدین نے اُسے بری طرح ڈانٹا، پھٹکارا اور اپنے عملے سے کہا کہ فوراً سیکرٹری لیبر کو بلاؤ تاکہ اس کو نوکری سے برخاست کیا جائے۔

یہ سنتے ہی انسپکٹر آہ وزاری کرنے لگا۔ الحاج شمیم الدین کہنے لگے: ''اب تمہاری ملازمت یونہی بچ سکتی ہے کہ تم نے جس جس سے سفارش کرائی ہے، اُسے فون کرو اور کہو کہ میرا کام وزیر صاحب نے کر دیا اور میں خوش ہوں۔''

اس پر انسپکٹر لرزاں و ترساں اُٹھا اور ہر سفارشی کو فون کر کے درج بالا جملے دہرائے۔ بعدازاں وہ اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا۔ یوں الحاج صاحب کی دلیری و راست بازی نے ایک بے ایمان اور بے قابو جن کو بوتل میں بند کر دیا۔

سوچتا رہ گیا کہ اس علاقے میں قانون نام کی کوئی چیز ہے یا نہیں؟

مجرم ہمیشہ کیونکر حکومت اور وزیروں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس سلسلے میں الحاج ایک معمولی اہلکار کے تبادلے کی روداد بیان کرتے ہیں۔ تب وہ وزیر محنت بھی تھے۔ کہتے ہیں کہ مختلف اداروں اور تنظیموں کی طرف سے انھیں شکایت ملی کہ بعض لیبر انسپکٹر بلاوجہ اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہیں۔ چناں چہ انھیں تکلیف دہ صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس پر انھوں نے لیبر انسپکٹروں کا ایک اجلاس بلاکر انھیں سمجھایا کہ وہ درست طریقے سے کام کریں اور یہ جان لیں کہ جہاں سے بدبو اُٹھے گی، وہیں نظر جائے گی اور گرفت بھی ہوگی۔

چند انسپکٹر گزشتہ بارہ برس سے ایک ہی علاقے میں کام کررہے تھے۔ انھوں نے حکم دیا کہ انھیں کسی دوسرے علاقے میں بھیج دیا جائے۔ ان میں سے ایک انسپکٹر مغل نامی عہدے دار علاقہ سائٹ میں کافی عرصے سے تعینات تھا۔ (یہ کراچی کا سب سے بڑا صنعتی علاقہ ہے) جب انھوں نے اس کے تبادلے کا ذکر کیا تو سیکرٹری لیبر کا کہنا تھا ”سر! آپ اسے نہ چھیڑیں، یہ پہاڑ ہیں یہ اپنا تبادلہ رکوالیں گے، آپ کی اور میری بات بھی خراب ہوگی۔“

الحاج صاحب کو لیبر سیکرٹری کی بات سن کر تعجب ہوا کہ ایک انسپکٹر اتنا طاقتور ہوسکتا ہے، اس سے پورا محکمہ خوف زدہ ہو جائے۔ حتیٰ کہ محکمہ اس کا تبادلہ کرنے سے گریزاں ہے۔ الحاج صاحب نے سیکرٹری سے کہا ”اس کو علاقہ ملیر میں بھجوا دیجیے۔ بعد میں جو کچھ ہوا، میں دیکھ لوں گا اور محکمے کے وقار پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔“

لہٰذا فوری طور پر اس کا ٹرانسفر آرڈر جاری کردیا گیا۔

انسپکٹر مغل کو جس دن پروانہ منتقلی ملا، وہ سیدھا الحاج صاحب کے دفتر آیا۔ ان کے سیکرٹری، شاہ منصور عالم کے سامنے جیب سے کنگھا نکالا اور بالوں میں پھیرتے ہوئے کہا ”جتنی دیر میں، میں بالوں میں کنگھا کرتا ہوں اتنی دیر میں میرا ٹرانسفر آرڈر کینسل ہو جائے گا۔“ پھر نہایت رازداری سے کہا کہ وزیر صاحب کو کہیں، یہ حکم واپس لے لیں، میں انھیں ایک سال میں کروڑ پتی بنادوں گا۔“

وہ یہ بھول گیا تھا کہ ہر ایک اُس کی طرح پیسے کا میت نہیں اور اس کا واسطہ الحاج صاحب سے پڑا تھا جن کی ایمان داری کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ ایک بار الحاج صاحب کی دیانت داری کے متعلق سابق گورنر سندھ، جنرل (ر) معین الدین حیدر نے کہا تھا ”مجھے اس ملک میں سو ایمان دار افراد مل جائیں تو اس ملک کی کایا پلٹ دوں۔ ابھی تک ایک آدمی ملا ہے وہ ہیں الحاج شمیم الدین۔“

تحریک پاکستان کے ممتاز کارکن، الحاج شمیم الدین ۱۷ مارچ ۱۹۳۱ء کو بدایوں، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد والدین کی ہمراہی میں کراچی آئے، نوجوان ہوئے تو سیاست میں حصہ لینے لگے۔ صوبائی حکومت میں کئی بار وزیر رہے۔ پاکستان کو ترقی یافتہ بنانا آپ کا دیرینہ خواب تھا۔

جب کروڑ پتی بنانے کی بات الحاج صاحب کے نوٹس میں لائی گئی تو انھوں نے اس انسپکٹر کو دفتر سے نکال دیا اور اسے متنبہ کیا کہ اگر وہ دوبارہ یہاں آیا تو نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ اس پر وہ پیر پٹختا چلا گیا۔ بعد ازاں انسپکٹر نے ان کے علاقے کے ایک ایک مسلم لیگی کارکن سے سفارش کروائی اور دباؤ ڈالا کہ اس کا تبادلہ منسوخ کر دیا جائے۔ حتیٰ کہ وزیر صاحب کے ڈرائیور کو

جب ایک ایماندار وزیر رشوت خور انسپکٹر سے ٹکرائے

سندھ کے ممتاز سیاست داں' الحاج شمیم الدین کی آپ بیتی سے اچھوتا انتخاب

محمد عزیز

یہ تقریباً تیس سال پہلے کی بات ہے، الحاج شمیم الدین بحیثیت وزیر تحصیل ٹھل سے رکن سندھ اسمبلی، سردار سرکی کی دعوت پر کسانوں کو مالکانہ حقوق کے سرٹیفکیٹ دینے جیکب آباد گئے۔ الحاج صاحب اس سفر کا احوال یوں بیان کرتے ہیں:

''ہم جیکب آباد کے مضافاتی علاقے کی جانب گامزن تھے۔ دوران سفر ایک بار مڑ کر دیکھا' تو پچھلے موڑ پر پولیس موبائل رک چکی تھی۔ اپنی گاڑی کے ڈرائیور سے کہا کہ آہستہ ہو جاؤ' پولیس موبائل بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ سردار سرکی گاڑی میں میرے ساتھ تھے' کہنے لگے ''سائیں چلے چلو، اس سڑک پر اس موڑ سے آگے پولیس نہیں آئے گی۔ یہ پولیس اور دھاڑیل (ڈاکوؤں) کے گروہ کا معاہدہ ہے۔''

جب ہم اجتماع گاہ پہنچے تو کیا دیکھتا ہوں کہ چھے سات صحت مند لمبے تڑنگے بڑی بڑی پگڑیاں باندھے لوگ جن کے گلوں میں رائفلیں لٹکی تھیں، کمر اور سینے پر گولیوں کی بیلٹیں بندھی ہوئی تھی اور اجرکیں کاندھوں پر دھری تھیں، چلتے ہوئے اگلی صف تک آئے۔ انھیں دیکھ کر سارے افسر اور معززین احتراماً کھڑے ہو گئے۔ منتظمین نے انھیں اگلی صف میں بٹھایا۔

میں نے سردار سرکی سے پوچھا کہ یہ کوئی وڈیرے یا سردار ہیں؟ سردار صاحب نے بتایا ''یہی ڈاکو (دھاڑیل) ہیں۔ آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

کھانے کے بعد وہ لوگ اسٹیج پر مجھ سے مصافحہ کر کے واپس اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ میں

دیں۔اس پر اللہ نے ان کی اصلاح کے لیے فوراً آیت نازل فرمائی:

ترجمہ: اور تم میں سے فضل اور وسعت والے اس بات پر قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں، مسکینوں اور ہجرت کرنے والوں کو اللہ کی راہ میں نہیں دیں گے اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور چاہیے کہ درگزر کریں۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھیں معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔'' (سورہ نور: ۲۲)

منافق کی خصلت

غصہ جب حد سے بڑھے تو بعض اوقات جھگڑے کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جھگڑے میں گالم گلوچ بھی ہوئی ہے۔ اسکول، کالج کے لڑکے اسے تفریح سمجھ کر اس سے لطف اٹھاتے اور اپنی طاقت کا رعب (Bulling) ایک دوسرے پر ڈال کر فخر کرتے ہیں۔منافق کی چار خصلتوں میں سے ایک یہ خصلت ہے کہ جب وہ جھگڑتا ہے تو گالم گلوچ پر اتر آتا ہے۔(حدیث نبوی ﷺ)

اشیا پر غصہ اُتارنا

ہمارے ہاں یہ بھی رجحان ہو گیا ہے کہ اردگرد پڑی اشیا پر غصہ نکال کر انھیں توڑا یا پھینکا جاتا ہے۔ غصے کی شدید کیفیت میں انسان آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ حالانکہ آپ کو یہ جان کر بہت حیرانی ہو گی کہ یہ بھی منافق کی نشانی ہے۔ یہ آیات نازل ہوئی ہیں:

ترجمہ: اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جن کی بات دنیاوی زندگی میں آپ کو خوش لگتی ہے اور جو اُن کے دل میں ہے، اس پر وہ اللہ کو گواہ بناتے ہیں۔ حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہیں اور جب وہ پیٹھ پھیرتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں زمین میں فساد کریں اور کھیتیاں برباد کریں اور نسل کو۔ اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (سورہ بقرہ: ۲۰۵)

آج کل بعض والدین غصے میں آ کر بچوں کو مارتے پیٹتے یا اشیا توڑتے ہیں اور کوئی نہیں ملتا تو پالتو جانور کی شامت آ جاتی ہے۔ یہ بڑا غلط رویہ ہے۔

غصے کا تدارک کرنے کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے درج بالا واقعہ کو مشعل راہ بنائیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں تمام احکامات پر عمل کی توفیق عطا فرمائے اور درج ذیل حدیث سمجھنے کی توفیق دے۔ بہادری یہ نہیں کہ تم کسی کو پچھاڑ دو، بلکہ بہادری یہ ہے کہ تم غصے میں اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔''

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبھی مسلمانوں کو اس قرآنی آیت کے مطابق بنا دے جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ مومن آپ میں انتہائی نرم دل اور ایک دوسرے سے اُلفت اور محبت کے رشتے میں ڈوبے ہوئے جسم واحد کی طرح، مگر کافروں کے لیے سخت دل ہوتے ہیں۔ اللہ ہمیں بھی غصہ کرنے اور سخت دل ہونے کی توفیق دے تو ان غیر مسلموں کے لیے جو اسلام اور مسلمانوں کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں اور جنھوں نے فلسطین، کشمیر، فلپائن، برما اور چیچنیا میں ظلم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔

حضرت ابوایوبؓ بیان کرتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے (مسلمان) بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے کہ دونوں ملتے ہیں تو ایک اس طرف منہ کر لیتا ہے اور دوسرا اس طرف! ان دونوں میں سے بہتر وہ ہے جو پہلے سلام کرے۔ (اور اس طرح صلح میں پہل کرے)۔ (صحیح بخاری)

غصے کے اثرات

غصہ کی وجہ سے ہم کبھی کبھار انا پرست ہو جاتے ہیں۔ اگر عاجزی کا رویہ غالب نہ آئے اور اپنی غلطی کا احساس نہ ہو، تو ہم غصے اور انا کی وجہ سے تکبّر اور غرور کا شکار ہو سکتے ہیں۔ (جیسے ابلیس غصے کی وجہ سے ہی تکبّر کا شکار ہوا)

یہ دیکھا گیا ہے کہ غصے کے باعث ہم اپنا وقار کھو بیٹھتے ہیں۔ لوگوں کی نظر میں شاید وقتی طور پر رعب قائم ہو جائے مگر دوسرا پھر دل سے آپ کی عزت نہیں کرتا۔ کسی کے دل میں جگہ بنانا بہت مشکل ہے کیونکہ دلوں کو محبّت اور خلوص سے ہی جیتا جا سکتا ہے۔ دلوں کے حکمران بننے کے لیے عاجزی درکار ہے۔

غصے سے نہ صرف دوسروں پر بُرا اثر پڑتا ہے بلکہ یہ آپ کی اپنی ذہنی، جسمانی اور جذباتی صحت کے لیے بھی مُضر ہے۔ غصے سے ہی انسان خصوصاً ذہنی تناؤ کا شکار ہوتا ہے۔ بلند فشارِ خون (ہائی بلڈ پریشر) ہمارے معاشرے میں بڑھتی بیماری ہے۔ اس کے جنم لینے کی بنیادی وجہ غصہ ہی ہے۔ اس کے علاوہ دردِ شقیقہ (آدھے سر کا سر درد) بھی عموماً غصے کی وجہ سے جنم لیتا ہے۔ غصہ دل کے دورے (ہارٹ اٹیک) اور دماغ کے دورے (برین ہیمبرج) کی بھی ایک وجہ بن سکتا ہے۔ اکثر ذہنی و نفسیاتی بیماریاں (Psycho Problems) بھی اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ تو کچھ دلائل ناقص عقل کے تھے، اب غصے کو احکام ربانی اور احادیث نبوی ﷺ کی نظر سے دیکھتے اور رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ایسی رہنمائی جو قرآن اور حدیث کے علاوہ کہیں مل بھی نہیں سکتی، بس اس ضمن میں "**سمعنا واطعنا والا**" رویہ درکار ہے۔

کچھ دن قبل سورہ الِ عمران کی آیت نظروں سے گزری جس میں متقین کی صفات بیان کر کے انھیں جنت کی ضمانت دی گئی تھی۔ جان کر حیرانی ہوئی کہ غصہ پی جانے والوں کو بھی بشارت جنت دی گئی:

ترجمہ: دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمھارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے۔ جس کی وسعت زمین اور آسمان جیسی ہے اور وہ ان خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی، جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، خواہ بدحال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں، ایسے ہی نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔" (الِ عمران ۱۳۴-۱۳۳)

غصہ پی جانا جنتیوں کی خوبی ہے۔ مگر اگلا حکم یا اگلی لازم و ملزوم خوبی یہ ہے کہ غصہ پی جانے کے بعد معاف بھی کیا جائے۔ کیونکہ جب تک ہم لوگوں کے قصور معاف نہیں کرتے، کینہ بڑھتا جاتا ہے۔ اور یہی احسان ہے جسے کرنے والوں سے اللہ محبّت کرتا ہے۔ اگر ہم رب کے محبوب بندے بننا چاہتے تو ہمیں چاہیے کہ احسان کا رویہ اختیار کریں۔ صرف غصہ پی جانے اور اندر ہی اندر گھلنے کا کوئی فائدہ نہیں، پوری آیت پر عمل کرنا ضروری ہے۔ لوگوں کو معاف کر دینے سے ذہنی اور روحانی، دونوں سکون ملتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: اور اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ تمھارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔" (سورہ الانفال۔۴۶)

معاف کرنے کا اجر

واقعہ افک میں ایک صحابی ملوث ہو گئے۔ بعد ازاں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے چاہا کہ ان کا روزینہ بند کر

دوسرے سے زیادہ اپنا بُرا حال

غصے کا وبال

بہادری یہ نہیں کہ تم کسی کو پچھاڑ دو بلکہ یہ ہے کہ اپنے آپ پر قابو رکھو (حدیث نبویﷺ)

زوجہ سیف اللہ
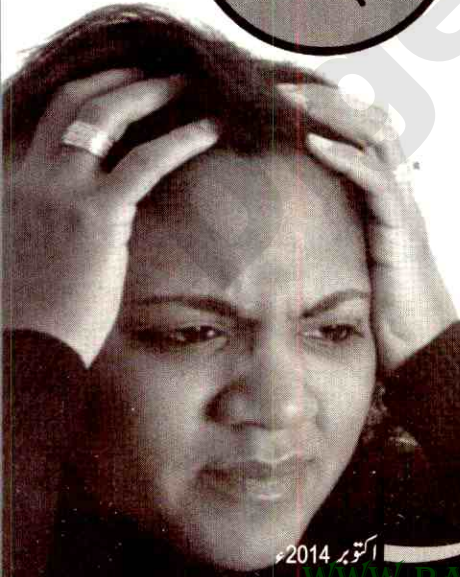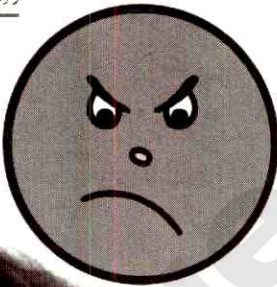
ایک بار نبی پاکﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ تشریف فرما تھے کہ وہاں ایک بدو آ گیا۔ وہ خلیفہ اول کو بُرا بھلا کہتا رہا، یہاں تک کہ انھیں گالیاں دینے لگا۔ لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ خاموش رہے۔ یہ دیکھ کر نبی پاکﷺ مسکرانے لگے۔ لیکن جب اس نے حد کر دی تو حضرت ابو بکرؓ نے ایک دو باتوں کا جواب دے دیا۔ اس پر نبی پاکﷺ استادہ ہوئے اور گھر چلے آئے۔

یہ دیکھ کر حضرت ابو بکر صدیقؓ حیران ہوئے۔ انھوں نے چند دن بعد آپﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر فرمایا ”جب وہ بدو مجھ غلط غلط بولتا رہا، آپﷺ مسکراتے رہے۔ لیکن جب میں کچھ بولا، تو آپﷺ ناراضی سے تشریف لے آئے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“

اللہ کے نبی پاکﷺ نے جواب دیا ”جب تک وہ بولتا رہا، فرشتے تمھاری طرف سے جواب دیتے رہے اور جب تم نے ناراضگی کا اظہار کیا، تو شیطان آ گیا جس کے ساتھ میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔“

برداشت نہ کرنے، اخلاق کی پستی میں گرنے اور ضبط نفس کھو دینے کو غصہ کہتے ہیں۔ کسی کی بے عزتی کرنے اور اپنا وقار کھو دینے کا نام بھی غصہ ہے۔

یہ درست ہے کہ بعض اوقات بلاوجہ غصہ آ جاتا ہے۔ لیکن اکثر ہم اپنی کسی ذاتی پریشانی، بُرے تجربے اور اپنی خفت کا غصہ اپنے ماتحت پر نکالتے ہیں۔ غصہ کرنے کی ایک بڑی وجہ منفی سوچ بھی ہے۔ جب ہم کسی کے بارے میں منفی سوچ رکھیں تو وہ بھی ہمیں برہم ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بعض اوقات کسی کو نیچا دکھانے، کسی پر رعب ڈالنے اور اپنے آپ کو برتر ثابت کرنے کے لیے حسد بھی ہمیں غصہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

''کیوں دیے ہیں؟'' بڑھیا نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کنڈکٹر بولا ''ترس کھا کر دے دیے۔''

بڑھیا اٹھنے کی کوشش میں نشست پر گر پڑی۔ ''کس پر ترس کھایا؟'' وہ چلاّئی۔

''تم پر اور کس پر'' کنڈکٹر بولا۔

بڑھیا بھڑک کر اٹھی اور چیخ کر بولی۔ ''ذرا میں بھی تو دیکھوں اپنے ترس کھانے والے کو.....''

گوری چٹی عورت فوراً پرس بند کر کے بڑھیا کی طرف دیکھنے لگی۔

بڑھیا چھت کی راڈ اور سیٹوں کی پشتوں کے سہارے سفید پوش بزرگ کی طرف بڑھتے ہوئے بولنے لگی۔ ''یہ چھے پیسے کیا تیری جیب میں بہت کود رہے تھے کہ تُو نے ترس کھا کر میری طرف یوں پھینک دیے جیسے کتے کی طرف ہڈی پھینکی جاتی ہے۔''

''لیجیے! یہ ہے بھلائی کا زمانہ۔'' کوئی بولا۔

سفید پوش بزرگ کا رنگ مٹی کا سا ہو گیا اور بڑھیا بولتی رہی۔ ''ارے سخی داتا کہیں کے، تُو مجھ پر ترس کھاتا ہے، جس نے ساٹھ سال دھرتی میں بیج ڈال کر پودوں کے اگنے اور خوشے پکنے کے انتظار میں کاٹ دیے، تو ان ہاتھوں پر چھے پیسے رکھ رہا ہے۔ جنھوں نے اتنی مٹی کھودی ہے کہ اکٹھی ہو تو پہاڑ بن جائے اور تو مجھ پر ترس کھاتا ہے؟ کیا تیری کوئی ماں بہن نہیں، ترس کھانے کے لیے؟ کوئی اندھا فقیر نہیں ملا تجھے رستے میں؟ شرم نہیں آتی تجھے ایک کسان عورت پر ترس کھاتے ہوئے!''

پھر وہ کنڈکٹر کی طرف پلٹی۔ ''یہ چھے پیسے جو اس نے مجھ پر تھوکے ہیں، اسے واپس کر اور مجھے یہیں اتار دے۔ میں پیدل چلی جاؤں گی۔ مجھے پیدل چلنا آتا ہے۔''

بڑھیا خاموش ہو گئی۔ بس میں صرف گاڑی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

بس ایک لمحہ بعد اسٹینڈ پر رکی تو بڑھیا سیڑھیوں کی پروا کیے بغیر دروازے میں سے لٹکی اور باہر سڑک پر ڈھیر ہو گئی۔ پھر اٹھی، کپڑے جھاڑے اور ناقابلِ یقین تیزی سے والٹن کی طرف جانے لگی۔

بس میں سے آوازیں آئیں۔ ''عجیب وحشی عورت ہے!''

◆◆◆

سنگین غلطی

شروع میں دنیا میں تھوڑے ہی ملک تھے۔ لوگ خاصی امن کی زندگی بسر کرتے تھے۔ پندرھویں صدی میں کولمبس نے امریکا دریافت کر لیا۔ اس کے بارے میں دو نظریے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا قصور نہیں، وہ ہندوستان کو یعنی ہمیں دریافت کرنا چاہتا تھا، غلطی سے امریکا دریافت کر بیٹھا۔ اس نظریے کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ ہم ابھی تک دریافت نہیں ہو پائے۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ نہیں کولمبس نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی یعنی امریکا دریافت کیا۔ بہرحال یہ غلطی بھی تھی تو بہت سنگین غلطی تھی۔ کولمبس خود تو مر گیا اس کا خمیازہ ہم بھگت رہے ہیں۔

(ابن انشاء کی اردو کی آخری کتاب سے اقتباس)

بیٹے کی گھر والی ہے کہ تجھے میری جیبوں کا حال بھی معلوم ہے۔ سر میں کوڑی کا پھول لگا لینے سے بھیجے میں عقل نہیں بھر جاتی بی بی رانی۔"

پھول والی عورت دانت کچکچا کر رہ گئی۔

گوری چٹی عورت نے بڑھیا کا بازو پکڑ کر اسے سیٹ کی طرف کھینچا اور وہ بیٹھ گئی۔

"عجیب وحشی عورت ہے۔" کسی کی آواز آئی۔

"یہ کون بولا؟" بڑھیا نے پلٹ کر بس کے آخری سرے تک نظریں دوڑائیں۔ ذرا ایک بار پھر بولے کہ میں اس کی زبان یوں لمبی لمبی کھینچ کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں۔"

گوری چٹی عورت کو جُھرجُھری سی آ گئی۔ وہ یوں سمٹ گئی جیسے بڑھیا نے سچ مچ لٹکتی اور خون ٹپکاتی ہوئی زبان اس کے اوپر سے گزار کھڑکی سے باہر اچھال دی ہے۔

"دیکھ مائی۔" کنڈکٹر جو اس دوران میں دوسرے مسافروں کے ٹکٹ کاٹنے لگا تھا، اس کے قریب آ کر سختی سے بولا۔ "ساڑھے پانچ آنے دے گی یا نہیں؟"

"تُو تو تھانیداروں کی طرح بولنے لگا لڑکے۔ کہہ جو رہی ہوں کہ چونی یہ رہی، باقی رہے چھے پیسے تو وہ میں تجھے پہنچا دوں گی۔ کل والٹن میں آ کر بیٹھ جاؤں گی، اور تو آئے گا، تو تیرے ہاتھ پر رکھ دوں گی۔ کھرے کر لینا۔"

"لو اور سنو۔" کنڈکٹر نے سب مسافروں سے فریاد کی۔

پھر یکا یک اس کے تنے ہوئے تیور ڈھیلے پڑنے لگے۔ وہ ایک سفید پوش بزرگ کے پاس جا کر جھک گیا۔

بڑھیا نے انگلی سے گوری چٹی عورت کا گھٹنا بجایا۔ جب عورت نے اس کی طرف دیکھا تو بڑھیا بولی۔ "دیکھ رہی ہو؟"

عورت نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "لگتے تو مائی ساڑھے پانچ ہی آنے ہیں، پھر یہ بس سرکاری ہے۔ یہ لڑکا سرکار کا نوکر ہے۔ ایک آنہ بھی کسی سے کم لے تو اپنی جیب سے ڈالے گا یا نوکری چھوٹ جائے گی غریب کی۔"

"ہے ہے بے چارا۔" بڑھیا نے پیار سے کنڈکٹر کی طرف دیکھا۔ "میں نے تو عمر بھر اپنا رزق اپنے ہاتھوں سے کمایا ہے۔ میں کیوں کسی کے رزق پر ڈاکہ ڈالوں چھے پیسوں کے پیچھے! مجھے کیا خبر تھی، وہ غوثا ہی دھوکا دے گیا۔ پر اسے کیا پتا، وہ بیچارا بھی تو ریڑھے پر لاہور آتا ہے، اب کیا کروں؟"

"یوں کرو۔" گوری چٹی عورت نے اپنا پرس کھولتے ہوئے کہا۔ "میں تمھیں......"

اتنے میں کنڈکٹر آ گیا۔ بڑھیا بولی۔ "بھئی لڑکے! مجھے تو خبر نہیں تھی کہ اس طرح......"

کنڈکٹر بولا "بس مائی! اب سارا حساب ٹھیک ہو گیا ہے۔ تجھے والٹن پر ہی اتاروں گا۔"

بڑھیا کھل گئی۔ "میں نے کہا تھا نا کہ تیری ماں نے تجھے بسم اللہ پڑھ کے جنا ہے۔ پر یہ بتا لڑکے...... چونی ہی پر راضی ہو جانا تھا تو ساڑھے پانچ آنے کا جھگڑا کیوں چلایا؟"

"حساب تو مائی ساڑھے پانچ ہی آنے سے پورا ہوا ہے۔" کنڈکٹر بولا۔

"تو میں چھ پیسے کہاں سے لاؤں؟" بڑھیا پھر اداس ہو گئی۔

"چھے پیسے مجھے مل چکے۔" وہ بولا۔ "اس چودھری نے دیے ہیں۔" کنڈکٹر نے سفید پوش بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

انگلیوں کی پوروں میں تھام کر کنڈکٹر کی طرف بڑھا دی۔

کنڈکٹر بولا ''نہیں مائی۔ چار آنے نہیں، ساڑھے پانچ آنے لگتے ہیں۔''

بڑھیا کی آواز تیز ہوگئی۔ ''ساری دنیا کے چار آنے لگتے ہیں، میرے ساڑھے پانچ آنے لگ گئے؟ کیوں؟ ہڈیوں کا تو ڈھیر ہوں۔ میرا بوجھ ہی کیا، لے یہ چار آنے۔''

''عجیب مصیبت ہے۔'' کنڈکٹر کے تیور بدل گئے اور وہ مسافروں کو سامعین بنا کر تقریر کرنے لگا۔ ''میں تو کہتا ہوں کہ سرکار کو قانون پاس کرنا چاہیے کہ جو پرائمری پاس نہ ہو، بس میں سفر نہیں کرے۔ اب اس مائی کو دیکھیے، میو ہسپتال کے اسٹینڈ سے بس میں بیٹھی ہے۔ والٹن جا رہی ہے، کہتی ہے والٹن جاؤں گی اور ساڑھے پانچ آنے بھی نہیں دوں گی۔ اس لیے کہ کسی نے اسے چار آنے ہی دیے ہیں۔''

بڑھیا بچے کی طرح بولی ''کسی نے کیوں؟ اپنے غوثے نے دیے ہیں۔'

کنڈکٹر نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے اور اب کے مسکراتے ہوئے کہا ''اس لیے کہ غوثے نے اسے صرف چار آنے دیے ہیں۔ اب اسے کون سمجھائے کہ بس سرکار کی ہے غوثے کی نہیں، غوثے کی ہوتی تو وہ تم سے چار ہی آنے لیتا۔''

''کیوں، وہ کیوں لیتا چار آنے؟'' بڑھیا بولی ''وہ تو میرا بھتیجا لگتا ہے۔ کماؤ ہے، روز اپنے ریڑھے پر دودھ لاتا ہے۔ آج میں اسی کے ریڑھے پر تو آئی تھی۔ چار آنے چھوڑ چار پیسے بھی نہیں مانگے۔ اس کی مجال تھی جو مانگتا؟ گود میں کھلایا ہے۔ اس کی سالی یہاں ہسپتال میں بیمار پڑی ہے۔ میں نے کہا چلو، اسے دیکھ لوں۔ اسی ریڑھے پر واپس آ جاؤں گی۔ مگر آج لڑکی کی حالت اچھی نہیں، اس لیے غوثا وہیں رہ گیا اور مجھے یہ چونی دے کر کہا ہے کہ گھر چلی جاؤں۔ اب تم ساڑھے پانچ آنے مانگ رہے ہو۔ یوں کرو مجھے کسی چار آنے والی جگہ پر بٹھا دو۔ میں کسان عورت ہوں، نیچے بھی بیٹھ جاؤں گی۔ تم کہیں اس نرم نرم گدّے کے تو ساڑھے پانچ آنے نہیں مانگ رہے؟''

''نہیں مائی۔'' کنڈکٹر نے تنگ آ کر کہا۔ ''سب سواریوں کے نیچے ایسے ہی گدّے ہیں۔''

بڑھیا نے حیران ہو کر پوچھا ''تو پھر میں کیا کروں؟''

ڈیڑھ آنہ اور نکالو۔'' کنڈکٹر بولا۔

''کہاں سے نکالوں؟'' وہ بولی۔ ''بتا جو رہی ہوں کہ گھر سے خالی ہاتھ آئی تھی۔ یہ چونی بھی غوثے نے دی ہے۔ کل اسے لوٹا دوں گی۔''

کنڈکٹر صاف طور سے اپنا غصہ ضبط کر رہا تھا۔ بولا ''مجھے تو آج ہی چاہیے مائی، میں ٹکٹ کاٹ چکا ہوں۔ جلدی کرو۔ بہت سے اسٹینڈ گزر چکے ہیں، کئی سواریاں جمع ہوگئی ہیں۔ سب کے ٹکٹ کاٹنے ہیں۔ کوئی چیکر آ گیا تو جان آفت میں کر دے گا۔ بھئی لوگو! خدا کے لیے اس مائی کو سمجھاؤ۔ جانا والٹن ہے اور کرایہ ماڈل ٹاؤن کا بھی نہیں دے رہی۔ پھر کہتی ہے، چونی سے زیادہ ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔''

بڑھیا کی اگلی نشست پر بالوں میں پھول سجا کر بیٹھی ہوئی عورت نے پلٹ کر کہا۔ ''ایسیوں کی تلاشی لینی چاہیے۔ اس کی جیبیں اکنیوں دونیوں سے بھری ہوتی ہیں۔''

بڑھیا اس کے سر کے اوپر چیخ اٹھی۔ ''کیا تو میرے

بڑھیا بولی ”عجیب بات ہے۔ باہر تم دیکھتی ہو اور چکر مجھے آجاتا ہے۔“

عورت ذرا سی مسکرائی۔

”سنو!“ بڑھیا نے کہا۔

”کیا ہے؟“ عورت نے پھر سے بھویں سکیڑ لیں۔

”لیڈی ہو؟“ بڑھیا نے سوال کیا۔

”کیا؟“ عورت نے جیسے برا مان کر پوچھا۔

”ہسپتال کی لیڈی ہو؟“ بڑھیا نے وضاحت کی۔

”نہیں!“ عورت بولی۔

”تو پھر کیا ہو؟“

”کیا مطلب؟“

”کیا کرتی ہو؟“

”کچھ نہیں کرتی۔“

”کچھ تو ضرور کرتی ہو۔“ بڑھیا نے دائیں بائیں سر ہلا کر کہا۔

”ٹکٹ لے لو مائی۔“ بڑھیا کو سر کے اوپر سے کنڈکٹر کی آواز سنائی دی۔

”دے دو۔“ بڑھیا نے چادر کا پلّو مٹھی سے آزاد کر دیا۔

”کہاں جاؤ گی؟“ کنڈکٹر نے پوچھا۔

”گھر جاؤں گی بیٹا۔“ بڑھیا بڑے پیار سے بولی۔

کنڈکٹر زور سے ہنسا۔ گوری چٹی عورت بھی بڑھیا کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ کنڈکٹر نے جیسے تمام مسافروں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”میں نے مائی سے پوچھا کہاں جاؤ گی؟ بولی، گھر جاؤں گی۔“

اب کے مسافروں نے بھی کنڈکٹر کے قہقہے کا ساتھ دیا۔

کنڈکٹر بہت محظوظ ہوا تھا۔ اس لیے بڑھیا کو بڑی نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا ”گھر تو سب لوگ جائیں گے مائی۔ یہ بتاؤ، میں کہاں کا ٹکٹ کاٹوں؟“

”والٹن کا۔“ وہ بولی۔ ”میرا گھر والٹن کے پار ایک گاؤں میں ہے۔“

مسکراتے ہوئے کنڈکٹر نے ٹکٹ کاٹ کر بڑھیا کو دیا اور بولا ”ساڑھے پانچ آنے دے دو۔“

”ساڑھے پانچ آنے؟“ بڑھیا نے چادر کے پلّو کی گرہ کھولتے ہوئے پوچھا۔ ”ساڑھے پانچ آنے کیسے؟ غوثا کہہ رہا تھا صرف چار آنے لگتے ہیں۔ اس نے تو مجھے صرف یہ گول مول چونّی ہی دی ہے۔“ اس نے چونّی دو

غزل

بہت غم دے چکا یہ دَور مجھ کو
بھلا دے گا یہ کیا اب اور مجھ کو

چلو کچھ تو دیا ہے مسکرا کر
خوشی اُن کو، جفا و جور مجھ کو

سُلگتا ہوں اگربتی کی مانند
جلائیں دوستوں کے طَور مجھ کو

ملی جتنی بھی دولت، بانٹ دی ہے
خدایا دے محبّت اور مجھ کو

ملیں اس شہر میں کتنے شناسا
کہیں ملتا نہیں لاہور مجھ کو

میں کیوں دو لخت ہو کر رہ گیا ہوں
کبھی آیا نہ کرنا غور مجھ کو

کیا بیکل انہی سوچوں نے کاشرؔ
کہاں لے جائے گا یہ دَور مجھ کو

سلیم کاشر

اتنے میں بس آ گئی۔ کنڈکٹر نے کھڑاک سے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "پہلے عورتیں۔"

ہجوم کے وسط میں پہنچی ہوئی بڑھیا رک گئی۔ ہجوم نے بڑی ناگواری سے دو حصوں میں بٹ کر اسے راستہ دے دیا۔

بڑھیا نے سر پر سے چادر اٹھا بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر چادر کے ایک پلّو کو مٹھی میں پکڑ لیا اور دو رویہ ہجوم پر فاتحانہ نظر ڈال کر کنڈکٹر سے کہنے لگی "تیری ماں نے تجھے بسم اللہ پڑھ کر جنا ہے لڑکے۔"

"چل آ بھی مائی۔" کنڈکٹر نے شرما کر کہا۔

"رستہ تو میں ویسے بھی بنا لیتی۔ آدھا تو بنا بھی لیا تھا پر تُو نے جو بات کہی وہ ہزار روپے کی ہے۔" بڑھیا نے بس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ دوسری کو ہاتھ سے جکڑ کر یوں بیٹھ گئی جیسے بہت بلندی پر پہنچ کے چکرا گئی ہو۔ کنڈکٹر نے اسے تھام لیا۔ ہاتھ پکڑ کے اٹھایا اور دروازے کے سامنے ہی ایک نشست پر بٹھا دیا۔ پھر سب لوگ بس میں بھر دیے گئے، اس ریلے میں کنڈکٹر بس کے پرلے سرے پر پہنچ گیا۔

بڑھیا نے ذرا سا اٹھ کر، نشست کو ہاتھ سے ایک دو بار دبایا اور آہستہ سے بولی۔ "بڑی نرم ہے۔" بس چلی تو اس نے دائیں طرف دیکھا۔ ایک گوری چٹی عورت، دودھیا رنگ کی صاف ستھری ساڑھی پہنے، سنہرے فریم کی عینک لگائے، سفید چمڑے کا پرس ہاتھ میں لیے بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہی تھی۔

بڑھیا نے بھی گردن کو ذرا سا کھینچ کر باہر دیکھا۔ ہر چیز پیچھے کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ وہ آنکھیں مل کر سامنے دیکھنے لگی، پل بھر بعد اس نے گوری چٹی عورت کی طرف دوبارہ دیکھا۔ پھر اپنی انگشتِ شہادت اس کے گھٹنے پر بجا دی۔ عورت نے بھویں سکیڑ کر بڑھیا کی طرف دیکھا تو وہ بولی "چکر آ جائے گا، باہر مت دیکھو۔"

گوری چٹی عورت مسکرائی اور بولی "مجھے چکر نہیں آتا۔"

"مجھے تو آ گیا تھا۔" بڑھیا بولی۔

"تمھیں آ گیا تھا تو باہر مت دیکھو، مجھے نہیں آتا، اس لیے میں تو دیکھوں گی۔" عورت نے کہا۔

بڑھیا نے پوچھا "کیا تم باہر نہیں دیکھو گی تو تمھیں چکر آ جائے گا؟"

عورت کی مسکراہٹ یکا یک غائب ہو گئی اور وہ باہر دیکھنے لگی۔

بڑھیا کو اگلی سیٹ پر ایک عورت کا صرف سر نظر آ رہا تھا۔ اس نے بالوں میں زرد رنگ کا ایک پھول سجا رکھا تھا۔ بڑھیا نے ذرا سا آگے جھک کر پھول کو غور سے دیکھا۔ پھر انگلی سے اپنی ہمسائی کا گھٹنا بجا کر بڑی رازداری سے بولی "یہ پھول اصلی ہے کہ نقلی؟"

"نقلی ہے!" عورت بولی۔

"نقلی ہے تو سونے کا ہو گا۔" بڑھیا نے رائے ظاہر کی۔

"رنگ تو سونے جیسا ہے" عورت نے کہا۔

"مجھے تو اصلی لگتا ہے۔ کسی جھاڑی سے اتارا ہے۔" بڑھیا بولی۔

"تو پھر اصلی ہو گا۔" عورت نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

بڑھیا نے ذرا سا حیران ہو کر گوری چٹی عورت کی طرف دیکھا اور پھر انگلی سے اس کا گھٹنا بجا دیا۔

"کیا ہے؟" عورت نے بھویں سکیڑ کر پوچھا۔

اردو کے یادگار افسانوں میں سے ایک

وحشی

زندگی بھر اپنے ہاتھوں سے کمائی کرنے والی بُڑھیا کا ماجرا، اس نے مصیبت کے وقت بھی احسان لینا گوارا نہیں کیا

احمد ندیم قاسمی

''آ گئی۔'' ہجوم میں سے کوئی بولا اور سب لوگ یوں دو دو قدم آگے بڑھ گئے جیسے، دو دو قدم پیچھے کھڑے رہتے تو کسی غار میں گر جاتے۔

''کتنے نمبر والی ہے؟'' ہجوم کے پیچھے سے ایک بڑھیا نے پوچھا۔

''پانچ نمبر ہے۔'' بڑھیا کے عقب سے ایک پنواڑی بولا۔

بڑھیا ہڑ بڑا کر ہجوم کو چیرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی کہ سب لوگ بس کے بجائے اسے دیکھنے لگے۔

''عجیب وحشی عورت ہے۔'' ایک شخص نے اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے کہا۔''لے کے جبڑا توڑ ڈالا۔''

''اے پاگل ہوئی ہے کیا؟'' ایک اور نے فریاد کی۔

ضرورت نہیں رہے گی۔

امریکا کا مخمصہ

یہ بات قابل ذکر ہے کہ روس پچھلے تین چار سال کے دوران بہ سرعت عالمی قوت بن کر ابھرا ہے۔ اس کی حیات نو نے خصوصاً امریکی ماہرین عسکریات کو حیران کر ڈالا۔ وہ تو یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ مستقبل میں چین سے ٹکراؤ ہوگا۔ گو روس اہم عالمی طاقت تھا، لیکن وہ اب اسے امریکی مفادات کے لیے خطرہ نہیں سمجھتے تھے۔ جب ''ریچھ'' انگڑائی لیتا اٹھ کھڑا ہوا، تو امریکی افواج میں کھلبلی مچ گئی کیوں کہ پچھلے ۲۵ سال کے دوران امریکی عسکری پالیسیوں میں انقلابی تبدیلیاں آچکیں۔

سرد جنگ کے دوران امریکی حکومت کا زور اس امر پہ رہا کہ بہت بڑی افواج تیار کی جائیں تاکہ وہ روایتی جنگ لڑسکیں۔ چناں چہ ہمہ اقسام کے ٹینک، توپیں، لڑاکا طیارے اور بمبار جہاز ایجاد ہوئے۔

لیکن جب سویت یونین کا انہدام ہوا اور روسی افواج کی قوت قصہ پارینہ بن گئی، تو امریکی عسکری پالیسیاں بھی تبدیل ہونے لگیں۔ اب چھوٹے چھوٹے دستوں کی ضروریات کے مطابق ہتھیار ایجاد ہونے لگے۔ وسیع و عریض روایتی جنگ کا تصور متروک ہوگیا۔ یہ دستے چھاپہ ماروں کے مانند دشمن پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ جب کہ فضا سے لڑاکا طیارے نہیں، ڈرون دشمنوں کو نشانہ بناتے ہیں۔

لیکن روس اب دوبارہ ایک بڑی عسکری قوت بن کر سامنے آرہا ہے۔ روسی میزائیل تو آناً فاناً امریکی ڈرون کو مار گرائیں گے۔ اسی لیے کئی امریکی ماہرین عسکریات کا کہنا ہے کہ آج امریکی افواج روسیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اسی لیے امریکا براہ راست روس سے ٹکر لینے سے گریز کررہا ہے۔

فی الحال یوکرائن میں خانہ جنگی جاری رہی اور یوکرائنی فوج مشرقی یوکرائن میں روسی نژاد باشندوں کا قتل عام کرنے لگی، تو روس یقیناً اپنی فوج وہاں بھیج دے گا۔ اگر یوکرائن اور روس کے مابین جنگ ہوئی، تو یہ یورپ اور امریکا تک بھی پھیل سکتی ہے...... گویا یورپ ایک لحاظ سے خوفناک جنگ کے دہانے پر کھڑا ہے۔ ◆◆◆

کام کی باتیں

☆۔ بلاشبہ بہترین انسان وہی ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے۔ (القرآن)

☆۔ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔ (الحدیث)

☆۔ انسان ضعیف ہے، تعجب ہے کہ وہ کیونکر خدائے قوی کی نافرمانی کرتا ہے۔ (حضرت ابوبکرؓ صدیق)

☆۔ دنیا کا ہر جاندار باشندہ ظالم ہے مگر انسان سے بڑا کوئی ظالم نہیں۔ (ابوالعلامعری)

☆۔ انسان ہوکر ایسے کام نہ کرو جن سے انسانیت کا دامن داغدار ہوجائے۔ (ثوبان ثوری)

☆۔ جو شخص ایک مرتبہ بھی فضول بات کرتا ہے، وہ اپنی عقل کا ایک حصہ ختم کردیتا ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆۔ جو بات دشمن سے پوشیدہ رکھنی ہے وہ دوست سے بھی نہ کہہ، ممکن ہے وہ کسی دن تیرا دشمن بن جائے۔ (لقمان حکیم)

☆۔ جو بات تم سے پوچھی نہ جائے اس کا جواب نہ دو اور نہ اس بات کو پوچھو جس سے تمھارا واسطہ نہیں۔ (لقمان حکیم)

☆۔ بات کو پہلے دیر تک سوچو، پھر منہ سے نکالو اور پھر اس پر عمل کرو۔ (افلاطون) (انتخاب: محمد اویس، دیپالپور)

تجارتی ساتھی ہے۔

لیکن فی الوقت اہم یورپی ممالک مثلاً جرمنی، فرانس، اٹلی، اسپین، سویڈن، ناروے، برطانیہ وغیرہ امریکا کی گرفت میں ہیں۔ روس اُن کے گرد بنا جال توڑنے کی کوشش کر رہا ہے، مگر اسے خاص کامیابی نہیں ملی۔ بلکہ پوری یونین اسی پر تجارتی پابندیاں لگانا چاہتی ہے۔

دراصل امریکیوں نے اہم یورپی قوتوں کو یہ لارا لگا رکھا ہے کہ ماضی کی طرح روس چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگیا، تو وہاں کے بے پناہ قدرتی وسائل (کوئلہ، تیل، گیس، صاف پانی، جنگلات، معدنیات) پر وہ قابض ہوسکتی ہیں۔ انھی وسائل پر قبضے کی خاطر نپولین اور ہٹلر روس میں داخل ہوئے مگر ناکام رہے۔

ڈالر کی وجہ سے بھی یورپی ممالک مجبور ہیں کہ امریکا پر انحصار کریں۔ ڈالر عالمی کرنسی بن چکا، اسی لیے عام سا سبز کاغذ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ مگر روسی برکس ممالک (چین، برازیل، جنوبی افریقہ اور بھارت) کی مدد سے اس کرنسی کی دنیا پر حکمرانی ختم کرنا چاہتے ہیں۔

درج بالا ممالک کی سعی ہے کہ وہ آئی ایم ایف اور عالمی بینک کے نمونے پر اپنے مالیاتی ادارے تشکیل دیں۔ یہ پانچوں ممالک رفتہ رفتہ ڈالر کی حکمرانی کو چیلنج کر رہے ہیں۔ اور اس عمل میں چین و روس کی شراکت داری سب سے اہم ہے۔

چین اس وقت امریکا کے بعد دنیا کی سب سے بڑی معاشی قوت ہے۔ چناں چہ وہ مغرب کی عائد کردہ پابندیوں کے شکار روس کو سنبھلنے میں مدد دے سکتا ہے۔ چینی اسی لیے روس سے قربت چاہتے ہیں کہ ملک میں موجود قدرتی وسائل سے استفادہ کر سکیں۔ ویسے بھی عنقریب روسی گیس چین پہنچنے لگے گی۔ یوں روس ایشیائی ممالک کو گیس و تیل فروخت کر کے یورپی طاقتوں کو بھی آنکھیں دکھا سکتا ہے کہ پھر اسے ان کی

روسی فیڈریشن کا حصہ بن گیا۔

اس دوران مشرقی اور جنوبی یوکرائن کے کئی علاقوں میں مسلح روسی نژاد گروہوں نے سرکاری عمارت پر قبضہ کر لیا۔ یہ گروہ علاقے کو روسی فیڈریشن کا حصہ بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یوکرائنی فوج نے ان پر دھاوا بول دیا۔ اس پر روس بھی پیچھے نہیں رہا اور باغیوں کو اسلحہ اور رقم بھجوانے لگا۔ پورے یوکرائن میں خانہ جنگی شروع ہوگئی جو تادم تحریر جاری ہے۔اب تک اس خانہ جنگی میں تقریباً تین ہزار افراد مارے جا چکے۔

روس علیحدہ خطہ ہے

کئی پاکستانی روس کو یورپ کا حصہ سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ روس جغرافیائی، تہذیبی، تاریخی، ثقافتی، معاشی، لسانی اور معاشرتی طور پر ایک علیحدہ خطہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے بیشتر ادوار میں یورپی طاقتوں اور روس کے مابین ٹکراؤ رہا ہے۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں فرانس اور برطانیہ روس سے ''گریٹ گیم'' کھیلتے رہے۔ نپولین بونا پارٹ نے روس پر حملہ کیا مگر منہ کی کھائی۔ برطانوی بھی روس کے پچھواڑے، افغانستان جا پہنچے مگر غیور افغانوں نے انگریزوں کو اپنے ہاں ٹکنے نہیں دیا۔

بیسویں صدی میں بھی روسی برطانیہ، جرمنی اور امریکا سے نبرد آزما رہے۔ کئی عشروں تک کرۂ ارض روسیوں اور امریکیوں کی سرد جنگ کا نشانہ بنا رہا۔ روسی قیادت سویت یونین کو نہ سنبھال پائی، چناں چہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

اس زوال کے بعد روس میں مغرب کے حمایتی حکمران سامنے آئے جن میں بورس یلسن قابل ذکر ہے۔ یوں روس مغرب کے لیے پہلے کی طرح خطرہ نہیں رہا۔ بلکہ محسوس کیا جانے لگا کہ عالم اسلام اور مغرب کا ٹکراؤ ہو رہا ہے۔

مدھم سروں میں روس اور امریکا کا دوبارہ ٹکراؤ ۲۰۰۱ء میں شروع ہوا جب خردماغ سمجھے جانے والے امریکی صدر، بش برسراقتدار آئے۔ اُدھر روس میں ایک قوم پرست رہنما، ولادیمیر پیوٹن حکومت سنبھال چکا تھا۔ جب صدر بش نے روسی حکومت کو کمزور و بے بس سمجھ کر اپنے اشاروں میں چلانا چاہا، تو ٹکراؤ ناگزیر ہوگیا۔

۲۰۰۷ء میں جب ''امید'' اور ''تبدیلی'' کے ہرکارے، بارک اوباما نے حکومت سنبھالی تو کچھ عرصہ دونوں ممالک دوستی کی پینگیں جھولتے رہے۔ مگر امریکیوں کے غرور اور تکبّر نے صدر پیوٹن کو پھر دُور کر دیا۔ رواں برس کے اوائل میں یوکرائن میں پس پردہ غلبہ پانے کی روسی اور امریکی لڑائی نے اختلافات کو باقاعدہ ''دوسری سرد جنگ'' میں تبدیل کر ڈالا۔

گیس کی پائپ لائنیں

روس کے لیے یہ ضروری ہے کہ یوکرائن میں اس کی حمایتی حکومت برسراقتدار رہے۔ وجہ گیس پائپ لائنیں ہیں۔ یورپ اپنی ''۲۰ فیصد'' قدرتی گیس روس سے خریدتا ہے اور اس گیس کی آدھی سے زیادہ مقدار یوکرائن سے گزرتی ہے۔ خود یوکرائن کی ۶۰ فیصد گیس بھی روس سے آتی ہے۔

اس وقت روسی صدر پیوٹن بڑے تدبر اور مہارت سے اپنی چالیں چل رہے ہیں۔ ان کی سعی ہے کہ یورپ کو ناراض کیے بغیر امریکیوں سے پنگا لیا جائے۔ وہ یورپ کو ساتھ ملا کر دنیا میں امریکی چودھراہٹ کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رہے، روس یورپی یونین کا تیسرا بڑا

کرۂ ارض پر جنم لیتی اگلی گریٹ گیم

مفادات کا ٹکراؤ ایک بار پھر ایٹمی قوتوں، روس اور امریکا کو آمنے سامنے لے آیا......

چشم کشا تحقیقی رپورٹ

رضوان علی شاہ

یہ نومبر ۲۰۱۳ء کی بات ہے، مغربی یوکرائن میں وزیراعظم وکٹر یانوکوویچ کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے۔ مظاہرین کی خواہش تھی کہ حکومت یورپی یونین سے دوستانہ معاہدہ کر لے۔ مگر صدر یانوکوویچ روس کے ساتھ معاشی، معاشرتی اور سیاسی تعلّقات بڑھانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی یوکرائن میں حمایتی حکومت کے حق میں مظاہرے کرنے لگے۔

یاد رہے، مشرقی اور جنوبی یوکرائن میں روسی نژاد باشندوں کی کثیر تعداد آباد ہے۔ یہ روسی یوکرائن روس سے تعلّقات بڑھانے کے خواہش مند ہیں۔ جب کہ مغربی اور شمالی یوکرائن میں خالص یوکرائنی باشندے بستے ہیں۔ یہ روس اور روسیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ یورپی یونین سے تعلّقات رکھنا چاہتے ہیں۔

مغربی یوکرائن میں ہونے والے مظاہرے جلد ہی پُرتشدد ہو گئے۔ پولیس اور مظاہرین کے تصادم میں کئی لوگ مارے گئے۔ آخر ۲۲؍فروری ۲۰۱۴ء کو صدر وکٹر نے اقتدار چھوڑ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ مظاہرین کو امریکا اور یورپی یونین کی مالی امداد حاصل تھی۔

۲۸؍فروری کو روسی فوج یوکرائنی علاقے، کریمیا میں داخل ہوگئی۔ مارچ میں کریمین عوام نے ایک ریفرنڈم میں اپنے خطے کی آزادی کا اعلان کیا۔ اسی دن کریمیا

دیکھنا ہے تو دیکھ عبرت کے لیے

انگریزوں کا جاسوس

جس نے سلطنت مغلیہ کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا

اعجاز شیخ

شمارہ اگست میں جناب محمد صادق قریشی کا مضمون، ”نواب سراج الدولہ کے آخری ایام“ پڑھنے کا موقع ملا ۔یوں ملت اسلامیہ کے سیاہ بخت غدار، میر جعفر کے متعلق قارئین کو حقائق سے آگاہی ملی۔ برصغیر میں ایسے ہی ننگ دین، ننگ وطن، ضمیر فروشوں نے ملت اسلامیہ کو جو نقصان پہنچایا اس کے اثرات سے ہم ابھی تک نکل نہیں پائے۔

آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا مقرب خاص، رجب علی بھی ایسا ہی سیاہ کردار ہے۔ بے شمار نوازشوں کے باوجود اسی نے میجر ہڈسن سے ساز باز کر کے بہادر شاہ ظفر کو ہمایوں کے قلعے سے گرفتار کروایا تھا۔ قلعہ ہمایوں کی بابت مشہور ہے کہ اگر کوئی تنہا شخص اس قلعے کے اندر راستہ بھول جائے تو مشکل سے باہر آسکے گا۔ قلعے کی بھول بھلیاں کچھ اس طرز سے بنائی گئی ہیں کہ گائیڈ کے بغیر پورا قلعہ دیکھنا عام آدمی کے لیے محال ہے۔ اس قلعے میں پناہ لیے ہوئے مغلوں کے آخری بادشاہ، بہادر شاہ ظفر کو یقین کامل تھا کہ اس کے وفادار ساتھی دغا نہیں دیں گے جن میں سید رجب علی بھی تھا۔ مگر سیاہ بخت رجب علی نے جہاں بادشاہ ظفر کو یقین دلایا کہ سبھی لوگ اس کا آخر دم تک ساتھ دیں گے، وہیں در پردہ میجر ہڈسن سے ساز باز کر کے بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کروایا۔ اس ”خدمت“ کے عوض سید رجب علی نے تلونڈی (ہندوستان) کی جاگیر، دیگر مراعات اور ایک لاکھ روپے وصول کیے۔

سید رجب علی نے قلعے میں محبوس بہادر شاہ ظفر کو یقین دلایا تھا کہ انگریز انھیں کچھ نہیں کہیں گے چنانچہ بادشاہ نے اس یقین دہانی پر دروازے کھولنے کا حکم دیا۔ جوں ہی قلعے کا دروازہ کھلا، میجر ہڈسن اور اس کے دستے نے بادشاہ اور اس کے شہزادوں کو گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے وقت بادشاہ وقت کی آنکھوں میں تیرتی نمی، سامنے کھڑے رجب علی سے شکوہ کر رہی تھی کہ تو نے آج ہندوستان کو چند سکوں کے عوض انگریزوں کی غلامی میں دے دیا، کاش مجھے یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا۔ گرفتاری کے بعد عوام کا ہجوم مظلوموں کے پیچھے واویلا کرتا جا رہا تھا کہ اچانک فائر کی آواز سے بھگدڑ مچ گئی۔ دراصل تھوڑی دیر آگے جا کر میجر ہڈسن نے دو شہزادوں پہ فائر کر کے انھیں شہید کر دیا۔

ہمارے ایک بزرگ بتایا کرتے تھے کہ قیام پاکستان کے بعد لارنس گارڈن کے مشرقی جانب ایک وسیع و عریض رہائش گاہ واقع تھی۔ وہاں ایک مخلوط الحواس شخص پہروں باہر بیٹھا لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا۔ اگر کوئی پوچھ لیتا کہ جناب کا تعارف کیا ہے، تو قہقہہ لگا کر کہتا ”میں سید رجب علی شاہ کا آخری وارث ہوں۔“ یہ حقیقت ہے کہ غدارانِ وطن کو کبھی آرام و سکون کی موت نصیب نہیں ہوئی۔

مزارات پر بھی کئی چکر لگائے۔ ہر بار گھر آکر ثریا سے ایک ہی بات پوچھتا ''کیا امی جان آگئی ہیں؟''

ثریا نفی میں جواب دیتی تو اُس کا دل بیٹھ جاتا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے۔ کئی دنوں کی محنت ذرا بھی رنگ نہ لائی۔ یہ ثریا ہی تھی جو اُسے برابر حوصلہ دیے جا رہی تھی ورنہ وہ تو کب کا بستر پر گر چکا ہوتا۔

ایسوسی ایشن کے انتخابات نے اُس کی پریشانی میں اور اضافہ کر دیا۔ وہ اپنے پینل کا زبردست حمایتی تھا لیکن اس بار انتخابی مہم میں من نہیں لگا۔ سب دوست زبردستی اُسے ساتھ لیے پھرتے رہے۔ اسی دوران شہزاد نے آکر اُسے بتایا کہ وہ کینیڈا جا رہا ہے کیوں کہ وہاں اس کی ملازمت پکی ہو چکی۔

''کینیڈا کب جا رہے ہو؟'' وہ دلگیر لہجے میں بولا۔

''کل صبح پرواز ہے، آپ کے دفتر گیا تھا، پتا چلا آپ یہاں ہیں تو یہیں چلا آیا۔'' شہزاد نے بتایا۔ ''آپ سے ملے بغیر نہیں جا سکتا تھا''۔

محمد حسین نے اُسے گلے لگایا اور یہ سوچ کر رو پڑا کہ اگر کبھی وہ پردیس میں گیا، تو ماں کے بغیر اُس کا کیا حال ہو گا۔

شہزاد نے اسے حوصلہ دیا اور کہا ''میں نے آپ کو ہمیشہ بڑا بھائی سمجھا ہے۔ میں آپ سے مسلسل رابطہ رکھوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں''۔

محمد حسین نے اُسے ڈھیر ساری دعائیں دیں اور رخصت کیا۔ وہ دونوں بچپن کے دوست تھے۔ ساتھ کھیل کر ہی نوجوان ہوئے۔

الیکشن کے بعد وہ سیدھا گھر پہنچا اور بستر پہ ڈھے گیا۔ ثریا اُسے دیکھ کر کانپ اٹھی۔ محمد حسین کے انگ انگ سے مایوسی جھلک رہی تھی۔ مایوسی کا یہ دورہ اُسے ذہنی و جسمانی طور پر بہت کاری ضرب لگا سکتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے ماں جی اور اپنے مجازی خدا کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔

☆

''امی جان! آپ آگئیں!'' ثریا صحن میں کھڑی چلانے لگی۔

محمد حسین ایک جھٹکے سے اُٹھا اور ننگے پاؤں باہر دوڑا۔ ماں کو دیکھتے ہی ایسے پُرسکون ہو گیا جیسے کڑی دھوپ میں طویل سفر کرنے والا مسافر ٹھنڈی چھاؤں میں پہنچ گیا ہو۔

''امی جان! آپ کہاں چلی گئی تھیں؟'' وہ ماں سے بغل گیر ہوتے ہوئے بچوں کی طرح سسکیاں لینے لگا۔

''ارے میں امی کی طرف چلی گئی تھی۔'' وہ اُسے پچکارتے ہوئے بولیں۔

''اماں جان کے پاس۔۔۔؟'' وہ اپنی نانی کو پیار سے اماں جان کہتا تھا۔

''ہاں۔'' وہ بہت پرسکون تھیں۔

''لیکن آپ تو سیہون شریف جا رہی تھیں درگاہ پر۔۔۔؟'' محمد حسین نے حیرانی سے پوچھا۔ اسے اور ثریا دونوں کو خیال ہی نہیں آیا تھا کہ ماں جی اپنی والدہ کے پاس راولپنڈی بھی جا سکتی ہیں۔

''جا تو وہیں رہی تھی، راستے میں ایک بزرگ مل گئے، بہت شفیق انسان تھے۔ میں نے انہیں اپنے مقصد سے آگاہ کیا تو پوچھنے لگے، تمہاری ماں زندہ ہیں؟ میں نے ہاں میں جواب دیا تو فرمانے لگے کہ تم جا کر ان کی خدمت کرو، یہی سب سے بڑی عبادت اور نیکی ہے۔ میں اگلے اسٹیشن پر ہی گاڑی سے اتری اور امی جان کی خدمت میں پہنچ گئی۔''

حسین سکتے سے باہر آیا۔ پھٹی ہوئی آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھا اور اُس کے کندھے پہ سر رکھ کر بچوں کی طرح بلکنے لگا۔ ثریا اسے تسلّی دیتی رہی۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔

''ثریا! امی جان نے یہ کیا کر ڈالا؟'' محمد حسین نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہوا کیا ہے؟'' ثریا نے پوچھا۔

''امی جان نے میری رقم قبول نہیں کی اور یہ بیگ بھی''۔ محمد حسین کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

''شاید وہ بھول گئی ہوں۔ آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ وہ سیہون شریف گئی ہیں۔ آپ بھی وہیں جائیںاور انہیں گھر لے آئیں''۔ ثریا نے اُسے دوبارہ مشورہ دیا۔

''ہاں، میں کل ہی سیہون شریف جاتا ہوں''۔ وہ ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

محمد حسین نے سیہون شریف میں سب سے پہلے حضرت لال شہباز قلندرؒ کے مزار پر فاتحہ خوانی کی اور ماں جی کی صحت یابی کی دعا مانگی۔ پھر وہ خواتین والے حصے کی طرف چلا گیا۔ وہ خواتین میں ماں جی کو تلاش کرنے لگا۔ کئی ایک خواتین کو تصویر دکھا کر ان کے بارے میں پوچھا بھی لیکن ماں جی نہ ملیں۔ وہ دو دن تک خانقاہ میں ٹھہرا ماں جی کو تلاش کرتا رہا۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ یہاں نہیں تو مزید پریشان ہوگیا۔ وہ وہاں سے کوٹ مٹھن پہنچا اور خواجہ غلام فریدؒ کے مزار پر حاضری دی۔ وہاں سے سلطان باہوؒ کی درگاہ کا رخ کیا۔ حضرت سلطان باہوؒ کے مزار پر اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگی اور اولیائے اللہ کے شہر ملتان کی طرف عازم سفر ہوا۔

وہ ملتان میں کئی دن مقیم رہا۔ حضرت بہاء الدین زکریاؒ، حضرت شمس تبریزؒ، حضرت شاہ رکن عالمؒ اور دیگر مزارات پر صبح شام حاضری دیتا رہا۔ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتا اور لوگوں کو ماں جی کی تصویر دکھا کر اُن کے بارے میں پوچھتا رہا۔ مگر کہیں سے ان کا سراغ نہ ملا۔ دھیرے دھیرے مایوسی اس کے دل و دماغ پر چھا رہی تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اِسی شش و پنج میں وہ لاہور چلا آیا۔

گھر پہنچا تو ثریا نے اس کے چہرے سے پریشانی بھانپ لی۔ سلیقہ شعار خاتون نے کوئی سوال نہ پوچھا۔ چپکے سے باورچی خانے میں گئی اور کافی تیار کر کے لے آئی۔ کافی پیتے ہوئے وہ خود ہی بول پڑا ''امی جان کہیں نہیں ملیں''۔

محمد حسین نے ایک ایک خانقاہ اور درگاہ کے سفر کی پوری تفصیل سے ثریا کو آگاہ کیا۔ وہ اچھے سامع کی طرح خاموشی سے سنتی رہی۔ محمد حسین خاموش ہوا تو ثریا نے لب کشائی کی ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ امی جان بالکل خیریت سے ہوں گی۔ شاید وہ کسی اور درگاہ پر چلی گئی ہوں۔ ہم لاہور میں بھی تمام مزارات پر جاکر انھیں تلاش کریں گے''۔

ڈرائنگ روم میں تھوڑی دیر سکوت کا راج رہا۔

''ہم اخبارات اور ٹی وی پر ماں جی کی گمشدگی کا اشتہار بھی دے سکتے ہیں''۔ ثریا نے محمد حسین کو مشورہ دیا۔

''کچھ شرم کرو، امی جان گم نہیں ہوئیں''۔ وہ بھڑک اٹھا۔ ''لوگ کیا کہیں گے؟''

ثریا خاموش رہی۔ ڈرائنگ روم میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔

محمد حسین نے پھر حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت میاں میر سرکارؒ، میراں حسین زنجانی سرکارؒ، حضرت مہاجر مکیؒ، مادھو لال حسینؒ اور حضرت شاہ جمال سرکارؒ کے

سے واپس آتے ہوئے چیک کیش کرالاؤں گا تا کہ آپ کو کسی قسم کی مالی پریشانی نہ ہو''۔

اگلے دن محمد حسین نے ماں کے لیے بنک سے ایک لاکھ روپے نکلوائے، ایک خوب صورت بیگ خرید کر اس میں رقم ڈالی اور اسے ماں کے حوالے کر دیا۔

محمد حسین نے دفتر جاتے ہوئے ماں سے الوداعی ملاقات کی اور کہا ''امی جان! میں ڈرائیور بھیج دوں گا۔ وہ آپ کو ریل پر بٹھا آئے گا''۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں، میں رکشے سے چلی جاؤں گی۔'' ماں نے آنسو بھری آنکھوں سے بیٹے کو دیکھا، اس کی پیشانی چوم لی اور بولی۔ ''بیٹا! آپ ناشتا تو ٹھیک سے کر لیتے۔''

''امی جان! میں ناشتا کر چکا۔ آپ رکشے کے ذریعے نہ جائیں، میں گاڑی بھجوا دوں گا''۔ محمد حسین نے بیوی ثریا کو مخاطب کرتے ہوئے ہدایت کی ''امی جان کی ضرورت کی ہر شے ان کے بیگ میں رکھ دیں''۔

فرمانبردار بیوی نے اثبات میں سر ہلایا۔

محمد حسین دفتر کے لیے نکلا تو ماں بہو کو بانہوں میں لیتے ہوئے بولیں ''بیٹی! اب محمد حسین خدا کے بعد تمھارے سپرد ہے۔ اُسے میری کمی محسوس نہ ہونے دینا''۔

''جی بہتر امی جان!'' بہو نے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

ماں کو گئے چند دن ہی ہوئے تھے کہ محمد حسین کو گھر کاٹ کھانے لگا۔ ماں کی کمی اسے شدت سے محسوس ہونے لگی۔ اگرچہ سلیقہ مند بیوی ہر طرح سے اپنے مجازی خدا کا خیال رکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن محمد حسین کو گھر میں وحشت سی محسوس ہوتی۔ اُسے لگتا جیسے ظالم سماج کا سورج نصف النہار پر ہے اور وہ غربت کے تپتے آنگن میں ننگے پاؤں کھڑا ہے۔ بیٹے کی حالت اُس مسافر کی سی تھی جو صحرا میں قافلے سے بچھڑ گیا ہو۔

دفتر، گھر، ایسوسی ایشن اور کلب کہیں بھی اس کا دل نہ لگتا۔ وہ دوستوں میں ہوتے ہوئے بھی غائب رہتا۔ سب دوست اُس کے چہرے سے عیاں پریشانی دیکھ رہے تھے لیکن وہ کسی کو کچھ نہ بتاتا۔ ایک دو نے اُسے ٹٹولنے کی کوشش بھی کی لیکن اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

☆

''آپ ماں جی کے بغیر اتنے پریشان کیوں ہیں؟'' ثریا نے اُس کا کوٹ اتارتے ہوئے دریافت کر ہی لیا۔

''امی جان کے بغیر میرا دل نہیں لگ رہا۔ مجھے ان کے بغیر رہنے کی عادت نہیں ہے''۔ وہ روہانسا ہو گیا۔

''آپ ماں جی کے پاس چلے جائیے''۔

ثریا کی تجویز پر وہ کھل اُٹھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے ماں جی کے کمرے کی طرف بھاگا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر وہی بیگ پڑا تھا جو وہ ماں جی کے لیے خرید کر لایا تھا۔ اُسے دھچکا لگا۔ ذہن میں یہ خیال کوندا ''کیا ماں جی نے میرا تحفہ قبول نہیں کیا؟''

اُس نے دھڑکتے دل کے ساتھ بیگ کو کھولا تو حیرت سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بیگ میں وہ رقم بھی پوری پڑی تھی جو وہ ماں جی کے لیے بنک سے نکلوا کے لایا تھا۔ پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ ثریا اس کے پیچھے آئی تھی۔ وہ محمد حسین کو جھٹکے سے پیچھے ہٹتے دیکھ چکی تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں کبھی ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے بیگ اور کبھی حیرتوں کے سمندر میں گم محمد حسین کو دیکھ رہی تھی۔

اُس نے ڈرتے ڈرتے شوہر کے کندھے پہ ہاتھ رکھا جس پر سکتہ طاری تھا۔ ثریا نے کندھے کو ہلایا تو محمد

آغوش مادر میں ملنے والی نایاب

ٹھنڈی چھاؤں

ایک فرماں بردار بیٹے کا روح پرور قصہ، ماں کی عارضی جدائی نے اسے ماں کی ممتا کے انمول جذبے سے آشنا کرا دیا

رائے صابر حسین

ماں نے بیٹے کی پیشانی پر بوسہ دیا اور سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''بیٹا! آپ اب بڑے ہو چکے۔ گھر میں چاند سی بہو آ چکی۔ آپ کا کاروبار بھی ترقی کی جانب گامزن ہے۔ میں اپنے تمام فرائض ادا کر چکی، اب میں اپنے رب کو خوش کرنا چاہتی ہوں۔''

''امی جان! آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟ آپ نے اب تک میرے لیے جو کچھ کیا ہے، کیا اللہ تعالیٰ اس سے خوش نہیں ہوئے ہوں گے؟'' بیٹے نے پریشان ہو کر ماں کی طرف دیکھا اور بولا۔

''بیٹا! میں مزاروں اور درگاہوں کی زیارت کرنا چاہتی ہوں۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں گی۔ یہ خواہش بہت سال سے من میں پل رہی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اسے پورا کر لوں۔'' ماں نے بیٹے کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

''ٹھیک ہے امی جان''۔ بیٹے نے ماں کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''میں کل دفتر

ہے۔ جو لوگ خطبہ سننے بے کار بیٹھے رہتے اور اٹھ کر گلے ملنے میں دیر کرتے ہیں، زندگی کی دوڑ میں بھی پیچھے رہ جاتے ہیں۔

دوست احباب اور رشتہ داروں کو عید نامے بھی بھیجنے ضروری ہیں۔ یہ انگریزی میں چھپے ہونے چاہئیں تاکہ صرف دیکھے نہ جائیں، پڑھے بھی جائیں۔ اب بھی کہیں کہیں اردو میں چھپے ہوئے عید کارڈ مل جاتے ہیں جن پر مصافحے کی تصویر کندہ ہوتی ہے۔ بعض تصویروں میں ایک ہاتھ زنانہ اور ایک ہاتھ مردانہ ہوتا ہے۔

دبتا ہوا ہاتھ صاف پہچانا جاتا ہے کہ مرد کا ہے۔ زنانہ ہاتھ سے بالادستی ٹپکتی دکھائی دیتی ہے۔ چند عید ناموں میں معانقوں کے مناظر بھی دکھائے جاتے ہیں۔ یہ صرف مردانہ معانقوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ تگ و دو کی جائے تو ایسے عید کارڈ بھی مل جاتے ہیں جن پر بھانجی کی طرف سے ممانی کے نام، بھتیجے کی طرف سے چچا اور تایا اور ابا کے نام، دیور کی طرف سے بھاوج کے نام باضابطہ خطوط چھپے ہوئے ہیں۔ ان عید ناموں پر جو بھی تحریر ہو، ان سے تعلقات خراب ہونے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اس لیے ان کے بھیجنے میں کوئی حرج نہیں۔

عید کے دن فلم دیکھنے سے بینائی اور صحت کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اگر سینما پر ہاؤس فل کی تختی لگی ہو، جو ہمیشہ لگی رہتی ہے، تو سمجھ لینا چاہیے کہ ٹکٹ مل جائے گا۔

عید کے دن سنا ہے روٹھے ہوئے بھی من جاتے ہیں، اس لیے ذرا احتاط رہنا چاہیے۔

دماغ کو جانیے

دماغ، نخاع اور اعصاب ''اعضائے نفسانیہ'' میں شامل ہیں۔ اس نظام کو نظام عصبی بھی کہتے ہیں۔ ان میں دماغ عضو رئیس ہے۔ وہ حس و حرکت اور عقل و تمیز کا مرکز ہے۔ اسی لیے دماغ جسم کا سلطان ہے۔ مرد کے دماغ کا اوسط وزن تقریباً ۴۹ اونس ہوتا ہے۔ عورت کے دماغ کا اوسط وزن ۴۴ء۵ اونس ہے۔ مادر زاد پاگل افراد کا دماغ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کا اوسط وزن تقریباً ۲۲ اونس رہتا ہے۔ انسان قدرت کاملہ کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اعلیٰ دماغی طاقتوں کے سبب دیگر سب حیوانات کو اپنا فرمانبردار بنالیتا ہے۔ انسانی دماغ انسان کے بالغ ہونے کے بعد تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اور پھر ہر دس سال میں یہ صلاحیتوں کے اعتبار سے کم ہوتا جاتا ہے۔ انسانی دماغ عقل و شعور، گفتار، حرکتی افعال، حسی افعال، حرکات منعکسہ حافظہ، جذبات، احساسات، واھمہ (Hallucination) کے علاوہ بے شمار افعال پر مشتمل ہے جو مختلف اعصاب سے سرزد ہوتے ہیں۔ انہی اعضا کی کمزوری کے باعث صرع، اختناق الرحم، بے خوابی (سہر)، نسیان، صداع، دوار (Vertigo)، رعشہ، تشنج، فالج، دیوانگی اور لقوہ وغیرہ جیسے بے شمار امراض وارد ہوتے ہیں۔ دماغ میں جتنے بڑے نشیب و فراز ہوں، جیسے اخروٹ کے مغز میں ہوتے ہیں، یہ اتنی عقل مندی کی علامت ہے۔ دماغ چار حصوں اور تین جھلیوں پہ مشتمل ہوتا ہے۔ دماغ پیچیدہ حسوں کا مالک ہے۔ دماغ کو مغز اخروٹ، مغز پستہ، شہد اور آکسیجن سے بھرا پتلا خون بہت پسند ہے۔ اس سے یہ طویل عرصہ تک خوشگوار موڈ میں رہتا ہے۔ دماغ کی فطری صلاحیت کا پتا نہیں چلتا۔ لیکن حقیقتاً دماغ میں پوشیدہ طور پر ایسے نیورون موجود ہیں جو دماغ میں اچانک خیال سے پہلے ہی بڑے پیمانے پر مصروف عمل ہو جاتے ہیں۔

کے لیے ملاحظہ ہو لٹریچر، مطبوعہ بہ دورانِ غالب صدی)

اگر پاجامے کی جگہ پتلون پہننی مقصود ہو (کیوں کہ یہی دستورِ زمانہ ہے) تو اُسے اچھی طرح بند کرنے کا معقول انتظام کر لینا چاہیے (پہلے سے اس کی جانچ ضروری ہے) کہ بعض زپیں ناقص ہوتی ہیں۔ اب جو پتلونیں بن رہی ہیں، عید کی نماز کے لیے مفید ہیں۔ آج سے دو چار سال پہلے جن پتلونوں کا رواج تھا، وہ عرصۂ حیات کی طرح تنگ تھیں۔ ان میں آدمی مشکل ہی داخل ہو پاتا تھا۔ وہ پتلونیں نہ صرف صاحب پتلون کو تکلیف میں مبتلا کرتی تھیں بلکہ ناظرین کو بھی تشویش پہنچاتیں (کپڑا لیکن اتنا ہی خرچ ہوتا۔) موجودہ پتلونوں کے اندر ایک ہی نہیں کئی پاجامے پہنے جا سکتے ہیں۔ ان میں آدمی کے پھلنے پھولنے کی کافی گنجائش ہے...... دنیا کتنی وسیع ہو گئی ہے۔

عید کے دن جوتوں پر خواہ وہ نئے ہی کیوں نہ ہوں، پالش ضرور کرا لینی چاہیے۔ اس سے آدمی کی رفتار ٹھیک ہو جاتی ہے۔ چلنے میں ٹھوکریں بھی نہیں لگتیں۔ کیوں کہ آدمی بار بار جوتوں پر نظر ڈال لیتا اور جی ہی جی میں خوش ہوتا ہے کہ زندگی کتنی چمک دار ہو چکی۔ جوتا وہی اچھا جو چلنے میں بولا کرے۔ اس طرح کے جوتے ٹرانسسٹر کا کام دیتے ہیں کہ بیک گراؤنڈ موسیقی کا لطف آتا ہے۔

کاٹنے والا جوتا بھی دل چسپ ہوتا ہے۔ گھر واپس آ کر ایک ہی بینڈ ایڈ لگا لیا جائے، تو زیادہ لوگ متوجہ ہوتے ہیں۔ کچھ جوتے قد بڑا کرنے کے کام آتے ہیں۔ ان جوتوں کی مدد سے آدمی بآسانی اونٹ پر چڑھ سکتا ہے۔ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جب آپ یہ جوتے نہ پہنے ہوں تو کوئی بھی آپ کو پہچان نہیں سکتا، دیکھنے والوں کو جھک کر دیکھنا پڑتا ہے۔

عید کے دن آنکھوں میں سرمہ ضرور لگانا چاہیے۔ سرمہ گھر سے باہر جا کر کسی ایسے شخص سے لگوانا چاہیے جس کے پاس چھڑی کے سائز کی سلائی ہو! اس سلائی سے سرمہ لگایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں میں کوئی چیز لگی ہے۔ شاعر کہتا ہے:

دنبالہ سے سرمہ کے دھواں ہیں تیری آنکھیں
کہہ بیٹھیں نہ کچھ سیفِ زباں ہیں تیری آنکھیں

ماہرین سے سرمہ لگوانے کے بعد بغیر کسی کی مدد کے راستہ نہیں چلنا چاہیے۔ خاص طور پر جب سڑک کی ایک سے دوسری سمت جانا ہو تو اپنے بچے کی انگلی تھام لینی چاہیے۔ ماہرین نہایت ہی کم داموں میں اتنی کثیر مقدار میں آنکھوں میں ڈالتے ہیں کہ بڑی سے بڑی آنکھوں کو تنگیٔ داماں کا گلہ ہونے لگتا ہے۔ تب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ (اسی وجہ سے اکثر لوگ نماز میں جب وقتِ قیام آئے سجدے میں گر جاتے ہیں۔)

دونوں کانوں میں عطر کے پھاہے بھی رکھنے چاہئیں (تکبّر کی آواز سننی ضروری بھی کیا ہے۔) عطر پہلے سونگھا جاتا ہے، اب اسے کانوں سے سننا پڑتا ہے، یا ممکن ہے امتدادِ زمانہ سے آدمی کی قوت شامہ کانوں میں منتقل ہو گئی ہو۔ کپڑوں پر بھی عطر لگانے میں کوئی حرج نہیں۔ کُرتے پر عطر کا سرخ یا زرد گول سا نشان اچھا دکھائی دیتا ہے۔ یہ نشان جتنا پھیلا ہو گا آدمی اتنا ہی پھولے پھلے گا۔

عطر آن است کہ خود ببوید نہ آنکہ عطار بگوید
(عطر وہ ہے جو کہ خود خوشبو دے اور بولے نہ کہ عطار بتائے)

عید کی نماز میں سب سے اہم حصہ گلے ملنے کا ہوتا ہے۔ گلے ملتے وقت سامنے والے شخص کے تن و توش کا جائزہ لے لیا جائے تو گھر واپس ہونے کا امکان رہتا

دیکھا جاتا، اسے گھر کی چھت پر چڑھ کر دیکھنا چاہیے۔ (گھر کی چھت کی غرض و غایت ہی یہ ہے۔ وہاں سے پتنگ بھی اڑائی جا سکتی ہے کہ اس سے زیادہ غیر محفوظ جگہ اور کوئی نہیں ہوتی۔ گھر کی چھت اسے بھی کہتے ہیں جو بارش میں ٹپکا کرے۔ جو چھتیں بہت اچھی ہوں وہ بغیر بارش کے بھی ٹپکا کرتی ہیں۔) چاند دیکھنے کی مساعیٔ جمیلہ ہر قسم کی چھت پر کی جا سکتی ہے۔ چاند کو نظر آنا ہے تو وہ ضرور دکھائی دے گا، خواہ آدمی کتنی ہی ناقص اور کمزور چھت پر کیوں نہ دم سادھے کھڑا ہو۔

پہلے زمانے میں چاند دیکھنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے تھے۔ کئی گھڑ سوار شہر سے باہر جا کر پہاڑیوں پر چڑھ جاتے اور اسے دیکھنے کی سعادت بزورِ بازو حاصل کرتے۔ بے چارے گھوڑوں کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ وہ ایسے بے وقت پہاڑوں پر کیوں لے جائے گئے ہیں۔ انھیں کیا معلوم کہ آدمی ہارس پاور کہاں کہاں استعمال کرتا ہے۔

جب کافی وقت گزر جاتا اور لوگ یہ سمجھ لیتے کہ اب گھڑ سوار کل شام ہی کو واپس ہوں گے تو یہ حضرات اچانک واپس آ کر یہ خبر پھیلاتے کہ وہ چاند دیکھ آئے ہیں۔ آج بھی جب کہ سائنس نے اپنی دانست میں کافی ترقی کر لی ہے اور آدمی خود چاند پر ہو آیا ہے، پہلی تاریخ کے اس مختصر سے چاند کے اعمال و افعال میں کوئی سیاسی یا سماجی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ عید کا چاند اب بھی اسی طرح ڈھونڈنا پڑتا ہے جیسے روزگار ڈھونڈا جا رہا ہو۔

عید کے چاند کو مقررہ تاریخ پر نمودار ہونے میں خاص دِقّت تو نہیں ہوتی۔ اس کی مجبوری صرف اتنی ہے کہ عید سے دو مہینے پہلے ہی اس کے نمودار ہونے کی تاریخ بدل دی جاتی ہے۔ عید کا چاند اس لیے یا تو ایک دن پہلے یا ایک دن بعد ہوا کرتا ہے۔

اگر کسی شخص کو بینائی کے کسی نقص کی وجہ سے عید کا چاند نظر آجائے تو ایک اچھے شہری کی حیثیت سے اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ سب کو سلام کرے (ہو سکے تو مصافحہ بھی کر لے۔)

عید کا چاند اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو کسی الیکشن میں کامیاب ہو جانے کے بعد چار سال تک بالکل دکھائی نہ دے۔ لیکن یہ غلط ہے کیوں کہ عید کا چاند سال میں دو مرتبہ دکھائی دیتا ہی ہے۔

مبادیاتِ عید

عید سے چند دن پیشتر ضرور غسل کر لینا چاہیے۔ عید کے دن سب کو نہانے کا کہاں موقع ملتا ہے؟ اس دن تھوڑا بھی نہایا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ گنگا نہائی۔

رات ہی میں پاجامے میں ازار بند ڈال لیں۔ ازار بند کے بغیر پاجامہ ترقی اور بہبودی کی اس اسکیم کی طرح ہوتا ہے جسے رُوبہ عمل لایا جائے تو مفادِ عامہ خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ یہ ازار بند جسے کمر بند بھی کہا جاتا ہے، متحرک ڈائری کا کام دے سکتا ہے، اور اس میں ضروری باتیں درج کی جا سکتی ہیں۔ کمر بند کی ہر گرہ میں کوئی نہ کوئی مسئلہ بندھ سکتا ہے۔ یوں کمر بند پاجامے کو اپنے صحیح مقام پر برقرار رکھنے کے علاوہ یادداشت کو بھی برقرار رکھتا ہے۔

لیکن اس میں گنجائش سے زیادہ گرہیں نہیں لگانی چاہئیں، یادداشت ساتھ نہ دے گی۔ جو کمر بند کُرتے یا شیروانی کے دامن سے آگے نکل جائے، ناظرین کی بصارت پر گراں گزرتا ہے۔ کمر بند کو اس سہرے کی طرح اپنی حد میں رہنا چاہیے جس کا ذکر غالب نے جواں بخت کے سہرے کے پانچویں یا چھٹے شعر میں کیا ہے۔ (حوالے

مزاح پارہ

جلد آرہا ہے آپ کے گھر

عید کا چاند

سائنس کی ترقی کے باوجود جسے دیکھنے کے لیے اب بھی ہر سال بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں

یوسف ناظم
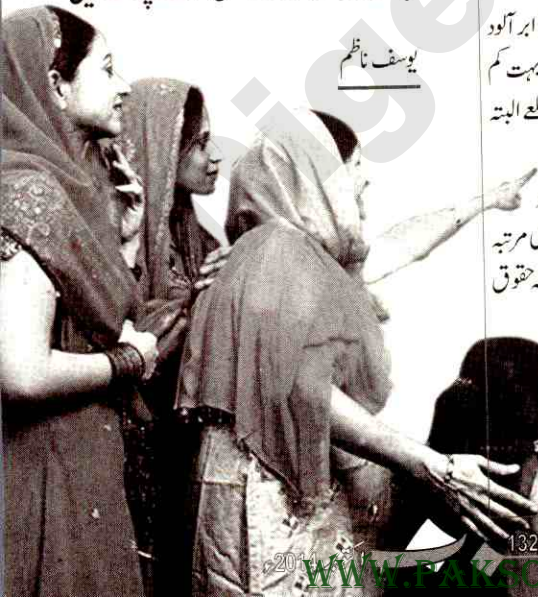
یوں تو ہر مہینے نیا چاند نکلتا ہے، لیکن اس میں وہ بات نہیں ہوتی جو عید کے چاند میں ہوا کرتی ہے۔عید کا چاند نظام شمسی میں ''چیف گیسٹ'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اپنی ناز کی اور باریکی کے لیے بہت مشہور ہے۔ اس سے زیادہ باریک چیز آسمان پر ڈھونڈنا مشکل ہے۔ یہ چاند اس قرض دار شخص کی طرح ہے جو چھپ کر نکلتا اور نظر آنے سے پہلے چھپ جاتا ہے۔

دیکھنے میں بڑا خوب صورت ہوتا ہے۔شرط یہ ہے کہ نظر آنا چاہیے۔ چاند رات میں لوگ انگلی کے اشارے سے بتاتے ہیں کہ چاند اس طرف ہے۔ وہ اونچے درخت کی سیدھی جانب، ذرا نیچے کی طرف، وہ ٹہنی نظر آرہی ہے، بس اسی کے قریب! یہ سن کر سمجھ لینا چاہیے کہ چاند وہاں نہیں۔ ہر وہ شخص جسے چاند نظر نہیں آتا، دوسرے شخص کو ضرور دکھاتا ہے۔ یہ صرف انگشت نمائی ہے۔

عید کے چاند والے دن دوپہر ہی سے مطلع ابر آلود ہو جاتا ہے (جہاں تک مطلع کا تعلق ہے، یہ بہت کم مواقع پر صاف ہوا کرتا ہے۔ چند غزلوں کے مطلع البتہ صاف معلوم ہوتے ہیں) اس لیے عید کے چاند کو لوگ اب دیکھتے نہیں، صرف ٹی وی پر اس کی خبر سن لیتے ہیں۔ ٹی وی پر سنے ہوئے چاند کا بھی وہی مرتبہ ہے جو چشم دید چاند کا ہوا کرتا ہے۔ (زمانہ مساویانہ حقوق کا ہے)

عید کا چاند زمین پر کھڑے ہو کر نہیں

بکری کا گوشت

اس کا مزاج گرم تر ہے۔ یہ طاقت بخش ہے۔ خون پیدا کرتا ہے۔ تپ دق، سنگرہنی اور کمزوری میں اس کی یخنی مفید ہے۔ ماہرین طب کی تحقیق کے مطابق بکری یا بکرے کے جس عضو کا گوشت کھایا جائے، انسان کے اسی عضو کو طاقت حاصل ہوتی ہے۔ ایک روایت میں حضورﷺ نے فرمایا ''بکری کی نگہداشت اچھی طرح کرو اور اس سے تکلیف دور کرتے رہو اس لیے کہ یہ جنت کے چوپایوں میں سے ہے۔'' بکری کے ایک سالہ بچے کا گوشت معتدل ہوتا ہے۔ عرق النساء کے درد میں جس کو لنگڑی کا درد بھی کہتے ہیں، علاج کے لیے حضورﷺ نے فرمایا: ''بکری کے پچھلے حصہ (پٹھ) کو پکا کر گلا دیا جائے۔ اس کا شوربا تین دن تک پلایا جائے۔''

گائے کا گوشت

اس کا مزاج سرد خشک ہوتا ہے۔ دیر ہضم ہے۔ سوداوی خون پیدا کرتا ہے۔ محنتی اور جفاکش لوگوں کے لیے مناسب گوشت ہے۔ مگر اسے زیادہ استعمال کرنے سے سوداوی امراض جیسے برص، خارش، درد، جذام، فیل پا، کینسر، مسلسل بخاروں کا آنا چمٹ سکتے ہیں۔ یہ سب بیماریاں اس شخص کو لاحق ہوتی ہیں جو گائے کے گوشت کا عادی نہ ہو اور نہ اس کی مضرت مرچ سیاہ، لہسن اور دارچینی و سونٹھ وغیرہ سے دور کرے۔ اطبا نے گائے کے گوشت کو دیر ہضم اور خراب خون پیدا کرنے والا بتایا ہے۔ اپھارے کی شکایت لاحق کرتا ہے۔ سوداوی امراض، گٹھیا اور عرق النساء میں نقصان دہ ہے۔

اونٹ کا گوشت

حضورﷺ اور اصحابہ اکرام نے سفر اور حضر میں اس کو استعمال کیا ہے۔ اونٹ کے بچے کا گوشت لذیذ ترین، پاکیزہ اور مقوی ہے۔ بھیڑ کے گوشت کی طرح جو اس کا عادی ہو، اسے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتا۔ شہروں کے لوگ بہت کم پسند کرتے ہیں۔ مگر دیہات اور صحرائی علاقوں میں اس کا کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ یہ گوشت دیر سے ہضم ہونے کے باعث سودا پیدا کرتا ہے۔

☆

یہ یاد رکھیے کہ جس گوشت کا خون باہر نہ نکالا گیا ہو، گندہ اور بدمزہ ہوتا ہے۔ اس کی رنگت گہری ہوتی ہے۔ متلی لانے کے قابل ہوتا ہے اور زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رکھا جا سکتا، بہت جلد خراب ہو جاتا ہے۔

مسلم گھروں میں اول تو جھٹکا یا مردار گوشت نہیں آتا۔ پھر گوشت کو خواتین اتنا دھوتی ہیں کہ خون کا آخری خطرہ تک نکل جاتا ہے۔ غیر مسلم دعوتوں اور مسلمان گھرانوں کے گوشت سے پکی چیزوں کو بہت پسند سے کھاتے ہیں۔ ذبح کیے ہوئے جانوروں کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔

عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر شخص کے پاس گوشت کی وافر مقدار جمع ہو جاتی ہے۔ چناں چہ گوشت دھو کر استعمال کیجیے۔ گوشت ضرور کھائیے مگر اعتدال کے ساتھ! گوشت کے کثرت استعمال سے نہ صرف مسوڑوں میں خرابی پیدا ہوتی ہے بلکہ مرض کینسر بھی چمٹنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لیے گوشت کو سبزیوں کے مقابلے میں کم استعمال کیجیے۔

حیاتین بھی ضائع ہوتے ہیں۔ روغنی اجزا بھی نہیں رہتے۔ چناں چہ اسے کھانے کا طریقہ یہ ہے کہ ابلا ہوا گوشت کھایا جائے۔ یا بہترین گر یہ ہے کہ پہلے گوشت کو مصالحہ وغیرہ ڈال کر بھون لیں پھر پانی ڈال کر پکائیے۔ یوں گوشت کی ساری طاقت شوربے میں آجاتی ہے۔ اسی لیے شوربا زیادہ مفید ہے۔

اس طریقے میں گوشت کی بوٹی فائدہ مند نہیں رہتی بلکہ قدرے قابض ہو جاتی ہے۔ اسی لیے گوشت کے ساتھ سبزی ڈال کر پکانا مفید ہے۔ یوں اس کی مضرت کم ہو جاتی ہے۔ سبزی کی وجہ سے گوشت فائدہ منداور صحت بخش غذا بن جاتا ہے۔ دماغی کام کرنے والے افراد گوشت کبھی کبھی کھائیں۔

حضرت ابو الدرداؓ کی حدیث حضورﷺ سے مروی ہے۔ آپﷺ نے فرمایا ''دنیا والوں اور جنتیوں کے کھانے کا سردار گوشت ہے۔''

امام زہری نے بیان کیا ہے کہ گوشت خوری سے ستر قوتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ محمد بن واسع کا خیال ہے کہ گوشت خوری سے بصارت تیز ہوتی ہے۔ چناں چہ حضرت علیؓ سے مروی ہے، آپﷺ نے فرمایا کہ گوشت کھاؤ، اس لیے کہ یہ بدن کے رنگ کو نکھارتا ہے۔ پیٹ بڑھنے نہیں دیتا۔ اخلاق و عادات بہتر بناتا ہے۔ نافع کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ماہ رمضان میں اکثر گوشت کھاتے تھے۔ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ جس نے چالیس رات گوشت کھانا چھوڑ دیا، اس کا اخلاق برا ہو جائے گا۔

گوشت کی مختلف اقسام ہیں۔ وہ اپنے اصول و طبیعت کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ مگر یہاں صرف قربانی کے جانوروں کا ذکر کیا جارہا ہے۔

بھیڑ کا گوشت

یہ دوسرے درجے میں گرم اور پہلے درجے میں تر ہوتا ہے۔ یعنی گرم و تر اور زود ہضم ہے۔ فوائد کے لحاظ سے دوسرے درجے پر ہے۔ جسمانی گوشت بڑھاتا اور طاقت بخشتا ہے۔ ایک سالہ بھیڑ کا گوشت سب سے عمدہ ہوتا ہے۔ جس کا ہاضمہ اچھا ہو، اس میں صالح خون پیدا کرتا ہے۔ سرد اور معتدل مزاج والوں کے لیے عمدہ غذا ہے۔ جو لوگ سرد مقامات میں رہیں اور سرما میں محنت و ریاضت کریں، ان کے نافع ہے۔ سوداوی مزاج والوں کے لیے بھی مفید ہے۔ ذہن اور حافظہ قوی بناتا ہے۔

ایک روایت میں حضورﷺ نے فرمایا ''بکری کی نگہداشت اچھی طرح کرو اور اس سے تکلیف دور کرتے رہو اس لیے کہ یہ جنت کے چوپایوں میں سے ہے۔''

لاغر اور بوڑھی بھیڑ کا گوشت خراب اور مضر صحت ہے۔ سب سے زیادہ عمدہ گوشت سیاہ رنگ کی بھیڑ کا ہوتا ہے۔ دائیں طرف کا گوشت بائیں طرف سے اور اگلا حصہ پچھلے حصے سے عمدہ ہوتا ہے۔ نبی کریمﷺ کو اگلے حصے اور سر کو چھوڑ کر بالائی حصے کا گوشت بہت زیادہ مرغوب تھا۔ یہ زیریں حصہ کے مقابلے میں زیادہ ہلکا اور عمدہ ہوتا ہے۔ گردن کا گوشت زود ہضم اور ہلکا ہے۔ دست کا سب سے، لذیذ اور زود ہضم ہوتا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ حضورﷺ کو پشت کا گوشت مرغوب تھا کہ اس میں غذائیت زیادہ ہوتی ہے۔

ہی وار سے گلا کٹ جانا چاہیے۔

ذبح کے طریقے میں رائج یہ ہے کہ چھری یا چاقو ایک بار پھرے پھر دوبارہ واپس آئے اور پھر آدھا بڑھے۔ یعنی چاقو ڈھائی سل اس جانور پر پھرے۔

لیکن ایسا صرف اس وقت کرنا چاہیے جب جانور کا گلا پوری طرح کٹا نہ ہو۔ چاقو اگر تیز ہو تو ایک مرتبہ پھرنے پر گلا کٹ سکتا ہے۔ رسم پوری کرنے کے لیے آہستہ آہستہ چاقو کو آگے پیچھے کیجیے۔ جب چاقو گلے پر پھیرا جائے، اس جانور کا نرخرہ تو کٹنا ہی چاہیے۔ قنات ہاضمہ (Oesophagos) بھی پوری طرح کٹنی چاہئیں اس کے ساتھ اور سب سے اہم وہ دو نالیاں بھی ضرور کٹیں گی جو دل سے خون سر کی طرف لے جاتی ہیں۔ انھیں جگروین کہا جاتا ہے۔

ان تمام اعضا کے کٹنے سے منسلک رگیں اور نسیں بھی کٹ جاتی ہیں۔ مختصراً ذبح حلال ہونے کے لیے تین رگوں کا کٹنا ضروری ہے: اول جس سے وہ سانس لیتا ہے، دوم جس سے چارہ پانی اترتا ہے اور سوم شہ رگ جو خون کی اہم رگ ہے۔

ذبح کرنے سے ہمیں حلال گوشت حاصل ہوتا ہے اور اس کی افادیت کے پیچھے کئی اہم طبی باتیں پنہاں ہیں۔ ذبح کرتے ہی جانور کا نرخرہ کٹ جائے تو اس کے جسم میں ہوا کا دخول رک جاتا ہے۔ جب ہوا داخل نہیں ہوتی تو دماغ تک پاک خون کا سلسلہ بھی منقطع ہو جاتا ہے۔ یوں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

چند سیکنڈوں میں ذبح ہونے والے جانور کو درد، سوجھ بوجھ اور کسی قسم کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ گو ذبح ہوتے جانور کو دیکھ کر یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ درد اور کرب میں مبتلا ہے۔ چونکہ جانور کچھ عرصہ صحت مند رہتا ہے، لہٰذا دل کے خون پمپ کرنے کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ یہی عمل اس کے جسم سے سارے خون کو نکال باہر کرتا ہے۔

ماہرین تغذیہ نے گوشت کو بطور غذا و دوا مفید قرار دیا ہے۔ اس کی تاثیر گرم تر ہے۔ یہ جسم انسانی میں خون اور گوشت بڑھاتا ہے۔ بادی دور کرتا اور طاقت بخشتا ہے۔ بدن کو موٹا اور جسم میں چربی پیدا کرتا ہے۔ البتہ اس کا کثرت سے استعمال دماغ کو کند کر دیتا ہے۔

ماہرین تغذیہ نے گوشت کو بطور غذا و دوا مفید قرار دیا ہے۔ اس کی تاثیر گرم تر ہے۔ یہ جسم انسانی میں خون اور گوشت بڑھاتا ہے۔ بادی دور کرتا اور طاقت بخشتا ہے۔

جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ گوشت کے اجزائے ملحمہ یعنی گوشت و خون پیدا کرنے والے اجزا چربی، نمک اور پانی پر مشتمل ہیں۔ چربی میں وٹامن ''اے'' پایا جاتا ہے جس سے ہڈیوں کو غذا پہنچتی ہے۔ اجزائے ملحمہ کی مقدار زیادہ ہونے کے باعث یہ غذائیت بخش ہے۔ تاہم گوشت زیادہ کھانے سے گردوں میں یورک ایسڈ کی جو زیادتی ہو جاتی ہے، گردے اسے بآسانی خارج نہیں کر سکتے۔ گوشت بدن میں صفرا زیادہ کرتا ہے۔ ازحد گوشت خوری سے مثانے اور گردے کے امراض رونما ہوتے ہیں۔ جگر، گردوں، قلب اور دوسرے اعضا بدن کے فعل میں نقص آ جاتا ہے۔ اس لیے گوشت کا استعمال کم کرنا چاہیے۔

گوشت عموماً خوب بھون کر پکایا جاتا ہے۔ اس طریقے سے گوشت کے مقوی اجزا جل جاتے ہیں۔

ملک و قوم کی خدمت کے دس سال

الحمدللہ

4,359

کم وسیلہ مگر باصلاحیت طلبا و طالبات کو

ساڑھے آٹھ کروڑ روپے

سے زائد کے وظائف جاری کیے جا چکے ہیں۔

اب یہ طلبا و طالبات برسرروزگار ہو کر اپنے خاندانوں کو غربت اور جہالت سے نکال رہے ہیں۔

682

مزید کم وسیلہ باصلاحیت طلباء و طالبات کی درخواستیں سال 2014-15 کے لئے مندرجہ ذیل شعبوں میں زیرِ غور ہیں

شعبہ	تعداد	شعبہ	تعداد	شعبہ	تعداد	شعبہ	تعداد	شعبہ	تعداد
ایم بی بی ایس	181	ایم اے	31	بی ایس آنرز	120	بی اے	10	ایف اے	14
ڈی وی ایم	09	ایم بی اے/ایم پی اے	06	بی اے آنرز	07	ایم فل	03	آئی کام/آئی سی ایس	03
ڈی فارمیسی	14	ایم بی آئی ٹی	01	بی بی اے	06	ایل ایل بی	02	ڈی اے ای	12
فزیوتھراپی	05	ایم کام	07	بی ایڈ	03	اے سی سی اے	04	بی ٹیک	03
بی ڈی ایس	09	بی ایس انجینئرنگ	167	بی ایس ایڈ	03	سی ایم اے	02	میٹرک	04
ایم ایس سی	14	بی کام	05	ایم ایڈ	01	ایف ایس سی	25	انڈر میٹرک	11

Have FUN with Pingos Flavored
JoJo
DISCOVER THE WORLD OF TREATS
Spicy Chicken
Pingos
Flavored
Spicy Chicken
Cheese Onion
Print Ad Comm.

عید الاضحی

سال میں ایک بار ملنے والا مقدس تحفہ

قربانی کا گوشت

جو عام لحم کی بہ نسبت زیادہ خوبیاں اور تقدس رکھتا ہے

حکیم سید غوث الدین
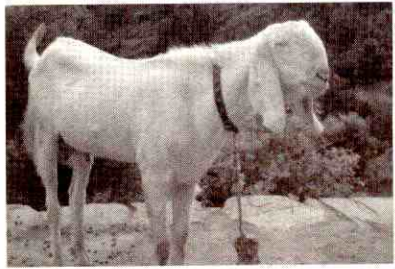
عید الاضحیٰ کے موقع پر جانور کی قربانی ہر مسلمان عاقل، بالغ اور صاحب نصاب مرد اور عورت پر واجب ہے۔ قربانی بکرا، بھیڑ، دنبہ، گائے اور اونٹ نر و مادہ کی دی جاتی ہے۔ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ قربانی کا بکرا ایک سال، گائے دو سال اور اونٹ پانچ سال کا اور بے عیب ہو۔ بکرا ایک آدمی ہی خرید سکتا ہے۔ گائے اور اونٹ میں سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں۔ قربانی میں ذبح کیا ہوا جانور ہی حلال قرار پاتا ہے۔

بکرا یا کوئی بھی جانور ذبح کرنے کا طریقہ یہ ہے:
جانور کو اس طرح لٹائیے کہ اس کا منہ قبلہ کی طرف ہو۔ اس کو مضبوطی سے پکڑ لیجیے۔ گردن سیدھی رکھی جائے۔ چھری یا چاقو کی دھار خوب تیز ہو۔ چاقو زیادہ بڑا نہ ہو اور نہ زیادہ چھوٹا۔ جہاں جانور کے جبڑے ختم ہوں، اس جگہ سے تقریباً ایک یا ڈیڑھ انچ نیچے چاقو کی دھار چلائیے۔ ایک

گی۔ طبیعت بگڑتی چلی گئی۔ اس نے پھر انڈے دینے شروع کیے۔ وہ ہم نے کھائے۔ آخری انڈہ دیتے ہوئے وہ بطخ کے گھر کی طرف چلی۔ گھسٹتی لڑکھڑاتی ہوئی وہاں پہنچی۔ آخری انڈہ اس نے بطخ کی دہلیز پر دے کر اسے بطخ کے سپرد کیا۔ یہ فرض ادا کرنے کے بعد وہیں اپنی جان دے دی۔

بطخ اسے اپنا انڈہ سمجھ کر اپنے گھر میں لے گئی۔ بطخ بھی کئی انڈے دے رہی تھی۔ بچے پیدا ہوئے۔ ان میں مرغی کا بچہ بھی شامل تھا۔ بطخ بچوں کو تیرنے کے لیے پانی میں لے جاتی تو مرغی کا بچہ تیرنے کے بجائے اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاتا۔ بطخ اسے اپنا ہی بگڑا ہوا بچہ سمجھتی جو پانی سے خوف کھاتا ہے۔ ایک مرغی موت کا اندازہ کرتے ہی اپنے مستقبل کو محفوظ ہاتھ میں منتقل کرنا چاہتی تھی...... یہ ہے ماں کی محبّت! غور فرمائیے مغرب اور ایک اڈیکسل نظام ہمیں کس قسم کی ماں سے آگاہ کر رہا ہے؟

تمام انسان اللہ کا کنبہ

لبرل ازم اور سرمایہ دارانہ نظام کے معاشی اصولوں کا سنہرا اصول ہے: ''Each according to his ability'' یعنی ہر شخص کو اس کی صلاحیت و استعداد کے مطابق رزق ملنا چاہیے۔ جب کہ سوشلزم اس اصول کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق ملنا چاہیے کہ تمام انسان برابر تو ہیں مگر صلاحیتوں میں برابر نہیں۔ Each according to his need لہٰذا اجتماعیت کو کمزور افراد کے لیے قربان کر دینا چاہیے۔

اسلام کا اصول یہ ہے کہ اللہ کی پیدا کردہ مخلوق اور اس کے خاندان بنی آدم یعنی انسان کی خدمت ہر مسلمان کا فرض ہے کیونکہ تمام انسان اللہ کا کنبہ ہیں...... الخلق عیال اللہ۔ جو جس کے جتنا قریب ہے، اس کی کفالت اسی کی اخلاقی، مذہبی و شرعی ذمہ داری ہے۔ اگر کوئی کمانے کے قابل نہیں تو کمانے والوں کی انفرادی، اجتماعی، گروہی، معاشرتی، خاندانی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے عزیز اور اجنبی کا بھی خیال رکھیں۔ اللہ تعالیٰ تو قیامت کے دن بندے سے پوچھے گا کہ میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا، میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا؟ جواب میں انسان کہے گا، اے اللہ آپ کیسے بھوکے پیاسے ہو سکتے ہیں؟

جواب ملے گا ''میرا فلاں بندہ بھوکا تھا، فلاں پیاسا تھا، تم نے اس کا خیال نہیں رکھا۔''

اسلام اس نقطۂ نظر کا حامی ہے۔ یعنی اللہ کی محبّت کے لیے مثال دی گئی تو دنیا سے ماں کو منتخب کیا گیا۔ مگر یہ کہانی ماں کی ایسی گھناؤنی تصویر پیش کرتی ہے جو روایتی، مذہبی، الہامی اور اسلامی تہذیبوں کے تصور انسان، تصور عبد اور تصور ماں کے صریحاً منافی ہے۔ یہ خالصتاً مغربی مادہ پرست ماں ہے جو پیسے کے لیے جیتی اور مرتی ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد محض مادی خوش حالی اور ترقی ہے۔

چونکہ احمق بیٹے نے اپنی حماقت سے ہی مادی خوش حالی کے دروازے خود پر کھول لیے لہٰذا وہ خوش ہوگئی۔ مزے کی بات یہ کہ جدیدیت (Modernism) کے فلسفے اور فکر کے تحت تخلیق کردہ اس کہانی کی کتاب پر روایتی مختصر کہانیاں (Traditional Short Stories) لکھا گیا ہے۔ یہ محض دھوکا ہے تاکہ بتایا جائے، ماضی بھی ایسا تھا اور عہد حاضر میں ہمارا حال بھی ایسا ہی ہے۔

◆◆◆

دے دی۔ اتنی تکلیف بھی نہیں کی کہ بچی کے سسرال تک چلا جاتا کہ یہ احمق داماد راستے میں گھر پہنچنے سے پہلے بیٹی کو نقصان نہ پہنچا دے۔

(۷) لڑکے کی ماں نہایت سخت تھی۔ مگر جیک کو ماں کی اجازت کے بغیر شادی کرتے ہوئے نہ شرم آئی نہ کوئی فکر ہوئی۔ وہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اپنی بیوی کو ماں کی اجازت کے بغیر گھر لے آیا۔

(۸) ماں اس قدر لالچی تھی کہ جب دیکھا، جیک ایک خوبصورت لڑکی لے آیا ہے تو یہ پوچھنے کی زحمت تک گوارا نہ کی کہ احمق! یہ لڑکی کون ہے، کہاں سے لایا ہے، کیوں لایا ہے اور کس کی اجازت سے؟ تو اتنا احمق ہے کہ کچھ کماتا نہیں، تجھے تو میں گھر سے نکال رہی تھی، اب تو غربت میں ایک لڑکی بھی لے آیا۔ یہ مفلسی میں گیلا آٹا والا معاملہ ہے۔

شاید ماں نے سوچ لیا کہ لڑکی امیر گھر کی ہے، اپنے شوہر کا خیال رکھے گی اور میرا بھی۔ اس لڑکی پر میرا احسان ہے کہ میں اگر جیک کو نہ جنتی تو یہ اداسی میں گھٹ کر مر جاتی۔ بیٹے کی بے وقوفی اس بدقسمت لڑکی کے لیے خوشیوں کا پیغام لائی ہے۔ میرا بیٹا تو خوش قسمت ہے۔

(۹) کہانی میں بچوں کو یہ بنیادی پیغام دیا گیا کہ زندگی کا مقصد کمانا اور کھانا ہے۔ جو کمانے کے قابل نہیں وہ عزت کے قابل نہیں...... اس کی بے عزتی کرنا جائز ہے بلکہ اسے گھر سے نکال دینا چاہیے۔

کسی احمق اور بے وقوف بچے کو گھر میں رکھ کر کھلانا پلانا احمقانہ بات ہے۔ جو اپنا بوجھ خود نہیں اٹھا سکتا، اس کا بوجھ ماں باپ گھر والوں کو بھی نہیں اٹھانا چاہیے۔ جدید مغرب کا یہ تصور جو انسان نے اختیار کیا، جانور بھی اس سے بہتر رکھتے ہیں۔ مثلاً افریقی جنگوں میں ہاتھیوں کے غول کی رفتار کا تعین اس کا سب سے کمزور ہاتھی کرتا ہے۔ اس کی رفتار کے مطابق تمام ہاتھی اپنی رفتار کم کر لیتے ہیں۔ گویا اجتماعیت کی خاطر ایک کمزور ہاتھی کے لیے پورا غول قربانی دیتا ہے۔

اسی طرح چیتے کی مادہ بچے کو جنم دے تو چیتا اپنے بھٹ میں نہیں جاتا، وہ باہر بیٹھ کر اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے۔ اندر صرف ماں اور بچے ہوتے ہیں۔ وہ ماں کے لیے شکار تلاش کر کے لاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ایک دن اس مشقّت محنت سے تنگ آ کر چپکے سے غائب ہو جائے۔ وہ اپنا فرض ادا کرتا ہے۔ اپنے خاندان کو تنہا چھوڑنا اس کی فطرت کے خلاف ہے۔

ماں کا مقام

مگر اس کہانی میں ماں جیسی بے مثال ہستی کو نہایت کمتر درجے پر دکھایا گیا۔ جب کہ ماں کی محبّت ایسی ہے کہ رسالت مآب ﷺ نے جب بندوں سے اللہ کی محبّت کی گہرائی کو بیان کیا تو اسے ماں کی محبّت کے ذریعے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبّت رکھتا ہے۔ ایک اور حدیث میں بتایا گیا:

''خدا کی قسم اللہ تعالیٰ کی ذات میں اپنے بندوں کے لیے اس سے زیادہ پیار اور رحم ہے جتنا کہ ماں کے دل میں اپنے بچے کے لیے للّٰہُ ارحم لعبادہ من ہٰذہٖ بولدھا (صحیح بخاری و مسلم)

ایک ماں کی محبّت کیا ہوتی ہے؟ اسے محسوس کیا جا سکتا ہے بیان نہیں۔ جانور کی ماں تک اپنی اولاد سے ایسی محبّت کرتی ہے کہ اس کا تصور کرنا مشکل ہے۔ ہمارے گھر میں ایک مرغی تھی۔ اچانک بیمار ہوئی اور دبلی ہونے

تہذیب، معاشرت، تاریخ، روایات اور اقدار سے متصادم ہیں:

(۱) روایتی تہذیبوں کے مانند اسلامی معاشرے میں احمق، نادان، معذور اور بدھو بچوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کی معذوری و نادانی لعنت ملامت کا نشانہ نہیں بنتی بلکہ ان سے خصوصی محبّت کا سلوک ہوتا ہے۔ آج بھی روایتی معاشروں میں خاندان کے سب سے کمزور، معذور اور احمق بچے پہ سب سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ اس کو تذلیل، تضحیک، تمسخر کا نشانہ نہیں بنایا جاتا کیونکہ وہ خلقی طور پر کمزور ہوتا ہے اور زندگی کی دوڑ میں صحت مند لوگوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ایسے بچوں کے ساتھ صرف ماں ہی نہیں خاندان اور باہر بھی ہر شخص خصوصی توجہ اور محبّت کا برتاؤ کرتا ہے۔ ان پر ضرورت سے زیادہ بوجھ اور ذمہ داریاں نہیں ڈالی جاتیں۔

(۲) کمزور اور احمق بچے کی خاص تربیت کی جاتی ہے۔ اس کو پیار و محبّت سے سمجھایا جاتا ہے۔ غلطیوں کی اصلاح نہایت تدبر، فہم اور شفقت سے کی جاتی ہے۔ یہ عجیب ماں ہے جو اسے روزانہ ذلیل کرتی ہے۔ بچے کو جو سبق دیتی ہے، اس کے ساتھ یہ نہیں بتاتی کہ یہ صرف اسی طرح کی صورت حال میں کارآمد ہے۔ تم اس سبق کو دوسری جگہوں پر استعمال نہ کرو۔ وہ بچے کو یہ سمجھا سکتی تھی کہ جس کے ہاں کام کرو، جب وہ معاوضے میں کچھ دے تو اس سے پوچھ لو کہ اسے کیسے لے کر جاؤں؟

(۳) ایک نادان بچہ بھی اتنا احمق نہیں ہوتا کہ وہ دودھ کو جیب میں ڈال لے اور بلونگڑے کو قمیص کے اندر رکھ کر چھپائے، جسم کے ساتھ چمٹا لے اور خود کو اس سے زخمی بھی کرائے۔ بچے کی حماقت بہت زیادہ افسانوی ہے۔ فی الحقیقت بچہ اگر اتنا ہی احمق تھا تو اس پر غصے کا کوئی جواز ہی نہ تھا۔

(۴) ماں نے بچے کو جو اسباق دیے وہ خود احمقانہ ہیں۔ دودھ کے جگ کو قمیص کے اندر رکھ لو، گوشت کو کندھے پر رکھ کر لاؤ...... عملی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔ کہانی نویس نے ماں کو احمق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۵) بچہ اتنا بے وقوف ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے کام بھی صحیح طریقے سے انجام نہیں دے سکتا۔ لیکن زندگی کا سب سے مشکل کام یعنی شادی کا فیصلہ اس نے ایک لمحہ میں کرلیا۔ اپنی ماں سے مشورہ بھی نہیں کیا، اجازت بھی نہیں لی۔ شادی کی تقریب بھی منعقد نہیں ہوئی اور خاندان کے لوگوں سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا۔

> اسلام کا اصول یہ ہے کہ اللہ کی پیدا کردہ مخلوق اور اس کے خاندان بنی آدم یعنی انسان کی خدمت ہر مسلمان کا فرض ہے کیونکہ تمام انسان اللہ کا کنبہ ہیں...... الخلق عیال اللہ۔

(۶) لڑکی کا باپ جو امیر تھا، اس نے بھی یہی سوچا کہ یہ احمق لڑکا میری لڑکی کو خوش رکھ سکے گا اور اس کے اشارے پر چلے گا۔ لہٰذا اس نے لڑکے کے خاندان، حسب نسب کام، کاروبار، ماں باپ، رہائش کے بارے میں کچھ پوچھنے، دیکھنے، سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ لڑکی کا باپ ایک جانب اتنا عقل مند ہے مگر اس نے اپنے کسی عزیز دوست پڑوسی سے مشورہ نہیں کیا نہ بچی کی شادی میں کسی کو مدعو کیا۔ وہ اچانک سڑک پر جانے والے ایک نامعلوم لڑکے سے خوش ہوا۔ پھر اپنی قیمتی متاع کا ہاتھ اس احمق لڑکے کے ہاتھ میں تھما گدھے پر بیٹی کو ساس کے گھر جانے کی اجازت

ماں بہت ناراض ہو گی۔ ماں نے جیک کو جیسے ہی دیکھا چلائی "او گدھے لڑکے بلونگڑے کو رسی کے ٹکڑے کے ساتھ باندھنا چاہیے تھا۔ پھر تم اسے اپنے ساتھ ساتھ چلا کر لے آتے۔ جیک نے حسب معمول معذرت پیش کی۔ اس نصیحت کو یاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔

اگلے دن وہ پھر کام کی تلاش میں نکلا۔ اب اسے قصائی نے کچھ کام دیا۔ شام کو محنت کے معاوضے میں قصائی نے اسے گوشت کا ٹکڑا دیا۔ جیک کو ماں کی نصیحت اور اپنا وعدہ یاد تھا۔ اس نے ایک رسی گوشت کے گرد لپیٹی اور اسے بلی کے بچے کی طرح کھینچتے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج تو اس کی ماں یقیناً خوش ہو گی۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ بہت سے کتے اس کا پیچھا کرنے لگے۔ وہ پورے راستے گوشت نوچ نوچ کر کھاتے رہے۔

جب جیک گھر پہنچا تو رسی کے آخری سرے پر کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ جان گیا کہ اس کی ماں ہرگز خوش نہیں ہو گی۔ جیسے ہی ماں نے جیک کو دیکھا زور سے چلائی "احمق! گوشت اپنے کندھے پر رکھ کر لانا چاہیے تھا تاکہ کتے گوشت نہ کھا پاتے۔"

اس کی عقل مند ماں کا یہ مشورہ خود احمقانہ ہے۔ کیا گوشت کندھے پر رکھ کر لایا جاتا ہے؟) جیک نے حسب معمول معذرت کی اور ماں کی نصیحت اپنے پلے باندھنے اور اس پر عمل کا وعدہ کیا۔

اگلے دن وہ کام کی تلاش میں نکلا۔ اسے شہد جمع کرنے والا ملا۔ جیک نے چھتوں سے اس کے لیے شہد جمع کیا۔ دن کے اختتام پر شہد والے نے اسے اپنا بوڑھا اور ناکارہ گدھا معاوضے میں دیا۔ جیک نے گدھا لیا۔ ماں کی نصیحت اور اپنے وعدہ پر عمل کرتے ہوئے گدھے کو اپنے کاندھے پر اٹھایا اور گھر کی طرف چل دیا۔ گدھے کی ٹانگیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ جیک اسی حالت میں چلتا رہا۔ گدھا زور سے رینک رہا تھا۔ راستے میں ایک بہت امیر آدمی کا گھر آیا جو اپنی بیٹی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی بیٹی بہت خوبصورت تھی۔ لیکن اپنی ماں کے انتقال کے بعد سے وہ مسلسل اداس تھی۔ اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ غم میں ڈوبی رہتی۔

ڈاکٹروں نے اس کے باپ کو بتایا کہ وہ صرف اسی وقت کچھ بولے گی جب کوئی اسے ہنسا سکے۔ اس غم زدہ لڑکی نے گھر سے باہر شور شرابے کی آواز سنی تو کھڑکی سے جھانکا۔ سڑک پر عجیب تماشہ نظر آیا، جیک کے کاندھے پر ایک گدھا لدا ہوا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹ گیا۔ وہ مسلسل ہنسنے لگی۔ پھر بھاگ کر باپ کے پاس گئی اور اس پر لطف منظر کا ذکر کیا۔

لڑکی کا باپ یہ دیکھ کر بے انتہا خوش ہوا کہ بیٹی پھر ہنسنے بولنے لگی ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ لڑکے کو اپنی بیٹی کا شوہر بنائے گا۔ لڑکے نے اس کی اداس بیٹی کو خوش کر دیا تھا۔ چناں چہ باپ نے اپنی بیٹی جیک کے سپرد کر دی۔ جیک گدھے پر بیوی کو بٹھا گھر لے گیا۔ اس شام بھی جیک کی ماں بیٹے کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ جیک آج بھی کوئی احمقانہ کام کر کے آئے گا اور اس کے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہو گا۔ وہ اس کو زوردار جھڑکیاں دینے پر تلی بیٹھی تھی۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ جیک ایک گدھا لے کر آ رہا ہے جس پر ایک خوبصورت لڑکی سوار ہے تو ماں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہا۔ اس دن کے بعد ماں نے بیٹے کو کبھی "احمق جیک" نہیں کہا۔

کہانی کے اسباق

اس کہانی میں بچوں کے لیے مخفی کئی اسباق ہماری

پہ بیٹھ کر مچھلیوں سے دل بہلاتا اور رات کو تاریک آسمان پر چمکنے والے ستاروں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا، یہی اس کی مصروفیت تھی۔

ایک دن ماں نے اس سے کہا کہ یہ سستی، نکما پن ختم کرو اور کام کے لیے نکلو تاکہ اپنی خوراک کا بندوبست کر سکو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو واپس گھر کا رخ نہیں کرنا۔ اگلے دن نادان جیک کام کی تلاش میں نکلا۔ اس کی ملاقات ایک کسان سے ہوئی۔ اس نے کسان کا ہاتھ بٹایا۔ شام کو کسان نے شدید محنت کے معاوضہ میں اسے ایک پینی کا سکہ دیا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا کہ آج تو میری ماں بہت خوش ہوگی۔

واپسی کے سفر میں وہ ندی کے پاس رکا اور مچھلیوں کا نظارہ دیکھنے ندی پر جھکا۔ ہاتھ میں رکھا سکہ پھسل کر ندی میں جا گرا۔ وہ سکے کی تلاش میں ندی کی تہہ تک اترا مگر سکہ ہاتھ نہ آیا۔ مایوس ہو کر گھر کی طرف چلا۔ اسے یقین تھا کہ ماں سکے کی گمشدگی کا سن کر بالکل خوش نہیں ہوگی۔ وہ مچھلی کی طرح پانی میں تربہ تر تھا۔ دن بھر کی محنت کا ثبوت ماں کے سامنے پیش کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

ماں سارا ماجرا سن کر چلائی ''او احمق لڑکے! تمھیں سکہ اپنی جیب میں رکھنا چاہیے تھا۔''

جیک نے جواب دیا ''امی معاف کر دیجیے۔ اگلی مرتبہ غلطی نہیں ہوگی۔ میں اس نصیحت کو یاد رکھوں گا۔''

اگلے دن وہ کام کے لیے نکلا تو اسے ایک کسان ملا جس کے پاس مویشیوں کا گلہ تھا۔ اس نے کسان کا ہاتھ بٹایا۔ شام کے وقت کسان نے مشقت کے صلے میں اسے دودھ کا ایک جگ دیا۔ جیک کو ماں کی نصیحت اور اپنا وعدہ یاد تھا لہٰذا اس نے نہایت احتیاط اور ذمہ داری سے دودھ کا جگ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج اس کی ماں بہت خوش ہوگی لیکن گھر پہنچتے پہنچتے دودھ جیب سے بہہ کر ٹانگوں سے رسنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کی ماں ہرگز خوش نہیں ہوگی۔ اس کی پتلون دودھ سے تربہ تر ہو رہی تھی۔ دن بھر اس نے جو مشقّت کی تھی اس کا ثبوت دکھانے کے لیے اس کے وہی دودھ سے گیلی پتلون تھی۔ ماں اسے دیکھتے ہی چلائی ''او احمق تمھیں دودھ کا جگ اچھی طرح ڈھانک کر اپنی قمیص کے اندر رکھ کر لانا چاہیے تھا۔''

> اسلامی معاشرے میں احمق، نادان، معذور اور بدھو بچوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کی معذوری و نادانی لعنت ملامت کا نشانہ نہیں بنتی بلکہ ان سے خصوصی محبت کا سلوک ہوتا ہے۔

جیک نے پھر معذرت پیش کی اور کہا کہ آئندہ میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔ (سوال یہ ہے کہ بچہ احمق ہے یا؟ دودھ کے جگ کو قمیص کے اندر رکھ کر کیسے لایا جا سکتا ہے؟) اگلے دن جیک پھر کام کی تلاش میں باہر نکلا۔ اسے نان بائی ملا۔ اس نے اسے روٹی کے لیے آٹا گوندھنے کا کام سپرد کیا۔ شام کو محنت و مشقت کے معاوضے میں نان بائی نے اسے بلی کا ایک بچہ دیا۔ جیک کو ماں سے کیا گیا اپنا وعدہ یاد تھا۔ اس نے بلی کا بچہ نہایت احتیاط سے لپیٹ کر قمیص کے اندر رکھ لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج تو اس کی ماں ضرور اس سے خوش ہوگی۔ لیکن بلونگڑا اندھیری کال کوٹھڑی میں ناخوش تھا۔ اسے جیک کی قمیص کے اندر رہنا نہایت مضحکہ خیز لگا۔ بلونگڑے نے غریب جیک کو پنجے مار مار کر لہولہان کر دیا۔

اس سے پہلے کہ جیک گھر پہنچتا، بلونگڑا چھلانگ مار کر راستے میں ہی بھاگ نکلا۔ جیک کو احساس ہو گیا کہ اس کی

کراچی ایجوکیشنل ریسورس ڈویلپمنٹ سینٹر (ERDC) تعلیم و تدریس سے متعلق مشاورت کا معروف ادارہ ہے۔ اس کے سربراہ جناب سلمان صدیقی اور ان کے رفیق کار، زبیر شیخ نے ڈاکٹر عبدالوہاب سوری اور راقم الحروف کو دعوت دی کہ وہ چند اہم ترین اسکولوں کے مالکان، منتظمین، مہتمم، مدرسین اور بہی خواہوں کی ایک خصوصی نشست میں شرکت کریں۔ اس میں اسکولوں کو درپیش مسائل زیر بحث آنے تھے۔

ہم اس فکر انگیز نشست میں شریک ہوئے اور اسکولوں سے وابستہ مخلص، دین دار، صاحب ایمان خواتین وحضرات کے خیالات سنے۔ ان سب کا مشترکہ موقف یہ تھا کہ وہ اپنے اسکولوں میں اسلامی طرز زندگی و تعلیمات، اخلاقیات، تجوید قرآن، حدیث، کے متعلق پڑھاتے ہیں لیکن اس کے باوجود نتائج حوصلہ افزا نہیں۔ بیشتر بچوں کا آئیڈیل مغرب ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے مستقبل کے حوالے سے بہت زیادہ متحرک ہوتے ہیں اور انھیں اپنی منزل پاکستان سے باہر ہی نظر آتی ہے۔ سوال یہ ہے، بہترین ماحول اور اسلامی تربیت کے باوجود بچوں میں یہ خیالات کیوں پیدا ہوتے ہیں؟

اس اہم سوال کا جواب بہت طویل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے کئی سوالات وابستہ ہیں۔ مثلاً یہ کہ جدید اسکول کا نظام کہاں سے آیا؟ اس کی مابعد الطبیعیاتی اساس کیا ہے اور ان اداروں کے قیام کی خاطر جبر کیوں کیا گیا؟ بچے پر نماز سات سال میں فرض ہوتی ہے لیکن اسکول میں بچے کا داخلہ اس وقت ہو جاتا ہے جب وہ ماں کے پیٹ میں ہو؟ آخر کیوں؟ یہ جبر ہمارے لیے فطری، حقیقی اور قابل قبول کیوں ہے؟

قرآن پاک نے حکم دیا ہے کہ مائیں دو سال تک بچوں کو دودھ پلائیں۔ مگر اس عمر سے بھی پہلے بچے کو مانٹیسوری میں داخل کرا دیا جاتا ہے۔ یہ جبر کون مسلّط کر رہا ہے؟ جدید سیکولر تعلیم کے داعی مغربی اساس مفکّرین روسو، مل (Mill)، ولیم جیمز، ڈیوی، گیٹوز (Gatos) اور فوکالٹ (Foucault) نے اس موضوع پر کیا لکھا ہے؟ کیا جدید تعلیمی نظام کے ہتھیار ابلاغ عامہ کے اوزار ہیں یا تباہی و بربادی کے آلات؟ ان فلسفیانہ مباحث کو ایک نشست یا مضمون میں بیان کرنا محال ہے۔

مختصر جواب دینے کے لیے راقم الحروف نے انگریزی میڈیم اسکولوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں کی ایک کہانی کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ ممکن ہے، اس جائزے میں ان سوالوں کا جواب مل سکے۔ روشنی کی ایک لکیر بھی تاریک رات میں ہزاروں چراغوں کا متبادل ہوتی ہے۔ اس جائزے کو ایسی ہی ایک لکیر سمجھیے۔

بدھو جیک

پاکستان کے کئی انگریزی میڈیم اسکولوں میں ایڈیکسل نظام (Edexcel) کے تحت تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ معروف برطانوی نظام تعلیم ہے۔ اس میں تیسری جماعت کے بچوں کو انگریزی ادب کی تعلیم دینے کے لیے ایک کتاب "Nutty as Noodle Stories" نصاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب بھارت و پاکستان کے علاوہ پوری دنیا میں پڑھائی جاتی ہے۔ کتاب کی پہلی کہانی کا عنوان ہے: Daft Jack یعنی احمق، نادان، بدھو جیک۔

جیک ایک غریب ماں کا بیٹا ہے جو گھروں میں کام کر کے اپنی گزر اوقات کرتی۔ مگر اس کا بیٹا روزانہ صبح گھر کے دروازے پر بیٹھ جاتا اور گھاس چباتا۔ سہ پہر کو وہ ندی

مغربی اقدار پاکستانی بچوں پر تھوپنے والے

گمراہ کن انگریزی نصاب کا پوسٹ مارٹم

Nutty as a Noodle Stories

تہذیب، معاشرت، تاریخ اور روایات سے متصادم
ایک برطانوی نصابی کہانی کا چشم کشا بیان

سید خالد جامعی
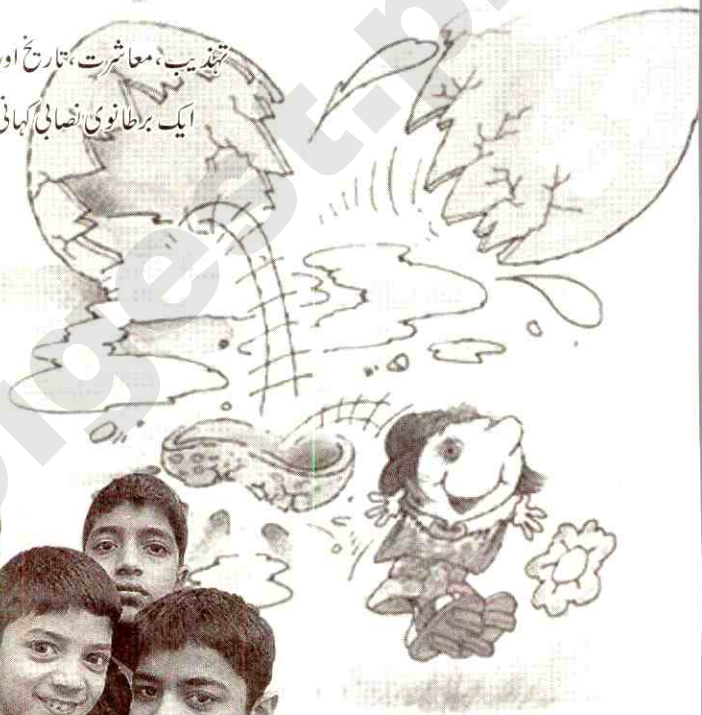
میرا بھی بکرا آگیا ہے :)

عید کارٹون

مُنے کی اماں! پچھلے سال تو بکرے کی قربانی دی تھی،
مگر اس برس تو صرف بکرے کی تصویر ہی خرید سکا ہوں۔۔

ہوگی۔ موسمیاتی تبدیلیوں سے صرف غریبوں ہی کو نقصان نہیں پہنچے گا، بلکہ پورا معاشرہ مسائل کا شکار ہو سکتا ہے،

اس طرح کی مبینہ صورت حال میں ہمارے بااختیار لوگ دشمن کو قدرت کے ساتھ مل کر سازش کرنے پر مورد الزام ٹھہرا سکتے ہیں۔ مغربی برصغیر میں سب سے شدید موسمی آفات کشمیر میں جنم لیں گی۔ یہ کوئی بین الاقوامی سرحد، کوئی لائن آف کنٹرول نہیں دیکھیں گی۔ تب دونوں ممالک کے پاس ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوگا۔

لیکن حالیہ صورت حال امید افزا نہیں۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان شدید مشکلات کے دور میں بھی باہمی تعاون کی کوئی مثال موجود نہیں۔ کشمیر نے اپنی حالیہ تاریخ میں سب سے بڑی آفت اکتوبر ۲۰۰۵ء میں دیکھی جب ایک خوفناک زلزلے نے پورے خطے کو تہ و بالا کر دیا۔ تب پوری دنیا پاکستان کی مدد کرنے دوڑ پڑی۔ لیکن دونوں پڑوسی ممالک کے درمیان تعاون صرف رسمی طور پر اور احتیاط سے جاری کیے گئے بیانات سے آگے نہیں بڑھا۔ یہ بیان بھی صرف عالمی برادری کو دکھانے کے لیے کیے گئے، جیسا کہ حالیہ سیلاب کے بعد ہوا۔

کیوبا جیسے دور دراز ملک سے بھی ڈاکٹروں کی ٹیم پاکستان آئی، لیکن بھارتی ڈاکٹروں کو ویزا جاری نہیں کیا گیا۔ بھارت نے دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں پھنسے لوگوں کو نکالنے کے لیے اپنے ہیلی کاپٹر دینے کی پیشکش کی۔ لیکن بھارتی حکومت کا اصرار تھا کہ ہیلی کاپٹر اسی کے ہواباز اڑائیں گے۔ اس پہ پاکستان نے رضامندی ظاہر نہیں کی۔ پاکستان نے لائن آف کنٹرول کی دونوں جانب ایک کلومیٹر کی ممنوع فضائی حدود میں نرمی کی درخواست کی۔ بھارت مان گیا لیکن ہر اُڑان کو پیشگی اجازت سے مشروط کر دیا۔

دونوں ملکوں نے بہرحال عالمی برادری کے سامنے خوب دکھاوا کیا۔ بٹے ہوئے کشمیری خاندانوں کو لائن آف کنٹرول پار کرنے کی اجازت دینے کے لیے تجاویز پیش کیں۔ افسران دفتر خارجہ نے اس تعاون پر سیکیورٹی خدشات دور کرنے کے لیے کئی دن تک کام کیا۔ اسلام آباد میں بعداز طویل اجلاس کشمیریوں کو لائن آف کنٹرول پار کرنے میں مدد دینے کے لیے پانچ چیک پوسٹس کے قیام کا اعلان ہوا۔

زلزلے کے چالیسویں دن ۲۰ نومبر ۲۰۰۵ء کو چوبیس پاکستانی کشمیری ایسی ہی ایک چیک پوسٹ سے پاکستان واپس آئے۔ یہ لوگ زلزلے کے بعد سری نگر مظفرآباد بس سروس معطّل ہو جانے کے باعث دوسری طرف پھنس گئے تھے۔ ان کے علاوہ کسی کو بھی سیکیورٹی کلیئرنس نہیں ملی۔ یہ تعاون کی کتنی زبردست مثال ہے!

حقیقت میں پاکستان اور بھارت اپنی ہمالیہ جتنی بلند انا پر قابو پانے میں ناکام رہے ہیں۔ ان پہ جب دباؤ پڑے تو نمائشی اقدامات کرتے اور پھر عالمی برادری کے سامنے شرمندگی سے بچنے کے لیے بیانات جاری کرنے لگتے ہیں۔

دونوں ممالک کشمیر کا سیاسی مسئلہ حل کرنے پہ اگلے ۶۷ سال بھی ضائع کر سکتے ہیں۔ لیکن جب موسمی آفات اپنا رنگ دکھائیں گی، تو وہ کہاں چھپیں گے؟ ان ممالک کے حکمرانوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ موسمی آفات ۶۷ سال مکمّل ہونے سے بہت پہلے معمول بن جائیں گی۔ اگر انھوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ نہ ملائے، تو وہ دونوں کو ڈبو دیں گی۔

◆◆◆

رہیں۔میں نے پھر اُسے تفصیل سے بتایا۔ ''بھارت کے کشمیر میں بھی ہماری ہی طرح شدید سیلاب آیا ہے۔ وہاں کا پانی ڈھلوان ہونے کے باعث قدرتی طور پر ہماری طرف بہتا ہے۔ بیٹا! ایسا قدرت اور جغرافیے کی وجہ سے ہوا اور اس میں سیاست کا لینا دینا نہیں۔'' میں اب اپنی معلومات کو اپنا دفاع کرنے میں استعمال کر رہا تھا۔

لیکن وہ اب بھی مکمل طور پر قائل نہیں ہوئی۔ یہ ظاہر تھا کہ اس دن اسکول کے اساتذہ اور ہم جماعتوں نے سیلاب پر بحث کی تھی۔ ''اچھا ٹھیک ہے' میں عامر خان کو لکھوں گا کہ وہ اپنی حکومت کو مجبور کرے' اضافی پانی پاکستان کی جانب نہ چھوڑا جائے۔''

بات ہنسی میں ختم ہوگئی' لیکن مجھے اسے یہ سمجھانے کے لیے بہت کوشش کرنی پڑی کہ میں بھارت کا دفاع کرنے کے بجائے صرف حقائق بیان کر رہا ہوں۔

مجھے بالکل ایسا ہی ایک اور جھٹکا کچھ دن پہلے تب لگا جب میں اپنے دفتر کی ملازمہ سے رسمی بات چیت کر رہا تھا۔ وہ اوکاڑہ میں اپنے گاؤں عید منا کر واپس آئی تھی۔

علیل والدہ' اور خانہ بدوش قسم کے بھائی کے علاوہ اس کو ایک اور پریشانی لاحق تھی ''زراعت کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے' نہروں میں پانی نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا ''پانی کہاں گیا؟''

''بھارتیوں نے سارا پانی روک لیا ہے۔''

اس نے یہ بات کچھ ایسے اعتماد سے کہی کہ مجھے لگا' جیسے وہ خود بھارت نامی ایک اژدھے کو پاکستان کے سارے دریاؤں کا پانی پیتے ہوئے دیکھ آئی ہے۔ لیکن اس نے کسی زمیندار کو آبپاشی اہلکاروں کی مدد سے پانی چوری کرتے نہیں دیکھا تھا۔

نفرت کی اس نئی قسم کو جس میں پانی کے تمام پاکستانی مسائل کا ذمہ دار بھارت کو ٹھہرایا جاتا ہے' پاکستان میں خاصی پذیرائی مل رہی ہے۔

لیکن اس کے مدمقابل دلیل اتنی زیادہ تکنیکی ہے کہ عام شخص نہیں سمجھ سکتا۔ اس سے زیادہ آسان فہم بھارت مخالف تنظیموں کی گاڑیوں پر لگی وہ تصویر ہے جس میں بھارتی اور پاکستانی جانب کے راوی دریا کا موازنہ کیا گیا ہے۔ اس تصویر میں پاکستانی دریا بالکل خشک نظر آتا ہے۔

پاکستان میں بنیادی طور پر مسئلہ کشمیر کے باعث بھارت سے نفرت نے جنم لیا۔ ۱۹۸۰ء میں ہماری توجہ مغربی سرحدوں کی جانب ہوگئی۔ جب تک وہاں سے واپس آئی، عالمی رائے میں آزادی کی جدوجہد دنیا بھر میں بڑھتے دہشت گردی کے نظریات سے گڈمڈ ہوگئی۔ پچھلے ٦٧ سال میں ہم نے کشمیر پر جنگیں لڑیں۔ دراندازی کی اخلاقی اور سفارتی حمایت کی، مذاکرات کیے، معاہدوں پر دستخط کیے، لیکن مسئلہ جوں کا توں رہا۔ اب اس مسئلے کو وہ توجہ نہیں ملتی جو ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ملا کرتی تھی۔ بہرحال یہ مسئلہ زندہ ہے۔

لیکن ہمارے پانی کے مسائل حقیقی ہیں اور عام آدمی ان سے خاصا تعلق رکھتا ہے۔ چناں چہ ان کا ذمہ دار بھارت کو ٹھہرا کر نفرت کا سیلاب لانا ممکن ہے۔

پاک و ہند میں موسمی آفات کی شدت بڑھ رہی ہے۔ موسمیاتی تبدیلیوں پر کام کرنے والے ماہرین کے مطابق جنوبی ایشیا کا مستقبل تاریک ہے۔ آنے والے برسوں میں ہمالیہ کے گلیشیئر پگھل کر غائب ہو جائیں گے۔ اس سے قبل سیلاب آئیں گے۔ بارشوں کا معمول تبدیل ہو جائے گا اور نتیجے میں زرعی پیداوار میں کمی واقع

جب دونوں دشمن ڈوبیں گے

بھارت اور پاکستان نے مل کر موسمی آفات کا سدباب نہ کیا، تو تباہی ہمارا مقدر بن سکتی ہے

طاہر مہدی

میری بیٹی نے اسکول سے واپس آتے ہی انتہائی اضطراب کی حالت میں مجھ سے پوچھا "آخر بھارت ہمارے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟"

یہ سوال کچھ اس انداز میں پوچھا گیا جیسے میں بھارت کا سفیر ہوں۔ اس نے تقریباً چیخ کر کہا "انھوں نے ہمارے پورے ملک کو ڈبو دیا ہے۔"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وسطی اور شمال مشرقی پنجاب میں سیلاب دو مغربی دریاؤں، جہلم اور چناب کے باعث آیا ہے اور اس میں انڈیا کا کوئی ہاتھ نہیں۔ یہ ان شدید بارشوں کی وجہ سے آیا جنھوں نے ہماری سڑکوں کو بھی اس قدر ڈبو دیا کہ آپ دو دن تک اسکول بھی نہیں جا سکیں۔"

لیکن میری مزید دلیلیں اسے قائل کرنے میں ناکام

اگلے ہفتے دادو کو واپس جانا تھا۔ رات کھانے کی میز پر انھوں نے سب کی موجودگی میں ایک عجیب فیصلہ سنا کر سب کو حیران کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ احسن گارڈ سے اپنے غیر اخلاقی روّیے پر معذرت کرے ورنہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں گی تاکہ اسے کہیں ملازمت دلوا سکیں...... کسی ایسی جگہ جہاں اس کی عزت نفس کو مجروح نہ کیا جائے۔

سبھی کے لیے یہ فیصلہ غیر متوقع تھا۔ بچوں کے لیے تو بڑا حیران کن اور ناقابل یقین ثابت ہوا۔ ان کے سامنے پہلی بار ایک ملازم کو اتنی اہمیت دی جا رہی تھی۔

مقررہ دن زبیدہ بیگم اور گارڈ آفتاب کا سامان ساتھ ساتھ بندھا پڑا تھا۔ سبھی خاموش الوداعی نگاہوں سے دروازے کے قریب کھڑے تھے۔ زبیدہ بیگم کی نگاہیں کسی کی منتظر معلوم ہوتی تھیں۔ سبھی موجود تھے سوائے احسن کے! اس کی ضدی طبیعت کا سبھی کو علم تھا، چناں چہ آنے کی امید کسی کو نہ تھی۔ لیکن منظر بدلتے کب دیر لگتی ہے؟

اس سے پہلے کہ آفتاب اپنا سامان اٹھا کر دروازے کی حد پار کرتا، اچانک احسن اس کے روبرو راستہ روکے آ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں چھپایا کاغذ سامنے کر دیا، جس پر جلی حروف میں یہ جملہ درج تھا: "پیارے انکل، مجھے معاف کر دیں۔"

یہ جملہ پڑھ کر سبھی حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور آگے بڑھتا اور احسن کے اقدام پر اسے داد دیتا ' آفتاب نے اسے یوں گلے لگا لیا جیسے ایک باپ اپنے بچھڑے بچے کو پا کر لپٹ جاتا ہے۔ دونوں رو رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

آفتاب سے ہاتھ چھڑا کر احسن دادو کے قریب آیا، ان کے قدموں میں بیٹھا اور ہولے ہولے بولا۔ میں نے اس دن آپ اور ماما کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں، ایک قوم جب اخلاقی اقدار سے بے پروائی برتنے لگے تو اسے دیوالیہ ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں اپنے رویے پر شرمندہ ہوں۔"

"جیتے رہو بیٹا! مجھے تم سے جلد پلٹ آنے کی امید تھی۔" داؤد نے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ پھر ان کے اشارے پر آفتاب نے سامان ایک جانب رکھا اور دروازے پر اپنی مخصوص جگہ جا کھڑا ہوا۔

◆◆◆

خوشبو جیسی باتیں

☆ ڈھونڈنے میں ملنے کی شرط نہیں ہوتی، امید ہوتی ہے اور امید سے جھگڑا نہیں کرتے۔
☆ فتنہ انگیز سچائی سے مصلحت آمیز جھوٹ بہتر ہے۔
☆ نفس کو اس کی خواہش سے دور رکھنا حقیقت کے دروازے کی چابی ہے۔
☆ غصہ کرنے کا مطلب ہے کہ ہم دوسروں کی غلطیوں کا بدلہ اپنے آپ سے لیتے ہیں۔
☆ کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں جو ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیرے میں راستہ دکھاتے ہیں۔
☆ بحث میں کسی کو لاجواب کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ بات کی جائے جس کا تعلق بحث سے نہ ہو۔
☆ کسی کی طرف انگلی نہ اٹھاؤ کیونکہ باقی تینوں انگلیاں آپ کی طرف ہیں۔
☆ چلتے ہوئے ہمیشہ خیال رکھو کہ تمھارے پاؤں سے اٹھتی ہوئی دھول سے کسی کی منزل نہ اوجھل ہو جائے۔

''یہ کیا بدتہذیبی ہے احسن''۔زبیدہ بیگم جو ماں بیٹے کی مختصر گفتگو سے کسی حد تک اصل معاملہ جان چکی تھیں، قریب آتے ہوئے غصے سے بولیں۔

''دادؤ بدتہذیب میں نہیں وہ بے ہودہ......''

تڑاخ......زبیدہ بیگم کا بھاری بھرکم ہاتھ اس کے چہرے پر اپنے نشان چھوڑ چکا تھا۔''میں نہیں سمجھتی تھی کہ تمھاری تربیت میں اس قدر کمی رہ گئی ہے۔''

''آپ بھی حد کرتی ہیں، بنا سنے اور سمجھے بچے پر ہاتھ اٹھا دیا۔''سلمٰی بیگم کو جس بات کا ڈر تھا' وہ آج پوری شدت سے رونما ہوچکی تھی۔

احسن کا چہرہ لال سرخ ہوگیا۔آنکھیں پانی سے لبریز ہوگئیں۔ بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں گیا اور اس زور سے دروازہ بند کیا کہ پورا گھر لرز اٹھا۔سارے گھر میں موت کا سا سکوت طاری ہوگیا۔سحر اور نور نے پورا منظر خاموش تماشائی کی طرح دیکھا۔ ان کی ہمدریاں بھائی کے ساتھ تھیں' لیکن دادو کے سامنے کچھ کہنے کی جرأت بھی نہ تھی۔سبھی اپنے اپنے کمروں میں جا دبکے' جبکہ زبیدہ بیگم دیر تک میڈیا اور مغرب زدہ معاشرے کو کوستی رہیں۔

......☆......

''احسن بہت پریشان ہے۔''زبیدہ بیگم کو قدرے خوشگوار موڈ میں دیکھ کر سلمٰی بیگم نے بات کا آغاز کیا۔

''اسے ہونا بھی چاہیے۔'' ان کا لہجہ یک دم بدل گیا۔

''وہ بچہ ہے......''

''نہیں سلمٰی بیٹی،تم تربیت کی کمی کو اس کے بچپنے میں چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔وہ بچہ نہیں کالج کا طالبعلم بننے والا ہے۔ہمارے بچپن میں بزرگوں کے آگے اونچی آواز میں بولنا انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا۔''

''لیکن اب حالات اور اس کے تقاضے بدل چکے۔ میں مانتی ہوں اس نے غلط کیا لیکن اب بچوں کو اتنا دبا کے نہیں رکھا جا سکتا۔''

''بہت خوب! کیا دلیل ہے۔زمانے کے تقاضے بدلے تو اخلاقی اقدار کو بدلنا بھی لازمی سمجھا گیا۔ زمانے کی ترقی اپنی جگہ لیکن اخلاقیات کے پیمانے بدلنا کہاں کی ترقی ہے؟ کیا بڑوں کا احترام اور انسانیت کی عزت کرنا جدید زمانے سے ہم آہنگ ہونے میں رکاوٹ ہے؟ یہ ہم بڑوں کی خام خیالی ہے سلمٰی بیگم کہ اب بچے بہت تیز ہو چکے...... انھیں تو پہلے سے زیادہ بڑوں کی راہنمائی کی ضرورت ہے۔''

سلمٰی بیگم خاموش سی ہوگئی جیسے ساس کی باتوں کے جواب میں موزوں دلیل سوچ رہی ہوں۔

''سلمٰی بیٹی، اس دور کا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنی اولاد کو بہترین اداروں میں تعلیم تو دلواتے ہیں لیکن ان کی تربیت اور کردار سازی سے یکسر بیگانہ ہیں۔ اخلاق کا زوال اخلاقی اقدار کی پاسداری ہی سے روکا جا سکتا ہے'اس کی تلافی اعلٰی تعلیمی اداروں میں پڑھانے یا دولت سے ممکن نہیں۔اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے گھر کو تربیت گاہ بنائیے اور بچوں کے سامنے اخلاقیات کا بہترین نمونہ پیش کیجیے۔بڑوں کا احترام کرنا،انسان کی بحثیت انسان عزت کرنا،اپنے ماحول کو صاف رکھنا،وقت کی قدر کرنا،یہ سب باتیں عام اور معمولی لگتی ہیں۔ لیکن ہمارے بلند کردار کی اساس یہی معمولی باتیں ہیں جنھیں ہم غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کیے جا رہے ہیں۔''

سلمٰی بیگم نے خاموشی سے سنا، کچھ سوچا اور چپ ہو گئیں۔بات اتنی واضح تھی کہ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔

......☆......

کا مصنوعی غصہ نظرانداز کرتے ہوئے جواب دیا: I know salam is the best greeting but you know، (مجھے معلوم ہے' سلام سب سے اچھا ہے) لیکن کیا کروں، انگریزی بولنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔'' اس کے انداز میں شرمندگی کی جھلک تک نہ تھی۔

برآمدے میں بیٹھی زبیدہ بیگم نے ماں بیٹے کی باتیں سنیں تو انھیں نظرانداز کر دیا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ بے وقت کی نصیحت بات کا آدھا اثر زائل کر دیتی ہے۔ سو وہ خاموش رہیں۔

احسن دو بہنوں کا اکلوتا بھائی اور ان کے لاڈلے بیٹے کا لاڈلا بیٹا تھا۔ کچھ اکلوتے پن نے اسے بگاڑنے میں اپنا کردار ادا کیا' کچھ زندگی کی آسائشوں نے اس میں بے پروائی کا رنگ نمایاں کر دیا۔

شہر کے پوش علاقے میں رہائش تھی۔ شاہ خرچ دوستوں کا ساتھ رہتا جن کے لیے زندگی کا فلسفہ لمحاتی خوشیوں کا حصول اور ان میں مست رہنا تھا۔ سلمیٰ بیگم بھی مغربی خیالات کی حامی تھیں لہٰذا اکثر بچوں کو ڈھیل دے جاتیں۔ مگر اب نتائج بدنظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ عام حالات میں تو انھیں بچوں کے طور اطوار میں خامیاں نظر نہ آتیں لیکن ساس کی موجودگی میں انھیں بہت محتاط رہنا پڑتا۔

ساس بے جا مداخلت کی قائل نہ تھیں لیکن مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید کرنا انھیں سخت ناپسند تھا۔ وہ اپنے پوتے پوتیوں کو وہی مذہبی و مشرقی ماحول دینا چاہتی تھیں جس میں انھوں نے خود پرورش پائی تھی۔ جب کہ بہو کا خیال تھا کہ حالات اور ان کے تقاضے یکسر بدل چکے۔ یہی وہ نکتہ اختلاف تھا جہاں دونوں کا ایک دوسرے کو قائل کرنا کارے دارد بن جاتا۔

سلمیٰ بیگم کی کوشش ہوتی کہ جب بچے ان کے پاس ہوں، تو وہ بھی ساس کے قریب رہے تاکہ ناخوشگوار واقعہ جنم لینے سے پہلے بات سنبھال لی جائے۔ لیکن بھلا ہونی کو کون روک سکتا ہے؟ وہ باورچی خانے میں مصروف تھیں جب احسن چیختا چلاتا گھر داخل ہوا۔

''ماما کدھر ہیں آپ؟ come here'' (ادھر آئیے)۔''

زبیدہ بیگم کتاب کے مطالعے میں مصروف تھیں۔ احسن نے آج غصے میں انھیں یوں نظرانداز کر دیا گویا دیکھا ہی نہ ہو۔ سلمیٰ بیگم سب کام چھوڑ چھاڑ کر بھاگی ہوئی آئیں۔

''ماما اس گارڈ کے بچے کو ابھی اور اسی وقت نوکری سے نکال دیں۔ He is so arrogent' (وہ بہت بدتمیز ہے)۔''

''ہوا کیا ہے؟'' سلمیٰ بیگم نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور اشارتاً دادو کی موجودگی کا احساس بھی دلایا۔ لیکن وہ برابر بولے جا رہا تھا:

''یہ ہوتا کون ہے میرے دوستوں کو اندر آنے سے پہلے پوچھ گچھ کرنے والا؟ کیا ان کا اتنا بتانا کافی نہ تھا کہ وہ میرے دوست ہیں۔ پھر اس نے کل دیر تک انھیں باہر کیوں روکا کہ وہ بنا مجھے ملے ناراض ہو کر چلے گئے؟'' شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''اچھا تم اپنے کمرے میں چلو' میں خود اس سے پوچھ لوں گی۔'' انھوں نے اسے سمجھانے کے انداز میں نرمی سے کہا۔

''نہیں آپ ابھی اور اسی وقت اس سے بات کریں۔'' ماں کے نرم لہجے کا بیٹے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کی آواز میں بدستور غصہ اور جھنجلاہٹ تھی۔

واپسی

نئے دور کے تقاضے اپنی جگہ مگر کیا ان کی خاطر ہم اپنی اخلاقی اقدار بھی بدل لیں...... ایک سبق آموز معاشرتی کتھا

نورین قادر قریشی

''ہیلو ایوری باڈی'' احسن نے گھر میں داخل ہوتے ہی سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''سلام کیا کرو احسن، یہ کون سا انداز ہے گھر میں داخل ہونے کا۔'' سلمٰی بیگم نے غصے سے بیٹے کو گھورتے ہوئے متنبہ کیا۔ ویسے تو انھیں بچوں کی مغرب پرستانہ عادات پہ خاص اعتراض نہیں تھا لیکن اپنی ساس زبیدہ بیگم کی آمد کے بعد وہ کافی احتیاط کرنے لگی تھیں۔

''ارے مام! یہ آج کل کا ''لیٹسٹ'' انداز ہے۔'' اس نے ماں

ڈپارٹمنٹ بنانے کی ابتدائی وجہ انتہائی مضحکہ خیز تھی۔ ہوا یہ کہ بلدیہ عظمیٰ کے بلڈنگ کنٹرول ڈپارٹمنٹ کا ایک انسپکٹر گورنر صاحب کی بہن کے گھر پہنچا جو زیرِتعمیر تھا۔ وہاں اس نے کچھ غلط کام ہوتے دیکھے جنھیں نظر انداز کرنے کی خاطر اس نے رشوت طلب کر لی۔

اس امر کی شکایت بہن نے بھائی سے کر دی۔ گورنر کے حکم پر بڑوں نے سر جوڑا اور حل یہ نکالا کہ ایک نیا ادارہ بنایا جائے۔ اس میں اختیار کے مجاز ۱۸ گریڈ کے افسر ہوں۔ ان کا سربراہ ۱۹ گریڈ کا افسر بنے اور نچلے عملے کے اختیارات کم سے کم کر کے انھیں غیر فعال بنا دیا جائے۔ یوں کرپشن میں کمی ہو جائے گی۔ جب بڑوں کا یہ فیصلہ آخری مرحلے میں تھا تو مجھے بھی طلب کر لیا گیا۔ گورنر صاحب کی زیرِصدارت آخری فیصلے سے قبل طے ہو گیا تھا کہ میں نئے ادارے کا چارج سنبھال لوں گا۔

مجھ سے پوچھا گیا کہ نئے ادارے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے کہا کہ بے شک آپ یہ ادارہ قائم کر لیں، لیکن اگر افسروں کی تنخواہ نہیں بڑھی تو کرپشن چھوٹی سے بڑی سطح پر چلی جائے گی۔ میری بات سے گورنر صاحب کے مشیروں نے اتفاق نہیں کیا۔ چناں چہ میری رائے کے برخلاف نیا ادارہ قائم کر دیا گیا۔ تب میں خاموشی سے لمبی رخصت پر چلا گیا۔ تقریباً دو سال بعد میئر عبدالستار افغانی کے اصرار پہ بلدیہ عظمیٰ اس وقت واپس آیا جب میری تقرری بحیثیت سپرنٹنڈنگ انجینئر کی گئی۔

کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی میں بے شمار افسر بھر لیے گئے۔ پہلے بلدیہ میں کل دو افسر (آرکیٹکٹ کنٹرول اور اسسٹنٹ کنٹرولر) اور کے ڈی اے میں بھی دو ہی افسر پورے کراچی کو کنٹرول کرتے تھے۔ اب چند دن بعد ہی اتھارٹی کے افسر اپنے ہاتھ دکھانے لگے جس کا مجھے پہلے ہی خدشہ تھا۔ یہ ڈپارٹمنٹ رشوت کھانے کے معاملے میں کے ڈی اے کے دوسرے محکموں سے بازی لے گیا۔ خاص طور پر بلڈرز نے غلط کام کروانے کے لیے اوچھے حربے استعمال کیے۔ یہ محکمہ بلڈنگ بائی لاز کی خلاف ورزی روکنے میں بری طرح سے ناکام رہا۔ بلکہ کہتے ہیں کہ بائی لاز کی خلاف ورزی ان کی ناک کے نیچے خود انھی کے مشورے سے ہوتی رہی۔ دن بدن اس محکمے کے حالات خراب تر ہوتے گئے اور کوئی اسے پوچھنے والا نہیں، جو ایک بلڈنگ انسپکٹر کے چند روپے رشوت طلب کرنے کی وجہ سے وجود میں آیا۔

◆◆●

لٹریچر

اردو کے ایک معروف شاعر کو گفتگو کے دوران اپنے ہر جملے میں انگریزی کا کوئی نہ کوئی لفظ ٹانکنے کی عادت تھی۔ وہ جب انگریزی کا کوئی نیا لفظ سنتے تو فوراً اپنے کسی ساتھی سے اس کے معنی بھی پوچھ لیتے۔ ایک دن دوران گفتگو لٹریچر کا لفظ سنا تو فوراً اپنے ساتھی سے پوچھ بیٹھے۔

’’یار یہ لٹریچر کے کیا معنی ہیں؟‘‘ ساتھی نے جواب دیا ’’ادب‘‘

اسی شام کافی ہاؤس میں مولانا چراغ حسن حسرت نے شاعر مذکورہ سے کہا۔ ’’عزیزم! سنا ہے کہ تم میرے بارے میں بڑی بک بک کرتے رہتے ہو۔‘‘

’’مولانا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو آپ کا بے پناہ لٹریچر کرتا ہوں۔‘‘ لٹریچر کی ترکیب استعمال سن کر مولانا دم بخود ہو گئے۔

اسپتال کے قریب کھلے میدان میں امام کعبہ نماز پڑھائیں گے، چناں چہ وہاں نماز کا بندوبست ۲۴ گھنٹوں میں کر دیا جائے۔ سب سے مشکل کام میدان ہموار کرا کے اس پر صف بندی کے لیے چونے سے نشان لگوانا تھا۔ پھر وضو کی جگہ کا بھی انتظام کرنا تھا۔ نیز امام صاحب کے لیے قدرے اونچا چھوٹا سا سایہ دار پلیٹ فارم (مصلّٰی) بنانا پڑا تاکہ وہ نمازیوں کو دور سے نظر آ سکیں۔

ساری رات جاگ کر عملے اور ٹھیکیدار کے آدمیوں نے کام کیا۔ اللہ کے فضل سے سارا کام بروقت مکمّل ہو گیا۔ مقررہ دن نماز پڑھنے کے لیے خلقت اُمڈ آئی۔ لوگ غالباً یہی سمجھ رہے تھے کہ امام کعبہ کے پیچھے نماز پڑھنے سے زیادہ ثواب ملے گا۔ نماز ختم ہوئی۔ جیسے ہی امام صاحب نے سلام پھیرا، مجمع ہڑبونگ کا شکار ہو گیا۔ ہر شخص امام صاحب کو قریب سے دیکھنے کا متمنّی تھا۔ بڑی مشکل سے امام صاحب کو سیکیورٹی والوں نے اپنے حلقے میں لے کر گاڑی تک پہنچایا۔ لوگ پھر امام کعبہ کے مصلّٰی پر لگی جھنڈیوں اور آرائش کی دیگر اشیا کو تبرک سمجھ کر لوٹنے لگے۔ انھوں نے سوائے تخت کے کوئی چیز نہ چھوڑی۔

ہم لوگ سعودی عرب کے فرمانروا حضرات اور وہاں کا آئمہ کرام کا کس قدر احترام کرتے ہیں، یہ ایک اور واقعے سے بھی عیاں ہے۔ ۱۹۵۵ء میں سعودی عرب کے شاہ سعود پاکستان تشریف لائے۔ اعلان ہوا کہ وہ نماز جمعہ پولو گراؤنڈ (موجودہ باغ قائداعظم) میں پڑھائیں گے۔ اس کا انتظام بلدیہ عظمیٰ کراچی نے کیا تھا۔ شاہ سعود کو دیکھنے کے اشتیاق میں ہم لوگوں نے بھی باغ قائداعظم میں نماز پڑھنے کا ارادہ کیا۔ اتفاق سے اسی روز ہمارے دھوبی جو کافی بزرگ تھے، اپنی گدھا گاڑی پر کپڑے لیے آ گئے۔ وہ یہ پروگرام بنا کر آئے تھے کہ شاہ سعود کی اقتدا میں نماز پڑھیں گے۔ ہم انھیں ساتھ ہی نماز پڑھنے لے گئے۔

لیکن شاہ سعود کے اصرار پر مولانا احتشام الحق تھانوی نے نماز جمعہ کی امامت کرائی۔ مولانا کو شاہ سعود نے پہلے ہی ایک خلعت عطا کر دی تھی جسے پہن کر وہ آئے۔ عربی لباس میں عرب ہی معلوم ہوتے تھے۔ ماشاءاللہ ان کی قرأت بہت عمدہ تھی۔ نماز احسن طریقے سے پوری ہوئی۔ لوگوں نے نماز کے تقدس کو برقرار رکھا۔ ہم لوگ واپس آ رہے تھے تو بزرگ دھوبی فرمانے لگے ''بابو! نماز پڑھنے کا مزا آ گیا۔ مکہ کے بادشاہ کی قرأت کتنی اچھی تھی۔''

ہم لوگوں نے ان کی سرشاری دیکھ کر مناسب نہیں سمجھا کہ انھیں بتائیں بابا، نماز مولانا احتشام الحق تھانوی نے پڑھائی ہے۔ مکہ کے بادشاہ نے نہیں۔ شاہ سعود کی آمد کے موقع پر ہی کراچی میں سعود آباد کی مشہور آبادی وجود میں آئی۔

کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی کا قیام

علاقہ لیاری میں ۱۹۷۶ء میں ایک چھے منزلہ عمارت (بسم اللہ بلڈنگ) اچانک سحری کے وقت زمیں بوس ہو گئی۔ اس حادثے میں ڈیڑھ سو کے قریب لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ تب بلدیہ کے محکمہ بلڈنگ کنٹرول کے سربراہ اتنے خوفزدہ ہوئے کہ چھٹی لے کر گھر بیٹھ گئے اور پھر مستعفی ہوئے۔ ایڈمنسٹریٹر بلدیہ عظمیٰ نے بلڈنگ کنٹرول ڈپارٹمنٹ کا اضافی چارج مجھے دے دیا۔ میں اس وقت ڈائریکٹر انجینئرنگ ڈیزائن کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ میں فروری ۱۹۷۹ء تک اس محکمے کا سربراہ رہا۔

اس زمانے میں کے ڈی اے (کراچی ڈیویلپمنٹ اتھارٹی) الگ ادارہ تھا۔ اب دونوں کو ملا کر نیا ادارہ بنایا گیا۔ جسے کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی (K.B.C.A) کا نام ملا۔ اس کا سربراہ چیف کنٹرولر بلڈنگز کو بنایا گیا۔ یہ

میں وہ سب گاڑی کے قریب پہنچ گئے۔ انھوں نے لڑکی کو گاڑی میں بیٹھے دیکھا' تو اسے گھیرے میں لے لیا۔ وہ سب مشتعل ہو کر شور مچا رہے تھے۔ اس آدمی نے انھیں کہا ''پہلے میری بات سنو! لڑکی کو کوئی گاڑی والا ٹکر مار کر بھاگ گیا ہے۔ میں کھڑا یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ یہ صاحب وہاں سے گزر رہے تھے' ان کی مہربانی کہ انھوں نے گاڑی روکی۔ ہم اسے گاڑی میں ڈال کر تمہارے پاس لائے ہیں تاکہ اسپتال لے جائیں۔''

یہ سن کر وہ لوگ خاموش ہو گئے۔ انھوں نے لڑکی کو گاڑی سے اتارا' اسے چلا پھرا کر دیکھا' بات چیت کی کہ تمھیں تکلیف تو نہیں؟ لڑکی اسپتال جانے سے گھبرا رہی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے اور اسپتال نہیں جائے گی۔ پھر اس کے گھر والوں نے ہمارا شکریہ ادا کیا کہ اسے ان کے پاس پہنچا دیا۔ اب وہ رخصت چاہتے تھے۔

میرے ساتھی نے مجھے کہا ''جہاں آپ نے اتنی ہمدردی کی ہے' ان غریب لوگوں کو کچھ رقم دے دیجیے تاکہ وہ بچی کو دودھ وغیرہ پلا سکیں۔'' میں نے انھیں چند سو روپے دیے۔ یوں اس آدمی کی حاضر دماغی سے میں ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے سے بچ گیا۔

ابھی میں لڑکی کے گھر والوں کو رقم دے ہی رہا تھا کہ اس فرشتہ صفت انسان نے مجھے سلام کیا اور رخصت چاہی۔ میں نے بہت کہا کہ گاڑی میں بیٹھیے' میں آپ کو منزل تک پہنچا دوں' لیکن وہ ہاتھ ہلاتا پیدل ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

غلام ابن غلام ابن غلام

میں ان دنوں بلدیہ عظمیٰ کے ڈویژن نمبر۲ میں منتظم انجینئر (Executive Engineer) تھا۔ میرے ماتحت ایک نائب قاصد' نبی یار خان مجھ سے عمر میں بڑے' نہایت ایماندار اور نستعلیق آدمی تھے۔ میرا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ میں ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ ہمیشہ صاف ستھری وردی میں ملبوس رہتے اور گفتگو بہت ہی مہذب طریقے سے کرتے۔ پاکستان آنے سے قبل کسی راجواڑے کے کارندے رہ چکے تھے۔ اس معاشرے کا اثر ابھی زائل نہیں ہوا تھا۔ ایک دن مٹھائی کا ڈبا لے کر آئے۔ دعا سلام کے بعد میرے استفسار پر کہ مٹھائی کس خوشی میں لائے ہیں؟ فرمانے لگے ''حضور! غلام کے غلام کے یہاں گزشتہ رات ایک اور غلام کا اضافہ ہوا ہے۔''
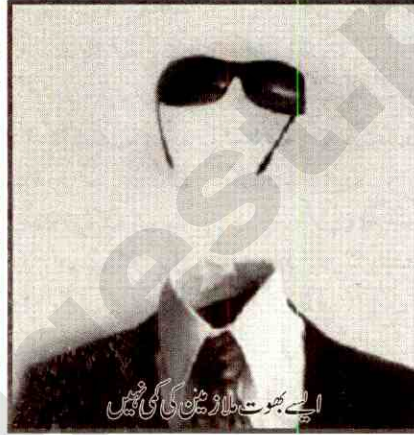
ایسے بھوت ملازمین کی کمی نہیں

یہ سن کر پہلے مجھے حیرت ہوئی' پھر سمجھ گیا کہ خاں صاحب کے ہاں پوتا ہوا ہے۔ میں نے انھیں مبارکباد دی' تو بہت خوش ہوئے۔ یہ چھوٹا غلام ۱۹۷۵ء میں آیا تھا۔ اب تو غلام ابن غلام ابن غلام کے ہاں بھی غلام آ گیا ہوگا۔

امام کعبہ کی پاکستان آمد

۱۹۷۵۔۷۶ء کی بات ہے۔ ایک دن حکومت سندھ کا یہ نادر شاہی حکم بہ توسط ایڈمنسٹریٹر بلدیہ عظمیٰ ملا کہ آغا خان

وہ اپنے علاقے سے تمہارا تبادلہ کرا کر چھوڑیں گے۔ میں نے جواب میں یہی کہا کہ اللہ مالک ہے۔ ایڈمنسٹریٹر کے ایم سی کے دفتر میں میٹنگ شروع ہوئی۔

جب میرے ڈویژن/علاقے کی بات آئی تو منسٹر صاحب نے تلخ لہجے میں کہا "یہ افسر میرا کوئی کام نہیں کرتا۔" اس سے پہلے کہ وہ میری مزید بے عزتی کرتے' میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرے دائیں بائیں بیٹھے دوسرے افسران میری قمیص پکڑ کر کھینچنے لگے تاکہ میں بیٹھ جاؤں۔ لیکن میں نے کھڑے ہوتے ہی کہا "آپ غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔" پھر ان کے سامنے ان کاموں کی فہرست پیش کی جو میرا محکمہ مختص کردہ رقوم کے مطابق انجام دے چکا تھا۔ ہاں ان سڑکوں پر کام نہیں ہوا جن پر موصوف کے کارندے غیرقانونی طور پر کرانا چاہتے تھے۔ وزیر صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

فرشتہ رحمت کی مدد

ستمبر ۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ میری خالہ کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔ (چند دن بعد اُن کا انتقال ہو گیا) انھیں لیاقت نیشنل اسپتال داخل کرایا گیا۔ ہم لوگ چند دن کے لیے اپنے نارتھ ناظم آباد والے مکان میں رک گئے۔ میں روز صبح اسپتال چلا جاتا۔ خالہ کے پاس کچھ دیر رکنے کے بعد اپنے دفتر چلا جایا کرتا۔ ایک دن صبح جونہی بس کے قریب سے گزرا تو گیارہ بارہ سالہ لڑکی بھاگتی ہوئی اچانک سامنے آ گئی۔ میں نے فوراً بریک لگائی مگر وہ بونٹ سے ٹکرا ہی گئی۔

میں گھبرایا ہوا گاڑی سے نیچے اترا۔ لڑکی گاڑی کے پیچھے سڑک پر گری پڑی تھی۔ بس اسٹاپ پر آٹھ' دس آدمی کھڑے تھے۔ کوئی بھی ٹس سے مس نہیں ہوا۔ سوچا' اب تو میں بڑی پریشانی میں پھنسنے والا ہوں۔ بہرحال پہلے لڑکی کو اسپتال لے جاؤں' پھر پولیس کو اطلاع دوں گا۔ میں ابھی لڑکی کو اٹھانے بڑھا ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کو مجھ پر رحم آ گیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس حادثے میں میری ذرا برابر غلطی نہیں تھی۔ لڑکی اچانک گاڑی کے سامنے آ گئی تھی۔

ہوا یہ کہ اللہ نے ایک رحمت کا فرشتہ بھیج دیا۔ وہ بھاگ کر آیا اور لڑکی کو اٹھایا تو اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی۔ وہ بس چوٹ لگنے کے صدمے سے رو رہی تھی۔ آدمی نے اسے سہارا دے کر چلایا' ہاتھوں کو اوپر نیچے کر کے دیکھا' وہ صحیح سالم تھے۔ البتہ چہرے پر بونٹ سے ٹکرانے کے باعث نیل پڑ گیا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ وہ سنگین نوعیت کے حادثے سے بچ گئی۔ دراصل ٹکر لگنے کے بعد جب گری تو اس کا جسم گاڑی کے نیچے لمبائی میں پہیوں کے متوازی رہا۔ اس لیے گرنے کے بعد وہ ٹائروں کے نیچے نہیں آئی۔ میں نے اس فرشتہ صفت آدمی سے کہا کہ اسے اسپتال لے چلتے ہیں۔

وہ بولا' پہلے اس کے گھر چلتے ہیں تاکہ وہاں سے کسی کو لے لیں۔ لڑکی کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی بھی تھا' جسے ہم نے نہیں دیکھا۔ وہ سڑک کی دوسری جانب کھڑا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ بہن گاڑی کے نیچے آ گئی ہے' تو روتا اور بھاگتا ہوا گھر والوں کو اطلاع دینے پہنچا۔ وہ کریم آباد والے پل کے نیچے جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ جب انھوں نے حادثے کی بابت سنا تو ڈنڈے لیے گاڑی والے کو مارنے نکلے۔ میں گاڑی چلا رہا تھا۔ وہ آدمی پیچھے لڑکی کے ساتھ بیٹھا۔ لڑکی ہمیں اپنے گھر کا پتا بتاتی رہی۔

جب ہم جھونپڑوں کے قریب پہنچنے والے تھے کہ دیکھا' دس پندرہ آدمی لٹھ لیے چلے آ رہے ہیں۔ لڑکی نے بتایا کہ وہ اس کے اعزہ ہیں۔ تب آدمی نے مجھ سے کہا' آپ گاڑی روک دیں' میں ان سے بات کرتا ہوں۔ اتنے

حکومت سندھ کے ایک بڑے آفیسر سے رشتہ داری ہے۔ اس نے معاملہ دبایا اور موصوف کو پاکستان سے باہر بھجوا دیا۔ انھوں نے وہاں جا کر کیا گل کھلائے' اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہاں تو وہ لاکھوں روپے ہڑپ کر گئے اور ان کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔

بدماغ وزیر

۱۹۸۹ء میں پیار علی الانہ ایک سیاسی پارٹی کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ احساس برتری کا شکار (اُن کی گردن ہمیشہ اکڑی رہتی)' بدماغ اور کانوں کے کچے آدمی تھے۔ سندھ اسمبلی میں اپنی جماعت کی طرف سے کراچی کی نمائندگی کرتے اور پڑھے لکھے آدمی تھے' اس لیے صوبائی وزیر تعلیم بنا دیے گئے۔ ان کے والد' غلام علی الانہ (جی الانہ) انتہائی شریف' بااخلاق' عظیم دانشور اور کراچی کے میئر رہ چکے تھے۔

ان دنوں بلدیاتی نظام قائم نہیں تھا اور شہر کا انتظام ایڈمنسٹریٹر کے ہاتھوں میں تھا۔ میری خوش قسمتی کہ بلدیہ عظمٰی کے ایڈمنسٹریٹر' ایم اے مجید (محمد عبدالمجید) بنائے گئے۔ وہ انتہائی سمجھدار' مردم شناس اور خاص طور پر مجھ پر مہربان تھے۔ کچھ سال بعد وہ جب پچاس سال کے ہوں گے' اچانک دل کا شدید دورہ پڑنے پر انتقال کر گئے۔ اللہ تعالٰی اُن کی قبر کو تاحدِ نگاہ روشن رکھے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔

میں وزیر تعلیم کے حلقہ انتخاب میں ایگزیکٹو انجینئر تھا۔ ویسے تو بلدیہ والوں کا وزرا سے واسطہ نہیں پڑتا۔ لیکن وزیر صاحبان ان دنوں اپنے علاقوں کے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے کونسلروں کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ اس لیے ان کے نمائندے آئے دن افسروں کے پاس اپنا کام کرانے چلے آتے۔ خوامخواہ کا دباؤ ڈالتے اور غلط کام نہ ہونے کی صورت میں وزیروں سے جا کر افسروں کے خلاف الٹی سیدھی باتیں کیا کرتے۔

وزیر تعلیم کو مجھ سے بغض للہی ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے یہ کہہ کر وزیر تعلیم کے کان بھرے کہ میں جماعت اسلامی کا آدمی ہونے کی وجہ سے ان کے کام کرنے میں لیت و لعل سے کام لیتا ہوں۔ ایک دفعہ انھوں نے وزیر بلدیات' جام صادق علی سے کہا کہ مجھے گھر بٹھا دیا جائے۔ لیکن وزیر بلدیات نے ایڈمنسٹریٹر کے ایم سی سے بات کرنے کے بعد ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اب ان کی ناراضی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

ایک دن انھوں نے ایڈمنسٹریٹر کے ایم سی کے پاس میٹنگ رکھوائی۔ وزیر تعلیم کے آدمیوں نے مجھے اطلاع دی کہ اب منسٹر صاحب تمھاری اچھی طرح خبر لیں گے۔ آج

بھارتی طیارے کراچی میں بم باری کرتے ہوئے

میں نے پونے نو بجے اپنے سامنے حاضری لگوائی تو پتا چلا کہ ۹۵ ملازمین میں سے جن میں سپروائزری عملہ (۵ عدد) بھی شامل تھا' صرف چالیس کارکن موجود ہیں۔ بقایا پچاس کارکن غیر حاضر تھے۔ سب انجینئر نے مختلف توجیہات پیش کیں اور کہا کہ ان میں سے بیشتر افسروں کے گھر کام کرتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ سب کو بلا لیں' میں اگلے ہفتہ پھر حاضری چیک کروں گا۔ تاریخ کا تعین یوں نہیں کیا کہ وہ جعلی کارکنوں سے تعداد پوری نہ کر دیں۔ میرا یہ اعلان موصوف نے فوراً ورکر یونین تک پہنچا دیا جو ان دنوں خاصی فعال تھی۔

یونین کے لیڈر میرے پاس آئے اور مجھے سمجھانے لگے کہ میں ایگزیکٹو انجینئر ہوں' میرے ماتحت اسسٹنٹ ایگزیکٹو انجینئر' اسسٹنٹ انجینئر صاحبان آتے ہیں اور پھر ان کے ماتحت سب انجینئر صاحبان ہیں۔ یہ میرے فرائض منصبی کے خلاف ہے کہ اتنے بڑے عہدے پر ہوتے ہوئے میں سب سے کم گریڈ (کارکنوں کا گریڈ ایک تھا) والوں کی حاضری چیک کروں۔

میں نے ان سے کہا کہ مجھے کہاں روز روز اتنی فرصت ہے کہ صبح صبح کارکنوں کی حاضریاں چیک کرتا پھروں۔ لیکن مجھے اپنے علاقے میں فوری کام چاہیے۔ میرے پاس شکایت آئی کہ کارکن کم ہیں۔ میں مزید پچاس نئے کارکنان کی حکام بالا سے منظوری لے لوں تو میرے احکام کی فوری تعمیل ہو سکے گی۔ میرے علم میں ہے کہ ہمارے پاس چار ٹرک ہیں۔ ان پر اگر بیس مزدور فی ٹرک بھیجے جائیں تو ۸۰ مزدور کافی ہوں گے۔ جبکہ مجھے مزدور کہیں کام کرتے کسی سڑک پہ نظر آئے تو ان کی تعداد آٹھ' دس سے زیادہ نہیں تھی۔ اب میں مزید بغیر بتائے حاضری چیک کروں گا۔ سب انجینئر رجسٹر پر جتنے کارکن ہیں' ان کی تعداد پوری دکھائیں اور انھیں صحیح طرح کام پر لگا دیں تاکہ سڑکوں کے ٹوٹے حصے کم وقت میں درست ہو جائیں۔ تب مجھے حاضری لینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

جب میں نے بغیر اطلاع کے دو دفعہ حاضری لی تو کارکنوں کی تعداد ۴۰ سے بڑھ کر ۶۵ ہو گئی۔ ان میں ۱۵ کارکن وہ بھی شامل تھے جو افسروں کے گھر کام کر رہے تھے۔ تیس کارکن سرے سے غائب پائے گئے۔ ان میں سے چند وفات پا چکے تھے۔ چند نوکری چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ بقایا جعلی کارکن/بھوت کارندے (Ghost Workers) تھے۔ مزے کی بات یہ کبھی سالہا سال سے اوورٹائم بھی لے رہے تھے۔

میں نے اس اسکینڈل کی جامع رپورٹ بنا کر حکام بالا کو بھجوا دی۔ سب انجینئر کو تو فوراً معطل کروا دیا۔ حکام بالا نے معاملہ اینٹی کرپشن والوں کو دے دیا۔ یہ خبر عام بھی نہیں ہوئی تھی کہ سب سے پہلے ''ڈان'' اخبار نے تفصیلی خبر شائع کی۔ ''بھوت کارندے'' (Ghost Workers) کے عنوان سے ایڈیٹوریل لکھا اور دوسرے محکموں میں بھی جانچ پڑتال کا مطالبہ کیا۔

لیکن اس ساری محنت اور دوڑ دھوپ کا صلہ مجھے کیا ملا؟ یہ کیس اینٹی کرپشن کورٹ میں چلا گیا' جہاں مجھے ہر پیشی بھگتنا پڑتی۔ بلدیہ کے وکیل مجھے کورٹ میں بٹھا کر دوسرے مقدمات بھگتانے چلے جاتے۔ سب انجینئر نے کرمنل کیسز کرنے والے مشہور وکیل' مظفر حسین شاہ کو اپنا وکیل مقرر کر لیا جو بعد میں سندھ اسمبلی کے اسپیکر بھی بنے۔ وہ کورٹ میں پیش ہو کر لمبی تاریخ لے لیا کرتے۔ پھر اس نے اتنی لمبی تاریخ لی کہ کچھ پتا ہی نہیں چلا' کیس کا کیا بنا۔ حالانکہ میں کیس داخل ہونے کے بیس سال بعد ریٹائر ہوا۔ درمیان میں یہ ضرور معلوم ہوا کہ متعلقہ سب انجینئر کی

اب پہلے سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ ہم من حیث القوم ہر قدم پستی کی طرف بڑھا رہے ہیں۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے ؎

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا
(مولانا ظفر علی خاں)

بھوت کارندے (Ghost Workers)

۱۹۷۳ء میں بلدیہ کراچی کے محکمہ انجینئرنگ میں گریڈ ۱۸ سے گریڈ ۱۹ میں ترقی کا معاملہ بورڈ میں پیش ہوا۔ بورڈ کی صدارت ایم اے مجید ایڈمنسٹریٹر بلدیہ عظمیٰ کر رہے تھے۔ پانچ آدمی انٹرویو کے لیے بلائے گئے۔ دو اپنی سینیارٹی کی وجہ سے چن لیے گئے۔ باقی تین میں مجھے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ایک صاحب سے سینئر ہونے کے باوجود سب سے آخر یعنی پانچویں نمبر پر رکھا گیا۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ مجھے عملی کام (Construction) کا تجربہ نہیں۔

بنکاک میں بارش کا منظر

اس بات کو ایڈمنسٹریٹر نے نوٹ کیا کہ یوں تو ہمیشہ ڈیزائن آفس میں کام کرنے کے باعث میرے ساتھ زیادتی ہوتی رہے گی۔ لہٰذا انھوں نے ازخود میرا تبادلہ ایگزیکٹو انجینئر ڈویژن نمبر۲ کی حیثیت سے کر دیا۔ تب اسی ڈویژن میں سب سے زیادہ ترقیاتی کام ہوتے تھے۔ یہ ڈویژن جنوب میں لائنز ایریا، شمال میں گلشن اقبال، مشرق میں محمود آباد اور مغرب میں لیاری ندی تک کے درمیان میں آنے والے تمام علاقوں پر مشتمل تھا۔

جب میں نے اپنے ڈویژن کی کارکردگی پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ چھوٹے چھوٹے کام میرے کہنے کے باوجود وقت پر نہیں ہوتے۔ مزید تحقیقات کی تو پتا چلا کہ عملہ ناکافی ہے۔ دوسرے مرمت کا سامان رقم خرچ ہونے کے باوجود اسٹور میں وقت پر موجود نہیں ہوتا۔ یہ جان کر میں چوکنا ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے کارکنوں (جمعدار، مالی وغیرہ) کی حاضری چیک کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک دن بغیر بتائے حاضری کے وقت آٹھ بجے اسٹور پہنچ گیا جہاں ان کی حاضری لگتی تھی۔

وہاں سب انجینئر جنھیں حاضری لینی تھی، خود موجود نہیں تھے۔ رجسٹر ان کی دراز میں بند تھا۔ وہ ساڑھے آٹھ بجے تشریف لائے۔ میرے اچانک آنے اور حاضری رجسٹر مانگنے پر سٹپٹائے۔ بہرحال رجسٹر دیا۔ جسے کھولتے ہی میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اُس روز مہینے کی دس تاریخ تھی، لیکن حاضری ایک دن کی بھی نہیں لگی تھی۔ پتا چلا کہ سب انجینئر مہینے کی آخری تاریخ پر اپنی مرضی سے سب کی حاضری لگاتے اور اس کا ''محنتانہ'' وصول کرتے ہیں۔

نے الماری کے درمیانے راستہ میں حفاظت گاہ بنا رکھی تھی۔اس میں تینوں بچوں کو لیے بیٹھ گئے۔

کچھ دیر میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بم گرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ بم قریب ہی ڈیفنس' سلطان آباد' حبیب پبلک اسکول' حاجی کیمپ اور آئل ٹرمینل پر گرائے گئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گھر بری طرح ہل رہا ہے۔ دروازے' کھڑکیاں جن کے شیشوں پر کالے کاغذ لگے تھے' خوفناک آواز میں بج رہے تھے۔ چند کھڑکیاں زمینی جھٹکوں سے کھل گئیں۔ہم نے دیکھا کہ بھارتی جہاز بہت کم اونچائی پر اڑتے جا رہے ہیں۔ ایک جہاز نے فاسفورس بم پھینکا تو چاروں طرف روشنی پھیل گئی۔اس نے اطمینان سے آئل ٹرمینل پر بم گرایا اور واپس لوٹ گیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ جہاز ہماری اک اک گنوں کی حد سے نیچی پرواز کر رہے تھے' اس لیے نشانے پر نہ آ سکے۔ جب تک بمباری جاری رہی ہم لوگ بچوں کو سینوں سے لگائے خوفزدہ بیٹھے رہے۔ ان کے کانوں میں ہم نے پہلے ہی روئی ٹھونس دی تھی۔ مجھے یہی خدشہ ستاتا رہا کہ ہمارا آخری وقت آ پہنچا۔ جس طرح سے یہ گھر ہل رہا ہے' ہم کسی بھی لمحے اس کے ملبے تلے دب کا جام شہادت نوش کر جائیں گے۔ آخر خطرہ ختم ہونے کا سائرن بجا۔ میں نے پناہ گاہ سے نکل کر بتی جلائی۔ یہ دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہر چیز صحیح سالم تھی۔ البتہ قریب سے چیخ پکار اور ایمبولینس و فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کی مستقل آوازیں آ رہی تھیں۔

سلطان آباد' حبیب پبلک اسکول کے علاوہ ہمارے گھر سے قریباً ایک فرلانگ دور بم گرا تھا۔ اس نے پھٹتے ہی زمین میں کنوئیں جیسا بڑا گڑھا بنا دیا۔ یہ ایک کچی آبادی پر گرا تھا اس لیے بہت لوگ شہید ہوئے۔ پھر خالہ کا فون آیا' وہ بہت ناراض تھیں۔ بولیں' تم لوگوں کو وہاں رات رکنے کی کیا ضرورت تھی؟ دن کا اُجالا پھیلتے ہی ہم نے فوراً گاڑی نکالی اور خالہ کے پاس چلے گئے۔ پھر جب تک جنگ کا خاتمہ نہیں ہو گیا' ہم نے کوئنس روڈ کا رخ نہیں کیا۔

مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کو شکست ہوئی۔ جنرل نیازی نے بھارتی جنرل اروڑا سنگھ کے سامنے پلٹن میدان میں اپنی بیلٹ اُتار کر میز پر رکھی' اپنا پستول اس کے ہاتھوں میں دیا پھر پچانوے ہزار قیدی بھارتی فوج کے حوالے کر دیے۔

یوں مشرقی پاکستان علیحدہ ملک بنگلہ دیش بن گیا۔ شکست میں ہمارے فوجی حکمرانوں کا بڑا ہاتھ تھا' کچھ سیاسی طالع آزماؤں نے ملک کے دو ٹکڑے ہونے میں اپنی کامیابی سمجھی اور اقتدار پا لیا۔ انہی دنوں بھارت کی وزیراعظم نے کہا ''آج دو قومی نظریہ خلیج بنگال میں غرق ہو گیا اور ہم نے اپنے پرکھوں کا ہزار سال پرانا بدلہ لے لیا۔'' اس وقت تمام مغربی پاکستانی انتہائی صدمے سے دوچار تھے۔ خود مجھ سے اس دن کھانا نہیں کھایا گیا۔ کچھ دن طبیعت بہت بے چین اور پریشان رہی۔ پھر دھیرے دھیرے وقت نے دل پر صبر کا مرہم رکھ دیا۔

اس ڈرامے کے تین بڑے کرداروں کی جس طرح موت واقع ہوئی' وہ قدرت کا ایسا بھیانک انتقام ہے جس سے زندہ رہنے والوں کو سبق لینا چاہیے۔ بھٹو کو پھانسی کی سزا ہوئی اور اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی غیر فطری موت سے ہمکنار ہوئے۔ مجیب الرحمٰن اپنے پورے خاندان سمیت اپنے ہی فوجیوں کے ہاتھوں قتل ہوا' اس کی صرف دو بیٹیاں زندہ بچ سکیں جو ملک سے باہر تھیں۔ اندرا گاندھی اپنے سکھ محافظوں کے ہاتھوں ماری گئی۔ جبکہ اس کے بھی دو بیٹے غیر فطری طبعی موت کا شکار ہوئے۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن ہمارا اور ہمارے حکمرانوں کا حال

ہوتی ہے اور کبھی موسلا دھار! لیکن کراچی کی طرح سڑکیں زیرِ آب آنے یا ٹریفک معطّل ہونے کی صورت کبھی نظر نہیں آئی۔ ایک شب ہاسٹل میں سارے لڑکے سو چکے تھے۔ اچانک گرج‘ چمک اور لگاتار بجلی گرنے کی تیز آوازوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ یوں محسوس ہوا کہ شاید صور پھونک دیا گیا ہے۔ ہر پاکستانی لڑکا مبہوت اپنے اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ اگر کوئی غسل خانے میں تھا تو اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کمرے میں بستر پر جا کر لیٹ جائے۔ وہ خوفناک آوازوں اور بجلی و بادلوں کی تیز گڑگڑاہٹ سے ششدر ہو کر رہ گیا۔

میں تو یہی سمجھا کہ قیامت آ گئی۔ دل ہی دل میں دعائیں پڑھنے لگا۔ ہم دونوں ساتھیوں پر ایسا خوف طاری ہوا کہ ایک دوسرے سے بات کرنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ خیر اللہ کر کے یہ سلسلہ پندرہ منٹ بعد ٹوٹا اور پھر دھیرے دھیرے اختتام پذیر ہوا۔ میرا خیال تھا کہ آج بنکاک میں یقیناً تباہی آئی ہو گی‘ خوش قسمتی سے ہم دونوں بچ گئے۔

اب سب لڑکے ہمت کر کے باہر نکلے۔ ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ باہر معمول کا ہنگامہ جاری تھا۔ اگلے دن جب تھائی ساتھیوں سے رات والے واقعے کا ذکر کیا تو انھوں نے بتایا ”ہمارے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں۔ اس طرح کی گرج چمک اور تیز بارش کا سامنا تو ہم اکثر کرتے ہیں اور اس کے عادی ہو چکے۔“ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ہمارے لیے وہ شب قیامت صغریٰ سے کم نہ تھی۔

پاک بھارت جنگ

جنگ ۱۹۷۱ء میں کراچی دشمن کے خاص نشانے پر تھا۔ وہاں پاک بحریہ کا ہیڈکوارٹر واقع تھا تیل کے ذخائر بھی تھے۔ دوران جنگ آئے بھارتی طیارے کراچی پر حملہ کرتے۔ بحریہ والے ”اک اک گن“ چلاتے تاکہ انھیں بھگا سکیں۔ اسی وقت سائرن بجتے اور شہر تاریکی میں ڈوب جاتا۔ کوئنس روڈ پر واقع ہمارا گھر کیماڑی کی بندرگاہ سے قریب تھا۔ اس لیے ہم لوگ حفظ ماتقدم کے طور پر خالہ کے پاس نارتھ ناظم آباد منتقل ہو گئے۔ تین چار روز جب سائرن نہیں بجا اور خاموشی رہی تو

> انصار الحق قریشی کا قلمی نام گہر اعظمی ہے۔ آپ ۱۵/اکتوبر ۱۹۳۷ء کو اعظم گڑھ (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ بعدازاں والدین کے ہمراہ کراچی چلے آئے۔ تھائی لینڈ سے انجینئرنگ میں ماسٹرز کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۶۶ء میں بلدیہ عظمیٰ کراچی سے منسلک ہو گئے اور وہاں اعلیٰ عہدوں پر کام کیا۔ اکتوبر ۱۹۹۷ء میں ریٹائرڈ ہوئے اور تب سے تصنیف و تالیف کے کام میں منہمک ہیں۔
>
> عمدہ شاعر ہیں۔ کسی زمانے میں غزلیں کہیں‘ اب صرف حمد و نعت کہتے ہیں۔ آپ کی آپ بیتی ”میری کہانی‘ میری زبانی“ زیرِاشاعت ہے۔ قارئین کے زیرِمطالعہ تحریر اسی آپ بیتی کے اقتباسات پر مشتمل ہے۔ یہ آپ بیتی ہمارے معاشرے کے تاریک و روشن پہلو بڑی خوبصورتی سے سامنے لاتی ہے۔ اندازِ تحریر سادگی سے متصف ہے۔ جناب گہر اعظمی کی زوجہ ڈاکٹر ثنا قریشی (علم النسا قریشی) بھی نثر نگار اور شاعرہ ہیں۔

ایک روز ہم لوگوں نے سوچا کہ چل کر گھر کی خبر لیں اور بچوں کے اور اپنے کپڑے وغیرہ لے آئیں۔ ہمیں شام کو واپس آنا تھا۔ شام پڑی تو سوچا کہ چلو آج رات گھر پر ہی گزار لیتے ہیں۔ اسی رات ہماری شامت آ گئی۔ رات ایک بجے کے قریب خطرے کا سائرن بجنے لگا۔ ہم لوگوں

ہونے کی توفیق عطا فرمائے:

کسی نے پوچھا جعفر برمکیؒ سے
کہ عیب ہوتے ہیں کتنے آدمی میں
جواب اس کو دیا حضرت نے فوراً
کہ عیب ہوتے ہیں بے حد ہر کسی میں
مگر انساں کی خوبی ہے اک ایسی
اگر موجود ہو وہ آدمی میں
تو چھپ جاتے ہیں سارے عیب اس کے
نہیں ہوتا وہ رسوا زندگی میں
یہ پوچھا اس نے پھر حضرت بتائیں
وہ خوبی کون سی ہے اور کیا ہے
جواب اس کو دیا تب آپ نے یہ
''زباں پر قابو'' کا رتبہ بڑا ہے

ویسے ایک اچھا انسان بننے کے بارے میں کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

دردِ شقیقہ (Migraine) کی تشخیص

مجھے بنکاک پہنچے چند ہی روز ہوئے تھے کہ ایک روز سر میں شدید درد ہوا جو کئی گھنٹے رہا۔ پھر قے پر منتج ہو کے دھیرے دھیرے ختم ہوا۔ دماغی اور جسمانی طور پر مجھے کچھ کمزوری محسوس ہوئی چناں چہ ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ اس نے میری ساری روداد سنی تو پھر سوال کیا کہ کیا کبھی ایسا درد پہلے بھی ہو چکا ہے؟ سوچنے پہ یاد آیا کہ چار سال قبل بھی اسی طرح کا سردرد ہوا تھا۔ آرام مجھے قے ہونے کے بعد ہی ملا تھا' حالانکہ اس روز میں خیالوں سے درد بھگانے کے لیے زبردستی رئیس احمد جعفری کا ضخیم ناول نازلی پڑھتا رہا' لیکن جوں جوں میں ناول کے صفحات الٹتا' درد بڑھتا رہا' درد سے نجات کے بعد میں نے آرام کیا اور اسے وقتی بے اعتدالی سمجھ کر کسی سے اس کا اظہار بھی نہیں کیا اور نہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔

جب ڈاکٹر کو ہاں میں جواب دیا تو اس نے کہا کہ تم دردِ شقیقہ (Migraine) کا شکار ہو چکے۔ یہ درد اب وقفے وقفے سے تمھیں آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن گھبرانے یا پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہ وقتی اور ذہنی اور جسمانی طور پر بے ضرر ہے۔ جب کبھی سر میں تکلیف محسوس ہو' بلاتاخیر درد کی گولی کھا لو۔ پھر یہ درد رک سکتا ہے۔ تاخیر کی صورت میں اپنے پورے وقت کے بعد ہی ختم ہو گا۔ اس مرض کا ابھی کوئی علاج دریافت نہیں ہوا۔

مجھے بنکاک میں دوبارہ مرض نے پریشان نہیں کیا۔ لیکن جب واپس کراچی پہنچ گیا تو پہلے لمبے وقفے اور پھر دو تین مہینوں بعد اس درد نے حملہ شروع کر دیا۔ اس درد کی وجہ سے میں خود تو پریشان رہا ہی ساتھ بیوی اور بچوں کو بھی پریشانی میں مبتلا رکھا۔ درد زیادہ ہونے کی صورت کمرے میں پردے کھینچ کر تنہا لیٹ جاتا۔ کسی قسم کی آواز یا شور انتہائی ناگوار ہوتا۔ سر دبانا یا چھونا گراں گزرتا۔ البتہ سر کے گرد چادر یا دوپٹہ لپیٹنے سے کسی قدر آرام محسوس کرتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات سمجھ میں آئی کہ سر میں ذرا بھی بھاری پن محسوس ہو تو دو گولی پیناڈول کھا لو۔ ورنہ ذرا سی تاخیر پریشانی کا باعث بن سکتی ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ دردِ شقیقہ کے حملے کا وقفہ بھی بڑھتا گیا۔ شدت میں بھی کمی آتی گئی۔ اب اللہ کے فضل و کرم سے اس مرض سے میری جان چھوٹ چکی۔

بنکاک کی قیامت خیز شب

تھائی لینڈ کے شہر بنکاک میں موسم برسات کا اپنا عجیب لطف ہے۔ کبھی ہلکی ہلکی' وقفے وقفے سے بارش

میں اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات اللہ کو حاضر ناظر جان کر پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ پہلے اپنا ہلکا سا تعارف اپنی ۱۹۶۰ء کی خودنوشت ڈائری سے کرا دوں جو اتفاق سے میرے پاس ابھی تک محفوظ ہے۔

من آنم کہ من دانم:

ذات کا آئینہ جب دیکھا تو حیرانی ہوئی
میں نہ تھا گویا کوئی مجھ سا تھا میرے روبرو

''من آنم کہ من دانم'' ایک فارسی ضرب المثل ہے جس کے معنی ہیں ''میں جیسا ہوں خود ہی جانتا ہوں۔'' میں کیسا ہوں' کیا ہوں' اس سلسلے میں اپنی ایک پرانی ڈائری سے اقتباس درج ہے۔

''انصار عجیب آدمی ہے...... سوچ رہا ہوں آج ان حضرت کے متعلق بھی کچھ خامہ فرسائی ہو جائے۔ حضرت خود کو احساس برتری کا شکار بتلاتے اور اپنے آپ کو عقلمند ترین اشخاص میں شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ حکیم جالینوس یہ کہہ چکے ''احمق کی پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ خود کو دانا خیال کرتا ہے۔'' میں تو ان کی کمزوریوں سے واقف ہوں۔ لیکن جب کسی کے مقابلے پر آئیں تو ایسا چت گرتے ہیں کہ کپڑے جھاڑنے میں کافی دیر لگتی ہے۔

'' خود کو بہت معصوم ظاہر کرتے ہیں' لیکن ان کی نگاہیں اتنی بے باک ہیں کہ مجھے تنبیہ کرنی پڑتی ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ واقعی عجیب آدمی ہیں۔ یہ میں ہوں یا انور (بھائی) جو ان کی کمزوریوں سے واقف ہیں۔ ورنہ لوگ تو انہیں فرشتہ سیرت تصور کرتے ہیں۔ کہتے تو ہیں کہ بااصول ہوں' لیکن میرے اور انور کے خیال میں اتنا بے اصولا آدمی شاید پیدا ہی نہیں ہوا۔ دوسروں کی برائی کرنے سے نہیں چوکتے پھر بھی اُمید یہی رکھتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے۔ انہی جیسے لوگوں کی اصلاح کے لیے بہادر شاہ ظفر بہت پہلے کہہ چکے:

نہ تھی حال کی کچھ ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا
ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا' ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی' جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

حضرت دوسروں کو تلقین کرنے کے لیے جعفر برمکیؒ کا قول منظوم کر چکے۔ اللہ تعالیٰ انھیں خود بھی اس پر عمل پیرا

اجمل کا اہم کردار ہے۔ دراصل ۲۰۱۱ء میں سعید اجمل کچھ عرصہ وورسسٹر شائر کرکٹ ٹیم میں کھیلتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے معین کو "دوسرا" گیند کرنے کا طریقہ سمجھایا۔

"دوسرا" نامی گیند نامی گرامی آف اسپنروں کا خاص ہتھیار ہے جو عام آف اسپنر نہیں کرا سکتے۔ خود سعید اجمل کا کہنا ہے کہ معین علی "دنیا میں" پانچواں کھلاڑی ہے جسے "دوسرا" گیند کرانے کا طریقہ سمجھایا گیا۔

عجب اتفاق کہ معین نے بھارتیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے پہلی بار اپنی بالنگ کا جادو دکھایا۔ ماہ جون میں بھارت کے خلاف تیسرا ٹیسٹ ہوا۔ اس میں معین نے "دوسرا" گیند کی چمک دکھاتے ہوئے دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچا دی۔ معین نے اسی ٹیسٹ میں پہلی بار ۵ وکٹیں لیں۔

معین علی کی شاندار کارکردگی کے باعث برطانوی ٹیم وہ میچ جیتنے میں کامیاب رہی۔ اس نے چوتھے ٹیسٹ میں بھی بہترین کھیل دکھایا اور اپنی ٹیم کو جیتنے میں بھرپور مدد دی۔ معین کی کامیابیوں نے راتوں رات اسے برطانیہ میں تو ہیرو بنایا ہی جب کہ دیگر ممالک میں بھی جانی پہچانی شخصیت بنا دیا۔

معین علی کی کامیابیوں نے برطانیہ میں مقیم بھارتیوں کو چراغ پا کر دیا۔ اسی لیے بعدازاں دونوں ٹیموں کے مابین ٹوئنٹی ٹوئنٹی میچ ہوا، تو اس میں بھارتی تماشائیوں نے معین علی پر آوازے کسے اور ان کی توہین کرتے رہے۔ معین علی نے منفی تنقید خندہ پیشانی سے سہی اور اپنا قد کاٹھ سبھی کی نظروں میں مزید بڑھا لیا۔

بیٹے کی کامیابیوں سے قدرتاً اس کے والدین بہت خوش ہیں۔ جب معین اور اس کے بھائی قدیر اور عمر علی کرکٹ کھیلنا سیکھ رہے تھے، تو منیر علی کے بعض جاننے والے ان کا مذاق اڑاتے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ برطانیہ میں صرف امرا اور رسوخ رکھنے والے لڑکے ہی کرکٹ کھیل سکتے ہیں۔ لیکن منیر علی کے عزم مصمم اور معین علی کی محنت و اعتماد نے ثابت کر دیا کہ کھیل کا میدان ہو یا سائنسی شعبہ، جو عمدہ کارکردگی دکھائے گا، اسے آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

ابھی معین علی کم از کم مزید آٹھ نو سال کرکٹ کھیل سکتا ہے۔ اگر اس نے بلے اور گیند کا بخوبی استعمال جاری رکھا، تو وہ طویل عرصہ برطانوی ٹیم کا حصہ رہے گا۔ ہماری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔

معین علی ۲۱ سال کا تھا کہ اس کی شادی ہوگئی۔ اب وہ ایک خوبصورت بیٹے، ابوبکر کا والد ہے۔ اس کی کامیابی سے برطانیہ میں مقیم پاکستانی نژاد نئی نسل کو تحریک ملے گی کہ وہ بھی اسپورٹس، سائنس و ٹیکنالوجی اور زندگی کے دیگر شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیں اور ثابت کریں کہ صلاحیت و ذہانت میں وہ کسی سے کم نہیں۔

صالح حکمران کی برکت

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ مسند خلافت پر جلوہ فرما ہوئے تو پہاڑیوں کے دامن میں رہنے والے چرواہے نے پوچھا "مسلمانوں پر یہ کون صالح، پاکیزہ خصلت خلیفہ مقرر ہوا ہے؟"

راوی نے پوچھا "یہ بات تم لوگوں کو کیسے معلوم ہوئی؟"

چرواہے نے کہا "جب کوئی نیک اور صالح حکمران مسند نشین ہوتا ہے تو شیر اور بھیڑیے ہمارے جانوروں کو نقصان نہیں پہنچاتے۔"

(عاصمہ رضوی، جہلم سٹی)

رواداری، سچائی، نرم مزاجی اور پیار و محبّت۔ یہ اسلامی تعلیمات و تربیت ہی کا نتیجہ ہے کہ مایوسی و منفی خیالات معین علی کے قریب نہیں پھٹکتے اور وہ ناگوار وقت کو بھی خندہ پیشانی سے گزارتا ہے۔

یہی دیکھیے کہ معین علی ۲۰۰۲ء سے کاؤنٹی کرکٹ کھیل رہا ہے مگر پچھلے سال تک اس امر کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ برطانیہ کرکٹ ٹیم میں شامل ہوگا۔ گو وہ ۱۲۲ میچ کھیل کر سات ہزار سے زائد رن بنا چکا تھا۔ یہی نہیں، اس نے

کڑے وقت میں بھی ثابت قدم اور مطمئن رہنے کا نتیجہ ہے کہ آخر ۲۰۱۴ء کے اوائل سے معین علی پر کامیابیوں کے در ایک ایک کر کے کھلنے لگے۔ ماہ فروری میں اس نے ویسٹ انڈیز کے خلاف اپنا پہلا ایک روزہ بین الاقوامی میچ کھیلا۔ پھر مارچ میں ٹی ٹوئنٹی میچ کی باری آئی۔ اور جون میں اسے برطانیہ کی ٹیسٹ کرکٹ ٹیم میں شامل ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہوگیا۔

معین علی بائیں ہاتھ سے کھیلنے والا بلے باز اور آف

معین علی کامیابی کا جشن مناتے ہوئے

ڈیڑھ سو سے زائد وکٹیں بھی حاصل کیں۔

چناں چہ پچھلے برس معین ۲۶ سال کا ہوا تو اسے محسوس ہونے لگا کہ اب وہ کوئی بین الاقوامی میچ نہیں کھیل سکتا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان رکھتے ہوئے، جس کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں، معین نے جدوجہد جاری رکھی۔ وہ دعا پر بھی کامل اعتماد رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ عاجز بندہ اپنے رب کی بارگاہ میں خشوع و خضوع سے کامیابیاں پانے کے لیے دعائیں کرتا رہا۔

اسپنر بالر ہے۔ بلے اور گیند کو یکساں مہارت سے استعمال کرتا ہے گویا معروف اصطلاح میں ''آل راؤنڈر'' یا ہر فن مولا ہے۔ تاہم اس نے بھارت کے خلاف حالیہ ٹیسٹ سیریز میں اسپن بالر کی حیثیت سے شہرت پائی اور اپنی شاندار کارکردگی سے اہل خانہ ہی نہیں تمام برطانوی مسلمانوں اور پاکستانیوں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔

کچھ ہی لوگ جانتے ہیں کہ بہ حیثیت آف اسپنر انھیں عمدہ بالر بنانے میں معروف پاکستانی کرکٹر سعید

پرستانہ پیغام نہیں دے سکتے۔ تاہم برطانوی کرکٹ بورڈ نے معین علی کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے سیاسی نہیں انسانی بنیادوں پر پٹی پہنی اور ظلم کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا۔ یوں ہزاروں لاکھوں انگریز اسرائیل کی غنڈہ گردی سے آگاہ ہوئے جو عموماً اپنے حال میں مت رہتے ہیں۔

☆

مجبور و مقہور فلسطینیوں کی حالت زار بڑی دلیری سے عوام و خواص کے سامنے عیاں کرنے والا معین منیر علی ۱۸ر جون ۱۹۸۷ء کو برطانوی شہر برمنگھم میں پیدا ہوا۔ معین کی داستان حیات غیر معمولی ہے اور اس میں بہ حیثیت مسلمان اور انسان ہمارے لیے کئی قیمتی سبق پوشیدہ ہیں...... محنت، ہمت، والدین کی محبت شفقت اور سب سے بڑھ کر ایمان کی قوت کے انمول سبق!

معین کے والد، منیر علی کئی برس قبل مستقبل سنوارنے کی خاطر پاکستان سے انگلستان پہنچے۔ ان کے بھائی شبیر علی بھی برمنگھم میں مقیم تھے۔ دونوں بھائیوں کا پسندیدہ کھیل کرکٹ تھا۔ جب انھوں نے نئے دیس میں قدم جما لیے، تو فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیٹوں کو کرکٹر بنائیں گے۔

۱۹۹۵ء تک دونوں بھائیوں کے ہاں پانچ بیٹے جنم لے چکے تھے۔ اب انھیں کرکٹ کے اسرار و رموز سے آشنا کرنے کا مرحلہ درپیش تھا تاکہ وہ بچپن ہی سے اسی کھیل میں طاق ہو جائیں۔

معین سمیت تمام لڑکوں کو مقامی کرکٹ کوچنگ سینٹر میں ڈالا گیا مگر منیر و شبیر علی تربیت کے معیار سے مطمئن نہیں تھے۔ چناں چہ انھوں نے ایک انقلابی فیصلہ کیا۔ یہ کہ گھر کے پچھواڑے بنے باغ میں پچ بنا اور نیٹ لگا کر بچوں کو کرکٹ سکھائی جائے۔

یوں والد کی زیر نگرانی اور راہنمائی میں بیٹا کرکٹ کھیلنے کی تربیت پانے لگا۔ دونوں کے ذہن میں یہی بات سمائی ہوئی تھی کہ معین کو ایک دن برطانوی کرکٹ ٹیم میں شامل ہونا ہے۔ چناں چہ معین بڑی محنت اور استقلال سے کھیل کی مبادیات سیکھنے لگا۔

منیر علی اسلامی روایات پر عمل کرنے والے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ برطانیہ آ کر بھی انھوں نے اپنی مذہبی اقدار سے منہ نہیں موڑا، بلکہ سبھی بچوں کو اسلامی شعائر کے مطابق پروان چڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی معاشرے میں نشوونما پانے کے باوجود معین علی سمیت ان کے تمام بچے پابند صوم و صلوٰۃ ہیں۔

محنت اور جدوجہد رنگ لائی۔ معین کی عمر جب صرف ۱۵ برس تھی، تو وہ برطانوی کاؤنٹی، وارو کشائر کی ٹیم میں شامل ہو گیا۔ یوں وہ برطانوی فرسٹ کلاس کرکٹ کی دنیا میں نمایاں ہوا۔

۲۰۰۷ء میں وورسسٹر شائر (Worcestershire) کاؤنٹی کی جانب سے کھیلنے لگا جس کا شمار قدیم کرکٹ کاؤنٹیوں میں ہوتا ہے۔ اسی دوران معین علی نے لمبی ڈاڑھی رکھ لی۔ وہ بانیان کرکٹ میں شامل، ڈاکٹر ڈبلیو جی گریس کی ڈاڑھی سے ملتی جلتی ہے۔

قابل ذکر بات یہ کہ ڈاڑھی رکھنے پر معین علی کبھی شرمندہ نہیں ہوا بلکہ وہ اس پر فخر کرتا ہے۔ اس نے تمام اسلامی عقائد شدومد سے اپنا رکھے ہیں اور جب بھی موقع ملے، غیر مسلم دوستوں کے سامنے تبلیغ اسلام بھی کرتا ہے۔ گویا وہ کرکٹ کے کھیل میں اسلامی مبلغ کا کردار بھی بخوبی نبھا رہا ہے۔

معین علی ان تمام خصوصیات سے متصف ہے جو ایک مسلمان میں موجود ہونی چاہئیں، مثلاً صبر و برداشت،

یہ ۲ جولائی ۲۰۱۴ء کا واقعہ ہے، برطانوی شہر ساؤتھ ہمپٹن کے دی روز باؤل کرکٹ میدان میں برطانیہ اور بھارت کی ٹیموں کے مابین ٹیسٹ میچ جاری تھا۔ دوران مقابلہ تماشائی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک برطانوی کھلاڑی نے کلائی پر ایسی پٹی (Wristband) باندھ رکھی تھی جس میں ''غزہ کو بچاؤ'' (Save Gaza) اور ''فلسطین کو آزاد کرو'' (Free Palestine) کے جملے درج تھے۔

اس زمانے میں اسرائیلی وحشیانہ انداز میں فلسطینیوں پر بم باری کررہے تھے۔ اور برطانوی کھلاڑی نے بڑی جرأت اور حوصلے سے اسرائیلی ظلم وستم کے خلاف اپنے انداز میں احتجاج کیا۔ سرزمین برطانیہ میں یہود کو آئینہ دکھانے والے یہ کھلاڑی معین علی تھے،

محنت، ہمت اور پدرانہ شفقت کا پرتو

معین علی

پاکستانی نژاد اس برطانوی کھلاڑی نے اپنی شاندار کارکردگی سے انگریزوں کے دل جیت لیے

عالیہ بٹ

برطانوی ٹیم کے ابھرتے ہوئے مسلمان کھلاڑی!

آئی سی سی (انٹرنیشنل کرکٹ کونسل) کے قوانین کی رو سے کھلاڑی دوران کھیل کسی قسم کا سیاسی، مذہبی اور نسل
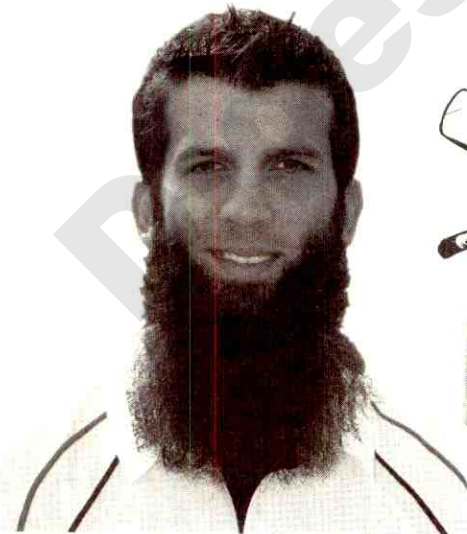
گویا ہیروئن یا چرس کے مانند چینی بھی ایک نشہ ہے۔ جو اس کا عادی بن جائے، وہ پھر اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ لیکن دیگر غذاؤں مثلاً چائے، تمباکو، (سگریٹ) روٹی، گوشت وغیرہ کے متعلق بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ انسان کو اپنے نشے میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

لزا مورنیگا آسٹریلیا کی ممتاز ماہرِ غذائیات ہے۔ وہ کہتی ہے ''دورِ جدید کا انسان صرف چینی ہی نہیں، ہر شے حد سے زیادہ کھا کر فربہ ہو رہا ہے۔'' لیکن یہ بات چینی کو معصوم قرار نہیں دیتی۔

وجہ یہ ہے کہ جو مرد و زن زیادہ میٹھی غذائیں کھائیں، وہ نہ کھانے والوں کی نسبت زیادہ موٹے ہوتے ہیں۔ اور میٹھے مشروبات فربہی پیدا کرنے کا بڑا سبب ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں شامل فرکٹوز انسان میں سیری کا احساس پیدا کرنے والا ہارمون، لیپٹن پیدا نہیں کرتی۔ اسی لیے انسان ایک بیٹھک میں پوری بوتل چڑھا جاتا ہے اور اسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ کئی سو حرارے اس کے بدن میں داخل ہو چکے جن کی اس کے جسم کو ہرگز ضرورت نہیں تھی۔

سیری جنم نہ لینے کا یہ احساس طویل المیعادی طور پر انسانی صحت پر بڑے منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ مشروبات پر ہونے والی تحقیق سے ثابت ہو چکا کہ جو انسان انھیں روزانہ استعمال کرے وہ موٹاپے، ذیابیطس اور امراض قلب کا نشانہ بن جاتا ہے۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ مجموعی طور پر چینی کا خصوصاً زیادہ استعمال نقصان دہ ہے۔ صحت مند انسان کو چاہیے کہ وہ اعتدال میں چینی کھائے۔ جبکہ ذیابیطس اور امراضِ قلب میں مبتلا لوگ اس سے پرہیز ہی کریں، تو بہتر ہے۔

◆◆◆

سنہری باتیں

☆ نیکی حسنِ خلق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں خلش پیدا کرے اور تو اس امر کو بُرا سمجھے کہ لوگ اس سے واقف ہو جائیں۔

☆ حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔

☆ جو شخص جھوٹی قسم کھائے اپنا ٹھکانہ جہنم میں سمجھے۔

☆ تم میں سے اچھے لوگ وہی ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔

☆ جو شخص جائز طریقے سے روپیہ کما کر اس لیے پس انداز کرے کہ کسی سے سوال کرنے سے بچے اور اپنے بال بچوں اور ہمسایوں پر خرچ کرے، وہ قیامت کے دن اللہ سے یوں ملے گا کہ اس کا چہرہ ماہ کامل کی طرح روشن ہوگا۔

☆ اشیائے ضرورت کو روک لینے والا آدمی کتنا بُرا ہے! اگر اللہ چیزوں کا نرخ سستا کرتا ہے، تو اسے غم ہوتا ہے اور جب قیمتیں چڑھ جاتی ہیں تو خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔

☆ سنو، ظلم نہ کرو! کسی آدمی کا مال اس وقت تک تمھارے لیے جائز نہیں جب تک صاحب مال تمھیں خود راضی خوشی نہ دے دے۔

(انتخاب: وحید نذیر، وہاڑی)

جسمانی افعال کے لیے بدن کو جو گلوکوز درکار ہے، وہ اسے نشاستے سے مل جاتا ہے۔ ہمارے اجداد بھی پھل کھا کر فرکٹوز حاصل کرتے تھے۔ لیکن پیسے کی فراوانی کے بعد سیکڑوں لوگ بے تحاشا پھل کھانے لگے ہیں۔ چونکہ ہمارا بدن اس روش کا عادی نہیں تھا، لہٰذا جسمانی گڑ بڑ پیدا ہوگئی۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے جسم میں صرف جگر فرکٹوز کو کام لاتا ہے۔ وہ یوں کہ اسے چربی (Fat) میں بدل ڈالتا ہے۔ مگر جب جگر میں از حد چربی جنم لے، تو پہلے وہ سوزش کا نشانہ بنتا ہے۔ پھر ورم جگر کا شکار ہو کر رفتہ رفتہ ناکارہ ہو جاتا ہے۔ مزید برآں جگر کی خرابی ہی سے ''انسولین مزاحمت'' جنم لیتی ہے جو ذیابیطس کی پیش رو ہے۔

فرکٹوز بھی گلوکوز کے مانند توانائی میں بدلتی ہے۔ مگر پروفیسر رابرٹ اسٹگ کا دعویٰ ہے کہ اس عمل سے آکسیجن کے آزاد اصلیے (Free Radicals) پیدا ہوتے ہیں۔ یہ وہ خطرناک کیمیائی مادے ہیں جو جسمانی اعضا پر حملے کرتے اور ہمیں بڑھاپے کا شکار بناتے ہیں۔ ان آزاد اصلیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے پھر ہمیں ایسی غذا کھانا پڑتی ہے جس میں ضد تکسیدی مادے (Antioxidants) موجود ہوں۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب عمدہ اور مہنگی غذا کھائی جائے۔ چونکہ غریب لوگ ایسی غذا نہیں کھا سکتے، لہٰذا وہ زیادہ چینی کھا کے وقت سے پہلے چل بستے ہیں۔

فرکٹوز کی ایک اور خامی یہ ہے کہ گلوکوز کے مانند انسولین ہارمون اس کا انتظام نہیں سنبھالتا۔ یہی ہارمون ہمارے خون میں شکر کی سطح متوازن رکھتا اور لیپٹن کی پیداوار بڑھاتا ہے۔ لیپٹن ہارمون ہی ہمیں خبر دیتا ہے کہ ہمارا پیٹ بھر چکا ہے۔

لیپٹن کی پیداوار میں بھی فرکٹوز کا کوئی کردار نہیں۔ بلکہ حالیہ تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ یہ شکر انسانی جسم میں گہریلن (Ghrelin) کی افزائش کرتا ہے۔....وہ ہارمون جو ہمیں بھوکا ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ گویا فرکٹوز کی وجہ سے ہم ضرورت سے زیادہ کھانا کھانے لگتے ہیں۔

جدید تحقیق سے یہ بھی افشا ہوا کہ انسان یا حیوان بڑی مقدار میں فرکٹوز کھا لیں، تو ان کے خون میں ٹرائی گلیسرائڈیز (Triglycerides) کی سطح بڑھ جاتی ہے۔ یہ چربیلا مادہ ہماری شریانیں سخت کرتا اور ہمیں امراضِ قلب کا شکار بناتا ہے۔

تاہم دیگر ماہرینِ غذائیات فرکٹوز کو مرکزی مجرم نہیں سمجھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر صحت مند ضرورت سے زیادہ پھل کھا بھی لے، تو اسے نقصان نہیں پہنچتا۔ بہر حال اس شکر پر مزید تحقیق جاری ہے۔

عام چینی پہ ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ دماغ کی کیمیائی ساخت بدل کے ہماری غذائی عادات بھی تبدیل کر ڈالتی ہے۔ دراصل جدید تحقیق سے پتا چلا ہے کہ انسان جب کوئی سرور بخشنے والی شے کھائے یا پیے مثلاً چائے، ہیروئن، چرس وغیرہ، تو وہ دماغی طور پر خود کو بہت پُرسکون محسوس کرتا ہے۔ میٹھی اشیا یا چینی کھانے سے بھی دماغ کو وہی سرور ملتا ہے جو ہیروئن یا کوکین پینے سے۔

لیبارٹری میں کیے گئے ایک تجربے میں دو چوہوں کو ہیروئن اور چینی کھانے کا عادی بنایا گیا۔ جب وہ عادی بن چکے، تو ان کے سامنے بیک وقت چینی اور ہیروئن رکھی جاتی۔ ہر بار انھوں نے چینی کو ترجیح دی اور اسے مزے لے لے کر کھایا۔

ماہرین دعویٰ کرنے لگے کہ ذیابیطس اور امراضِ قلب جنم دینے میں اس کا بڑا ہاتھ ہے۔ اب کئی ڈاکٹر اسے انسان کا پہلا دشمن سمجھتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ چینی واقعی صحت کو نقصان پہنچاتی ہے یا اسے خوامخواہ ہوّا بنا دیا گیا ہے۔

یاد رہے، پھلوں، سبزیوں اور دودھ میں قدرتی طور پر بھی شکر پائی جاتی ہے۔ مگر ماہرین غذائیات اسے نقصان دہ نہیں سمجھتے۔ ان کی تنقید کا نشانہ وہ شکر ہے جو گنے سے بنتی اور عرف عام میں چینی کہلاتی ہے۔ امریکہ میں خصوصاً تجارتی و صنعتی سطح پر ''ہائی فرکٹوز کارن سیرپ'' (High Fructose Corn Syrup) کا استعمال زیادہ ہے۔ یہ میٹھا محلول مکئی سے بنتا اور عام چینی کی نسبت سستا ہوتا ہے۔

ہمارے آباؤ اجداد درجِ بالا دونوں اقسام کی چینی سے ناواقف تھے۔ مزید برآں صرف تین سو برس قبل چینی ایک انتہائی قیمتی شے تھی۔ یہ تو جب اہلِ یورپ نے گنے کی فصل دنیا بھر میں پھیلائی اور غلاموں سے گنا کاشت کرانے لگے، تو چینی عام ہوئی۔

۱۷۰۰ء میں ایک یورپی گھرانا سالانہ دو کلوگرام چینی استعمال کرتا تھا۔ مگر جب چینی سستی ہونا شروع ہوئی، تو اس کا استعمال بھی بڑھا۔ آج ایک امریکی گھرانا سالانہ ''چالیس کلو'' چینی کھا جاتا ہے۔ یہ دن میں ۲۰ چمچ چینی کھانے کے برابر ہے۔ پاکستان میں بھی کئی لوگ اچھی خاصی چینی کھاتے ہیں۔

تاہم بیسویں صدی کے نصف اول تک چینی مہنگی ہونے کی وجہ سے میٹھی اشیا کی کھپت کم ہی رہی۔ ۱۹۵۷ء میں ہائی فرکٹوز کارن سیرپ بنایا گیا۔ فرکٹوز اور گلوکوز کا مرکب یہ میٹھا محلول چینی کے مقابلے میں تیس فیصد سستا تھا۔ سو دنیا بھر میں صنعتی ادارے اسی کے ذریعے میٹھی اشیا تیار کرنے لگے۔

دھیرے دھیرے میٹھی غذاؤں کا چلن بڑھا اور انھیں بڑی تعداد میں کھانا جانے لگا۔ ماہرینِ غذائیات میں اس امر پہ اختلاف ہے کی یہ میٹھی غذائیں نقصان دہ ہیں یا نہیں؟ تاہم وہ ایک بات پر متفق ہو چکے...... یہ کہ انسانی جسم کو چینی کی ضرورت نہیں۔ مشہور برطانوی ماہر غذائیات رچرڈ لیکس کہتا ہے:

''ہم ضروری چکنائیوں (Essential Fats) کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے ہیں۔ ہمیں پروٹین نہ ملیں، تو ہم جلد چل بسیں گے۔ اگر ہمیں نشاستہ (کاربوہائیڈریٹ) میسر نہ آئے تو زندگی گذارنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن چینی نہ ملے، تو ہماری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا کیوں کہ یہ ایک ردّی غذا ہے۔''

چینی کھانے سے محض حرارے (Calories) ملتے ہیں۔ اور یہ حرارے کیا ہیں؟ موٹاپے کے ہرکارے! یہی وجہ ہے، ۱۹۵۰ء کے بعد جونہی دنیا بھر میں چینی کی پیداوار و کھپت بڑھی، موٹاپا بھی پھیلنے لگا۔ ڈاکٹر موٹاپے کو سو بیماریوں کی ماں کہتے ہیں۔ چنانچہ اس کی موجودگی میں دیگر امراض پر انسانوں پر حملہ آور ہوئے جن میں ذیابیطس قسم دوم اور بلند فشارِ خون نمایاں ہیں۔

اب جدید تحقیق نے آشکارا کیا ہے کہ چینی محض بیکار غذا نہیں...... بلکہ یہ زہر ہے۔ اس نظریے پر یقین رکھنے والوں میں کیلی فورنیا یونیورسٹی سے منسلک سائنس دان پروفیسر رابرٹ اسٹگ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک اصل مجرم فرکٹوز ہے، پھلوں میں قدرتی طور پر پائی جانے والی شکر جو عام چینی اور کارن سیرپ، دونوں میں بھی شامل ہوتی ہے۔

دراصل ہمارے جسم کو فرکٹوز کی بھی ضرورت نہیں۔

گھر میں پوچھا جانے والا عام سوال

چینی

مضر صحت ہے یا مفید؟

جدید طبی تحقیق نے ننھے منے اور میٹھے دانوں کی اصلیت عیاں کر دی

ڈاکٹر رخسانہ خان

فرض کیجیے، آپ ایک میز پر بیٹھے ہیں۔ سامنے پانی کا ایک گلاس دھرا ہے۔ ساتھ ہی چینی سے بھرا مرتبان رکھا ہے۔ آپ نے مرتبان کھولا اور ایک چمچ چینی پانی میں ڈالی۔ پھر ایک اور، ایک اور، یہاں تک کہ آپ نے بیس چمچ چینی گلاس میں ڈال دی۔ کیا آپ یہ پانی پینا پسند کریں گے؟

ظاہر ہے، مٹھاس کا عاشق صادق بھی اتنا زیادہ میٹھا پانی پیتے ہوئے جھجکے گا۔ مگر لاکھوں پاکستانی روزانہ اتنی ہی مقدار میں چینی ہڑپ کر جاتے ہیں.....اور انھیں اس غیر معمولی بات کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

ایک زمانے میں چینی ''لگژری'' شے تھی جو صرف خاص تقاریب ہی میں استعمال ہوتی تھی۔ لیکن پچھلے چند عشروں سے یہ ہماری روز مرہ غذا کا حصہ بن چکی۔ اسی باعث چینی اب عام استعمال کی کئی اشیا میں ڈالی جاتی ہے، مثلاً ڈبل روٹی، مشروبات، کیک بسکٹ، مٹھائی وغیرہ۔

لیکن رفتہ رفتہ چینی کے خلاف محاذ جنگ بھی کھل گیا۔

کی میم صاحبہ تو نوجوان پر ایسے فدا معلوم ہوتے کہ علانیہ اش اش کر رہے تھے۔

گپ شپ جاری تھی کہ تانگے آ موجود ہوئے۔ ہم سب لوگ کمرے سے باہر نکلے۔ اس وقت ہمارے ہیرو کو جس قدر اپنی قابلیت پر ناز ہوتا' بجا تھا۔ سبھی انگریز مرد اور لیڈیاں اس کے گرد حلقہ کیے ہوئے کھڑی تھیں۔ سارا مجمع یک زبان ہو کر اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس سے مصافحہ کر کے وہ رخصت ہوئے۔

لیفٹیننٹ صاحب بھی کھسیانا چہرہ لیے تانگے میں جا بیٹھے۔ مگر واہ رے بے خوفی' ہمارے نوجوان ہیرو نے کس اخلاقی کمال کا ثبوت دیا۔ لیفٹیننٹ کے سامنے جا کر عجز سے مخاطب ہوئے اور کہا ''میری کوئی حرکت اگر ناراضی کا سبب بنی ہے تو معافی کا خواستگار ہوں۔ آئیے رنجشوں کو دور کر کے دوستانہ مصافحہ کر لیں۔''

لیکن لیفٹیننٹ صاحب نے ہاتھ نہیں ملایا اور کہا ''نہیں! تم جنٹل مین نہیں ہو۔''

جو کچھ میں نے بیان کیا' اگر یہ کوئی ناول یا قصہ ہوتا تو ناظرین کو ہمارے ہیرو کا نام معلوم کرنے کی ایسی بے تابی نہ ہوتی۔ مگر چونکہ یہ میرا چشم دید سچا واقعہ ہے اور تمام حالات میں نے بے کم و کاست لکھے ہیں۔ اس لیے ناظرین ضرور اس نوجوان کا نام جاننا چاہیں گے۔ اس مضمون کے ہیرو ''رفیق ہند'' اخبار کے اڈیٹر' مولوی یا مسٹر محرم علی چشتی ہیں۔

وہ ''عجیب مانوس' اجنبی کبھی یاد آئے تو میں آج بھی حیرت میں ڈوب جاتا ہوں۔ اُس کی خوداعتمادی' طبیعت کا استحکام (اور وہ بھی اپنے انگریز آقاؤں کے روبرو) کس قدر مضبوط تھا! ایسی کوئی دوسری مثال میری نظر سے نہیں گزری۔

بانکے میاں کو کوئی ملازمت نہ ملی' تو اپنے ایک دیرینہ دوست کے کہنے پر مطب کھول لیا۔ اور دوست ہی کے مشورے پر ایک بڑے سے تختے پر لکھوا دیا ''تین سو روپوں میں اپنا مکمل علاج کرائیں۔ اگر ہم علاج نہ کر سکے تو آپ کو ایک ہزار روپیہ دیں گے۔ ایک بار ضرور آزمائیں۔''

کسی لالچی نے یہ تختہ پڑھا' تو سوچا کہ ہزار روپیہ کمانے کا سنہرا موقع ہے۔ وہ مطب پر آیا اور بانکے میاں کو اپنی نبض دکھاتے ہوئے کہنے لگا مجھے کسی بھی چیز کا ذائقہ محسوس نہیں ہوتا۔ بہت علاج کروایا ہے کہیں سے آرام نہیں آیا۔ آپ کا تختہ پڑھا ہے' تو اس سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔

بانکے میاں نے شاگرد کو آواز دی' اور کہا دس نمبر ڈبے میں سے دوا نکالو اور موصوف کو تین قطرے پلا دو۔

جیسے ہی دو قطرے لالچی کے منہ میں گئے۔ وہ تھو تھو کرتا ہوں بولا یہ کیا؟ یہ تو پٹرول ہے۔

بانکے میاں' مبارک ہو آپ کے منہ کا ذائقہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ نکالو تین سو روپے۔

لالچی نے جی کڑا کر کے تین سو روپے دیے اور اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔

اب وہ اپنی رقم نکلوانے کی ترکیب سوچنے لگا اور کسی نئی بیماری کا سوچ کر کچھ دنوں بعد پھر مطب پر آیا۔

بانکے میاں سے کہنے لگا جناب میری یادداشت کام نہیں کرتی۔

بانکے نے پھر شاگرد کو آواز دی اور کہا دس نمبر ڈبے میں سے دوا نکالو اور مریض کو تین قطرے پلا دو۔

لیکن یہ دوا تو زبان کا ذائقہ ٹھیک کرنے کی ہے، لالچی بولا۔

بانکے میاں' مبارک ہو آپ کی یادداشت واپس آ گئی ہے۔ لائیے ہماری فیس۔ (ارباب محی الدین، لاہور)

سے کوئی گستاخانہ حرکت سرزد ہوئی ہے؟

لیفٹیننٹ صاحب: (کچکچا کر) تم نے یہ ڈنڈا کیوں میز پر رکھ دیا؟

جوان: (اسی طرح بڑے وقار سے) معاف فرمائیے گا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کو ڈنڈے کی صورت دیکھنے سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ لیجیے حکم کی تعمیل کرتا ہوں (ڈنڈا میز سے اُٹھا کر نیچے رکھ دیا) آپ تسلّی رکھیے یہ ڈنڈا بغیر اشد اور قانونی ضرورت کے کبھی استعمال میں نہیں آتا۔

لیفٹیننٹ صاحب: تم نے رات بھی مجھے سخت تکلیف دی۔ ساری رات مجھے سردی میں باہر رہنا پڑا۔

جوان: (کمال حیرت کا چہرہ بنا کر بڑی سادگی سے) میں نے جناب والا (یور آنر) کو کوئی تکلیف نہیں دی۔ آپ نے خود ہی ہماری مصاحبت کو پسند فرمایا۔ پھر خود ہی اٹھ کر باہر چلے گئے جس کا مجھے افسوس ہے۔ میں اس وقت اپنی عبادت میں مشغول اور بول نہ سکتا تھا۔ ورنہ ضرور آپ کو باہر جانے سے روکتا۔

لیفٹیننٹ صاحب: ڈیم تمہاری عبادت' ایسی لغویات کا فائدہ کیا ہے؟

جوان: (اسی صبر و تحمل اور سادگی سے چائے پیتے ہوئے) ہماری عبادت کا اور کوئی فائدہ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اتنا فائدہ تو ضرور آپ بھی تسلیم کریں گے کہ اگر کوئی خراٹے مار کر اپنے ساتھیوں کو تکلیف دے اور ان کی نیند حرام کر دے تو ایسے شخص کے ہاتھوں سے مخلصی ضرور نصیب ہو جاتی ہے۔

جوان مذکور کے منہ سے یہ آخری فقرہ نکلا تھا کہ کمرے میں ایک لطیف منظر نظر آیا۔ ایک لیڈی صاحبہ جو آرام چوکی پر تشریف فرما تھیں (اور جن کی نسبت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ انہی لیفٹیننٹ صاحب کی زوجہ محترمہ ہیں) فقرہ سنتے ہی دفعتاً کھل کھلا کر ہنسیں۔ وہ مارے ہنسی کے ایسی بے تاب ہوئیں کہ چائے کی پیالی جو ان کے ہاتھ میں تھی' کپڑوں پر گر گئی۔

اب ستم یہ تھا کہ میم صاحبہ کی ہنسی رکنے میں نہیں آتی تھی۔ عجیب تماشا تھا۔ کئی منٹ تک ان کی ہنسی کا یہی عالم رہا۔ جب وہ ذرا وقفہ لیتی بھی تھیں تو صرف دو سیکنڈ کا...... پھر ان کے قہقہے کا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا۔ لیفٹیننٹ صاحب تو ان کے قہقہوں سے جھینپے جاتے جبکہ دوسرے انگریز اور لیڈی صاحبان حیران و متعجّب ہو کر (مگر ذرا متبسّم) میم صاحبہ کی طرف دیکھتے رہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ بڑی دیر بعد میم صاحبہ کی ہنسی نے دم لیا تو انھوں نے اپنے شوہر' لیفٹیننٹ صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا ''ولیم! معلوم ہوتا ہے تم نے اس بے چارے جنٹل مین کو بھی اپنے خراٹوں سے تنگ کیا۔ اس نے اپنی مخلصی کا حیلہ اپنی عبادت کو بنا لیا۔'' پھر میم صاحبہ نے حاضرین کو اپنے شوہر کے خراٹے مارنے کا سارا قصہ سنایا اور کہا ''بعض اوقات میں بھی سخت تنگ ہو جایا کرتی ہوں۔''

حاضرین کو ہمارے جوان ہیرو کی عجیب و غریب عبادت سے گھبرا کر کمرا چھوڑ جانے کا قصہ لیفٹیننٹ صاحب سنا ہی چکے تھے لیکن اس متن پر میم صاحبہ کے حاشیہ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اب فرمائیے کون تھوڑا ہنسے؟ تمام انگریزوں اور لیڈی صاحبان کا مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ سب کے سب دیوارِ قہقہہ بن گئے اور بالاتفاق یہی کہتے کہ عجب زندہ دل شخص ہے اور عجیب تر اس کی ترکیب!

حاضرین کے قہقہوں نے لیفٹیننٹ صاحب کو اور بھی کھسیانا کر دیا۔ اس وقت تمام جنٹل مین اور لیڈیاں ہمارے نوجوان ہیرو سے مخاطب تھیں' مگر داد دیجیے اس شخص کی متانت' خودداری اور اپنے جذبات پر قادر الاختیاری کی کہ لبوں پر مسکراہٹ کی جھلک بھی نمودار نہ ہوئی۔ وہ بڑی متانت اور حلیم الطبعی سے مختلف سوالات کا جواب دیتا جاتا۔ بالخصوص صاحب کلکٹر بہادر اور لیفٹیننٹ

اندر سے بلند صدائیں بات چیت کی سنائی دیتی تھیں۔ جوان مذکور اور اس بندۂ درگاہ نے کان لگا کر سنا تو پتا چلا کہ اُسے خوب صلواتیں پڑ رہی تھیں۔

مجمع کے صاحب بہادر مع لیفٹیننٹ جنھیں رات کے وقت بر آمدے کی سردی نے سخت پریشانی میں مبتلا کیا تھا' ٹھٹھر رہے تھے۔ جس شخص کے باعث یہ تکلیف انھیں نصیب ہوئی تھی' اس کو گالیاں دینے سے وہ کیسے باز رہ سکتے تھے؟ کوئی دانت پیستا تھا اور کوئی لچکچا کر رہ جاتا۔ گفتگو غضب سے پُر تھی۔

میں نے اپنے جوان ساتھی کے بشرہ اور قیافہ کو غور سے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس کے چہرے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی خاص حرکت کا مرتکب ہی نہیں ہوا۔ بڑے مزے سے مجھے کہا ''آؤ چلو ہم بھی اندر چل کر چائے پئیں۔'' پہلے تو میں ہچکچایا کیونکہ میری طبیعت میں احتیاط بہت ہے۔ مگر جوان نے زور سے پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ یوں گھسیٹا کہ اس کے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہو گیا۔

ہمارے داخل ہوتے ہی سب حاضرین پر عالم خاموشی طاری ہو گیا۔ ایک دفعہ تو کن انکھیوں سے سب نے ہماری طرف دیکھا پھر منہ پھیر ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ میز کے گرد چوکیاں بچھی ہوئی تھیں۔ معمولی چوکیوں پر صاحبان بہادر اور آرام کرسیوں پر لیڈی صاحبان تشریف فرما تھیں۔ ہر ایک کے آگے گلاس' چائے کے پیالے' بسکٹ اور اُبلے انڈے وغیرہ موجود تھے۔ شرابِ ناب نے انھیں کسی قدر گرما دیا تھا اور سب کچھ سُرور کے عالم میں تھے۔

اب ہمارے ''ہیرو'' کی سنیے' وہ میز کے ایک کونے کی طرف کمال بے پروائی اور استغنا سے ڈٹ گئے۔ اپنے قریب دوسری کرسی پر مجھے بٹھا دیا اور طرفہ حرکت یہ کی کہ وہ اپنا سوٹوں کا باوا آدم (ڈنڈا) بھی میز پر سامنے رکھ دیا۔ اُسے دیکھ کر بعض لیڈی صاحبان مسکرائیں۔ ہمارے ہیرو نے خانساماں کو حکم دیا کہ چائے کی دو پیالیاں' چار اُبلے انڈے اور کچھ بسکٹ لائے۔ سب اشیا اسی وقت میز پر حاضر کر دی گئیں اور ہم دونوں کھانے میں مشغول ہو گئے۔

اس وقت ویسے تو خیریت تھی مگر کمرے میں سناٹے کا عالم تھا۔ اچانک ایک نیا منظر شروع ہوا۔ رات والے لیفٹیننٹ کی طرف میں نے دیکھا تو اُن کے چہرے سے خون ٹپکا پڑتا تھا۔ دیگر فوجی کرنیلوں اور میجروں کے چہروں سے بھی آشفتگی کے آثار نمایاں تھے۔ لیڈی صاحبان اس نوجوان کی حرکت کو حیرت و استعجاب سے دیکھ رہی تھیں۔ مگر یہ شیر اُسی طرح ڈٹا ہوا بسکٹ اور چائے اڑانے میں مشغول تھا۔ کسی کی طرف نہ دیکھتا' مجھ سے مخاطب ہو کر بولا ''کیوں حضرت! اس وقت چائے نے خوب مزا دیا ہے۔''

میں مارے ڈر کے سہا ہوا تھا کہ ابھی گھڑی دو میں مُرلیا باجے گی۔ میں جوان مذکور کی کسی بات کا جواب نہ دے سکا۔ صرف آہستہ سے ہوں ہاں اور غوں غاں کر کے ٹالتا رہا۔ اتنے میں میرا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ دفعتاً رات والے لیفٹیننٹ صاحب آنکھیں لال پیلی کر کے بڑے جوش غضب کے ساتھ جوان مذکور کی طرف مخاطب ہوئے اور سخت ڈانٹ پلائی۔ انگریزی میں دونوں کا جو کچھ مکالمہ ہوا ملاحظہ کیجیے:

لیفٹیننٹ صاحب: (دانت پیس کر) تم بڑے گستاخ ہو۔

جوان (بڑے تحمل اور وقار کے ساتھ) کیوں؟ کیا مجھ

منع ہے۔ اب بھی آپ کے بولنے کے باعث میری مذہبی رسم میں مداخلت ہوئی۔ اب مجھے نہ بلائیے گا۔ میں کوئی جواب نہ دے سکوں گا۔

لیفٹیننٹ صاحب: (حیران و پریشان ہوکر) یہ آپ کی عبادت کب تک جاری رہے گی؟

جوان: بہت عرصہ نہیں، صرف دو گھنٹے اور عبادت کروں گا۔ بعدازاں دو تین گھنٹے سو کر پھر صبح کے وقت ایک آدھ گھنٹا اسی طرح عبادت کروں گا۔

لیفٹیننٹ صاحب: (سخت حیران و غم زدہ ہوکر) تو پھر ہمیں ساری رات آپ کی عبادت کے باعث جاگنا پڑے گا۔

جوان: نہیں میرے ساتھ جاگنے کی ضرورت نہیں، آپ شوق سے آرام فرمائیے اور ہاں اب مجھے نہ بلائیے گا۔

اس کے ساتھ ہی جوان مذکور پھر دُگنے زور کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے مارنے لگا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں ڈاک بنگلہ ہی نہ گر پڑے۔

ابھی ہمارے جوان دوست کو پانچ دس منٹ ہی نعرے لگاتے گزرے ہوں گے کہ لیفٹیننٹ صاحب ٹپٹا کر کوچ سے اُٹھے اور منہ میں بڑبڑانے کے بعد خانساماں اور بیرا کو آواز دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ وہ اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے۔ وہاں کون موجود تھا جو آواز سنتا؟ صاحب بہادر نے خود اپنی چارپائی اور بستر کمرے سے اٹھایا اور باہر لے جا کر برآمدے میں دراز ہوگئے۔

صاحب بہادر تو یوں رخصت ہوئے، نوجوان کچھ دیر نعرے لگاتا رہا پھر فارغ ہوکر دعا مانگی اور جانماز تہ کر کے رکھ دی۔ بعدازاں دروازے کی چٹخنیاں لگائیں اور خاموش اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس وقت میری کیفیت نہ پوچھیے کہ مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ پیٹ میں بل پڑ گئے۔ مگر آفرین ہے اس جوان مذکور کے، نہ ماتھے پر بل تھا اور نہ لب پر تبسّم۔ اس کی متین، معقول اور ثقہ صورت چہرہ دیکھ کر اور بھی ہنسی آتی کہ عجب ستم ظریف شخص ہے۔ اسے اپنے مزاج پر کتنا قابو ہے۔ لبوں کو تبسّم سے آشنا ہونے ہی نہیں دیتا بلکہ الٹا مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ آخر آپ اس قدر ہنسے کیوں جا رہے ہیں؟

مجھے اس شخص کی جرأت، بہادری، حاضر جوابی اور ظریف مزاجی نے ایسا فریفتہ کر لیا کہ میں اس کا نام و نسب پوچھنے پر مجبور ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ وہ معروف و مشہور شخصیت ہے اور ایک ہفتہ وار اخبار کا ایڈیٹر بھی۔

حاصل کلام کچھ عرصہ گفتگو کے بعد آرام کیا اور خراٹوں کی بلا سے مخلصی پا کر میٹھی نیند سوئے۔ علی الصباح تانگوں نے وہاں سے روانہ ہونا تھا۔ ہم لوگ سویرے سے تیار ہوئے اور بقچے سنبھال باہر نکلے۔ معلوم ہوا کہ رات والی پوری انگریز پارٹی کمرا طعام میں موجود ہے۔

> یہ مضمون نومبر ۱۸۹۹ء میں اخبار ''رفیق ہند'' میں شائع ہوا تھا۔ مولوی محرم علی چشتی لاہور کے اسی اخبار کے مدیر تھے۔ یہ ایک سچے واقعے پر مبنی ہے جسے، مولوی صاحب کے دوست، عارف بلگرامی نے جامع و خوبصورت انداز میں لکھا۔
>
> مولوی محرم علی چشتی مشہور وکیل، شاعر اور صحافی تھے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں مسلمانوں کے اہم راہنما رہے۔ صوفی مزاج تھے مگر فطرتاً شوخ اور ظریف۔ طبع شدہ مضمون آپ کی انہی خوبیوں کا آئینہ دار ہے۔

کلکٹر صاحب: (کسی قدر چیں بہ چیں ہو کر) بہت اچھا صاحب! میں اتنا بھی غنیمت سمجھتا ہوں۔ آپ کے مزاج میں اس قدر ہمدردی ہے کہ آپ ایک بیمار کو اپنے کمرے میں پناہ دیتے ہیں۔ میں لیفٹیننٹ کو ابھی یہاں بھیج دیتا ہوں۔

تھوڑی دیر میں لیفٹیننٹ صاحب (جو واقعی بیمار لگتے تھے) ہمارے کمرے میں داخل ہوئے اور ایک کوچ پر دراز ہو گئے۔ اب صرف ایک کوچ باقی رہ گئی تھی۔ اس پر اُس جوان مذکور نے مجھے لٹایا اور خود فرش پر ایک طرف بستر بچھا لیٹ گیا۔ میں نے ہر چند اصرار کیا کہ میں فرش پر لیٹنے کا عادی ہوں مگر اُس نے میری ایک نہ سنی اور یہ کہہ کر آپ مہمان عزیز ہیں، خود فرش پر ہی گزارہ کیا۔

ہمیں لحاف اوڑھ کر لیٹے پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ صاحب بہادر کی چارپائی سے خررر، خررر، خرررر کی آواز آنے لگی۔ یہ صاحب بہادر کے خراٹوں کی آواز تھی جو پہلے دھیمے سُر سے شروع ہوئی مگر بعد میں شدید دھماکے دار آوازوں میں بدل گئی۔ ایسی آواز کہ الامان والحفیظ۔ بلا مبالغہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ریلوے انجن چل رہا ہے۔ اب میرے جوان ساتھی کی حالت قابل دید تھی۔ وہ بہت بے چین تھا۔ لحاف سے سر نکال کر اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُس کی طرف۔ بالآخر وہ بولا:

جوان: حضرت اس کم بخت کے خراٹوں نے تو ناک میں دم کر دیا۔

بندہ: بالکل صاحب! طبیعت کا برا حال ہے۔

جوان: اُفوہ! خوب یاد آیا۔ میں نے آج رات نماز عشا نہیں پڑھی۔ چناں چہ جناب باری سے اسی بات کی سزا تجویز ہوئی کہ جس نیند کی خاطر میں نے آج نماز اور وظیفہ چھوڑ دیا، اُسی سے محروم کر دیا جاؤں۔ لیجیے میں تو نماز اور وظیفے پڑھنے اٹھتا ہوں۔ اس کے بعد جوان مذکور نے وضو کیا اور نماز عشا سے فارغ ہو کر بعدازاں ذکر جہر لاالہ الا اللہ شروع کر دیا۔ جوان اپنی گردن دائیں طرف لے جا کر لاالہ تو کسی قدر آہستہ آواز سے کہتا مگر الا اللہ اس زور شور کے ساتھ نعرہ مار کر بولتا کہ تمام کمرا گونج اٹھتا۔ حتیٰ کہ پہلے دو تین مرتبہ تو میں بھی تھرا اُٹھا۔ اللہ اکبر! نعرہ کیا تھا ایک شیر کی دھاڑ یا رعد کی گرج تھی۔

اُس جوان نے ابھی دس بارہ ہی نعرے لگائے ہوں گے کہ لیفٹیننٹ صاحب بھی ہڑبڑا کر جاگ اٹھے۔ خراٹوں کی بلا سے تو نجات ملی مگر ان کی خونخوار آنکھیں اور جوش غضب سے تمتمایا چہرہ دیکھ کر مجھے ایک اور بلائے عظیم سے سابقہ پڑنے کا اندیشہ ہوا۔ لیفٹیننٹ اپنی کوچ پر بیٹھ جوان کو آوازیں دینے لگے۔ مگر وہ میرا شیر برابر گرج اور کڑک نکالنے میں مصروف رہا۔ یعنی جو مصیبت ہم دونوں پر خراٹوں کی وجہ سے گزری تھی، اب اسی میں لیفٹیننٹ صاحب گرفتار تھے۔ وہ تنگ آ کر کبھی لیٹ جاتا، کبھی کروٹیں بدلتا، کبھی اٹھ بیٹھتا اور کبھی تنگ آ کر جوان کو پکارنا شروع کر دیتا۔ جواب میں اسے سوائے اللہ اکبر کے پُرزور نعرہ کے اور کچھ سنائی نہ دیتا۔

کچھ عرصہ بعد جوان مذکور نے اپنے نعروں میں وقفہ کیا اور منہ میں آہستہ سے کچھ پڑھ کر صاحب بہادر سے مخاطب ہوا۔ یہ گفتگو ظاہر ہے انگریزی میں ہوئی:

جوان: آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے؟

لیفٹیننٹ صاحب: یہ آپ کیا کر رہے تھے؟

جوان: یہ ہمارے مذہب میں ایک طریقہ ہے۔

لیفٹیننٹ صاحب: آپ نے جواب کیوں نہیں دیا؟

جوان: ہمارے مذہب کے مطابق عبادت میں بولنا

شاگرد پیشہ کے مکانات کی طرف جانے کو تھا۔ اچانک اسی جوان کا ملازم مجھے بلا کر اندر لے گیا۔ نوجوان نے میرا حال سن کر کہا ''آپ ہرگز اُس طرف نہ جائیے' یہ کمرا خاص ہے اور یہیں قیام فرمائیے۔'' مجھے یہ سن کر مزید حیرت ہوئی تاہم میں نے بخوشی اس کی پیشکش قبول کر لی۔

اتنے میں خانساماں نوجوان کا کھانا پکا کر میز پر لایا جس میں اس نے مجھے بھی شامل کر لیا۔ بھوک تو ویسے ہی چمکی ہوئی تھی۔ پھر سفر کی تکان مستزاد۔ غرض اُس دن کے پلاؤ' قورمہ' بھنے مرغ' انڈوں اور چائے کا ذائقہ کوئی میرے ہی دل سے پوچھے۔ ابھی ہم لوگ کھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ گوروں میں سے ایک صاحب (جو بعد میں معلوم ہوا کہ مغربی و شمالی علاقہ جات کے ایک ضلع میں کلکٹر تھے) کمرے میں تشریف لائے۔ وہ جوان اسی طرح کرسی پر بیٹھا کھانے میں مصروف رہا مگر میں اپنی عادت سے مجبور دفعتاً کھانا کھاتے کھڑا ہو گیا۔ اب جوان اور کلکٹر کی گفتگو جو انگریزی میں ہوئی قابل شنید تھی:

کلکٹر صاحب: میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ آپ کے کھانے میں مخل ہوا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ہم آٹھ مرد ہیں جن میں سے زیادہ تر فوجی افسر ہیں۔ دس لیڈی صاحبان بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ ایک فوجی لیفٹیننٹ جو سخت بیمار ہو گیا ہے' وہ بھی ہمارا رفیق سفر ہے۔ بس آپ کی مہربانی ہو گی اگر ہماری خاطر آپ یہ کمرا خالی کر دیں۔

جوان: مجھے آپ کی تکلیف کا احساس ہے۔ مگر آپ مجھے کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ کمرا خالی کر کے خود رات کہاں بسر کروں؟

کلکٹر صاحب: آپ یا تو شاگرد پیشہ والے مکان میں چلے جائیں یا برآمدے میں گزارہ کر لیں۔

جوان: شاگرد پیشہ والے مکان میں جا کر رہنا تو میری طبع کے ویسے ہی خلاف ہے جیسا کہ آپ کی ''فیلنگ'' کے! باقی رہی برآمدے کی رہائش' آپ دیکھ لیجیے' میرے جسم کا سانچا ایسا مضبوط نہیں کیونکہ اہل قلم میں سے ہوں۔ میرے خیال میں بہادر اور مضبوط فوجی افسر جو کوہستانی معرکوں کے غالباً تجربہ کار ہوں گے' رات کے سرد موسم کی سختی کا میری نسبت زیادہ دلیری سے مقابلہ کر سکیں گے۔

کلکٹر صاحب: تو آپ کمرہ خالی نہیں کر سکتے؟

جوان: ہاں مجھے افسوس ہے کہ یہی ناگوار جواب اس کم بخت موقع پر دے سکتا ہوں جبکہ میں اور آپ یکساں عالم مسافرت میں ہیں۔

کلکٹر صاحب: تو پھر مشکل کا کوئی حل بتائیں؟

جوان: میرے پاس تو کوئی چارہ سوائے افسوس کے نہیں اور بجز زبانی ہمدردی کے اور کیا کر سکتا ہوں؟ خصوصاً جبکہ حد اعتدال سے بڑھی ہوئی ہمدردی میری صحت اور جان کو خطرہ میں ڈالتی ہے۔

کلکٹر صاحب: مجھے آپ سے ایسا روکھا پھیکا جواب سننے کی توقع نہ تھی۔ اگر آپ کے ساتھ خاندان کی عورتیں ہوتیں تو میں خود تکلیف اٹھا لینے میں تامل نہ کرتا۔ اگر آپ کا کوئی رفیق بیمار ہوتا تو میں اس کے لیے ہر قسم کی سہولت کا سامان پیدا کرتا۔

جوان: مگر لیڈی صاحبان اور بیمار لیفٹیننٹ صاحب کا انتظام تو ہو سکتا ہے۔

کلکٹر صاحب: وہ کس طرح؟

جوان: لیڈی صاحبان کی رہائش کے لیے کافی کمرے موجود ہیں۔ ایک ایک کمرے میں دو دو خواتین آرام کر سکتی ہیں۔ لیفٹیننٹ صاحب کو آپ میرے کمرے میں آرام کے لیے بھیج دیجیے۔

واپس آ کر بیان کیا کہ اس کے مالک ابھی نماز پڑھنے میں بکنارِ دریا مصروف ہیں، تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔

صاحب بہادروں نے دھمکایا "ڈیم مالک! جلدی اسباب نکالو۔"

اس نے کہا "حضور ابھی چلے آتے ہیں۔"

غرضیکہ ادھر پانچ سات منٹ کی مہلتِ تخلیہ کمرا کے لیے دے کر صاحب بہادروں کی یورش میرے کمرے پر ہوئی اور مزید لال سرخ چہرہ کر کے فرمایا "ویل! تم جلدی اپنا اسباب نکالو۔"

میں انگریزوں کے تیور پہچاننے کا عرصہ سے عادی ہوں۔ اس لیے یہ سمجھ کر کہ ذرا چین چڑ کی گئی تو بھی "ڈگ" سے تواضع کی جائے گی، دست بستہ عرض کیا "بہت اچھا غریب نواز! کمترین کو جس کمرے میں حکم ہو، چلا جائے۔"

اس پر حکم صادر ہوا "ویل تم دیکھتا ہے کہ کوئی کمرا خالی نہیں، تم شاگرد پیشہ والی کوٹھڑی میں چلا جاؤ۔"

بہت اچھا حضور کہہ کر میں اپنا اسباب اور بستر بندھوانے لگا۔ میرا ملازم محمد رمضان ایسا سٹپٹایا کہ اس کے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے۔ اسباب باندھنے میں بیسیوں غلطیاں کر رہا تھا۔

اتنے میں دیکھا کہ دور سے وہی جوان مسافر چلا آ رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ حضرت کے ہوش و حواس اس زبردست جماعت کو دیکھ کر رفو چکر ہو جائیں گے اور وہ پہلی شیخی کرکری ہو جائے گی۔ مگر میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جوان مذکور ایک ہاتھ میں وہی ڈنڈا (جسے تمام دنیا کے ڈنڈوں کا مورثِ اعلیٰ سمجھنا چاہیے) سنبھالے اور دوسرے ہاتھ میں تسبیح، منہ میں کچھ ورد کرتے عجیب تمکنت اور وقار کی چال سے آ رہے ہیں۔ چہرے سے ایسا استغنا برس رہا ہے گویا اس جہانِ فانی کی انھیں کچھ پروا ہی نہیں۔

جب حضرت جنٹل مینوں اور لیڈی صاحبان کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ اس جوان کا رعب کچھ یوں مجمع پر چھا گیا کہ وہ بولنا ہی بھول گئے۔ اُن کے چہرے اُس جوان رعنا کی وجاہت سے مرعوب نظر آتے تھے۔ یا تو اُس مجمع نے انگریزی میں شور وغل مچا رکھا تھا اور سب یہی کہتے تھے "ووئی وِل کِک ہم آؤٹ۔" (ہم اُسے لاتیں مار کر کمرے سے نکال دیں گے) مگر جب یہ جوان قریب پہنچا تو اس سے بات کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ جوان نے اہل مجمع میں سے کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور بے پروائی سے مجمع کے درمیان سے گزرتا اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

اتنے میں گوروں کی جماعت میں ایک صاحب بہادر نے (جو بعد میں معلوم ہوا کہ کرنیل تھے) پیچھے سے آواز دی "بابو، بابو!"

جوان نے پیچھے مڑ کر انگریزی میں کہا "میری توہین مت کیجیے۔ میں بابو نہیں ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سبھی گوروں کے چہرے زرد پڑ گئے۔ میں اپنا اسباب اٹھوا کر

کیونکہ اکثر و بیشتر انگریز صاحبان اس ڈاک بنگلے میں کثرت کے ساتھ اترتے ہیں۔ اس صورت میں ہندوستانی مسافروں کو مجبوراً جگہ خالی کر کے کہیں اور جانا پڑتا ہے۔

جب میں اُس ڈاک بنگلہ پہنچا تو ایک طرف کے نسبتاً چھوٹے کمرے کی طرف خانساماں نے میری راہنمائی کی۔ میں اپنا سامان وہیں رکھ کر باہر برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ اتنے میں ایک نوجوان شخص کو تانگے سے اُترتے دیکھا جس کے سر پر دستار اور کلاہ تھی۔ گلے میں کوٹ اور نیچے پاجامہ (افغانی تنبان) تھا۔ یہ شخص فصیح اردو میں گفتگو کرتا اور کسی طرح کا افغانی لہجہ اس کی آواز میں نہ پایا جاتا۔ آتے ہی خانساماں سے اس کی یوں بات چیت ہوئی:

جوان: کوئی کمرا خالی ہے؟

خانساماں: جی ہاں! ایک کمرے میں یہ صاحب (میری طرف اشارہ کر کے) اُترے ہوئے ہیں۔ باقی سب خالی ہیں۔ مگر ان میں بہت سے صاحب لوگ آنے والے ہیں۔

جوان: دیکھو جی! یہ قواعد ڈاک بنگلہ تم نے خود آویزاں کر رکھے ہیں۔ ان میں صاف لکھا ہے کہ جو مسافر پہلے آئے' وہ جس کمرے کو خالی پائے' اس میں ٹھہر سکتا ہے۔ لہٰذا تم مجھے میرے مطلوبہ کمرے میں ٹھہرنے سے نہیں روک سکتے۔

خانساماں: حضور! ہم تو کسی کو بھی نہیں روکتے' بس آپ کی بھلائی کے لیے عرض کرتے ہیں۔ بعد میں اگر دنگا فساد ہوا تو حضور جانیں۔

جوان: ٹھیک ہے' بعد کو ہم سمجھ لیں گے' تم کو اس سے واسطہ نہیں۔

میں اس جوان شخص کی جرأت اور بے خوفی دیکھ کر حیران ہوا کہ کسی دھمکی میں نہیں آ رہا...... جبکہ لباس اور وضع سے وہ انگریزی تعلیم یافتہ نظر نہ آتا تھا۔ لیکن ایسے اِستغنا سے جواب دیتا گویا بڑا جلیل القدر شخص ہے۔ ہاتھ میں ایک نہایت موٹا ڈنڈا موجود تھا جو خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کم از کم بیس سیر کا ضرور ہو گا۔ اُن کی اس وحشت ناک حرکت سے خیال کیا کہ شاید عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں۔

ہر چند خانساماں نے انھیں ایک چھوٹے کمرے میں فروکش ہونے کی پیشکش کی مگر وہ مطلق نہ مانا اور ڈٹ کر اپنا اسباب اسی بڑے کمرے میں رکھوایا جو تمام ڈاک بنگلہ میں سب سے وسیع اور دریا کی طرف خوبصورت فضا میں واقع تھا۔ سامان کے قریب وہ اپنے نوکر کو بٹھا' دریا کنارے سیر کے لیے اتنی دور جا پہنچا کہ ہماری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ جاتے ہوئے خانساماں کو حکم دے گیا کہ اپنے اسلامی برتنوں میں اس کے لیے پلاؤ' قورمہ اور بھنا ہوا مرغ تیار رکھنا۔

اتنے میں شام ہو گئی۔ تھوڑی دیر میں تانگوں کی گھر گھراہٹ شروع ہوئی اور یکے بعد دیگرے چھے تانگے ڈاک بنگلہ کے احاطے میں داخل ہوئے۔ اُن میں سے دس انگریز خواتین اور آٹھ جنٹلمین اُترے۔ اب احاطے میں شور و غل سنائی دیا۔ وہ خانساماں کو جھڑکنے لگے کہ تمام کمرے خالی کیوں نہیں رکھے گئے اور یہ کہ ''دیسیوں'' کو ان میں کیوں اُتارا گیا۔

''ایک دم سب کو کمروں سے نکال دو'' کا نادر شاہی حکم جاری ہو گیا۔ جب خانساماں نے حکم کی تعمیل میں ذرا تذبذب کیا تو دو صاحب بہادر خود آگے بڑھے اور سب سے پہلے اُس جوان شخص کے نوکر سے کہا ''جھٹ پٹ اسباب باہر نکالو۔'' ملازم دوڑا گیا اور قریباً آٹھ منٹ بعد

سچا واقعہ

جب دو انجان ہندوستانیوں کو چمٹ گئی

خراٹوں کی مصیبت

ایک دلیر مسلمان کی داستانِ عجب جس نے بڑے پُرلطف انداز میں انگریز فوجی افسر کو تگنی کا ناچ نچا دیا

عارف بلگرامی

۱۸۹۲ء کا واقعہ ہے، مسٹر بنجمن کے ہمراہ کشمیر کی سیاحت پر جانے کا اتفاق ہوا۔ مسٹر بنجمن کو میں اردو اور فارسی پڑھایا کرتا تھا۔

صاحب موصوف کو سیر و شکار کا خاص شوق تھا۔ مگر مجھے ایک اہم ذاتی کام کی وجہ سے صاحب بہادر کو وہیں چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔

بارہ مولا سے آگے چل کر قریباً نصف رستے میں گڑھی کا پڑاؤ ہے جہاں شب باش ہونا پڑتا ہے۔ اس جگہ ایک ڈاک بنگلہ واقع ہے۔ یہ وہی ڈاک بنگلہ ہے جہاں انگریز سیاحوں کے ہاتھ سے ہندوستانی مسافروں کے لٹنے کی خبریں اخباروں میں گشت کرتی رہی ہیں۔ یہ مقام ہندوستانی مسافروں کے لیے خالی از خطر نہیں،

مہم میں شامل سبھی لوگ پھر واپس پلٹ گئے۔ اگلے سال ماہ مئی میں ارکان مہم جوش و خروش سے کیمپ نمبر چار پہنچے۔ لیکن وہاں حالات دیکھ کر ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے...... وہ چٹان مع سامان غائب تھی۔ پوری ٹیم حواس باختہ ہوگئی اور سرگرمی سے سامان تلاش کرنے لگی۔ یہ عیاں تھا کہ ایک زبردست برفانی طوفان آیا اور چٹان کو سامان سمیت بہا لے گیا۔

ارکان ٹیم بہرحال بڑی سرگرمی سے مختلف جگہوں پہ کھدائی کرنے لگے۔ انھوں نے کئی فٹ گہرائی میں برف کھود ڈالی مگر سامان کا نام و نشان نہیں ملا۔ اب مجبوراً انھیں یہ خوفناک اطلاع دہلی اور واشنگٹن بھجوانا پڑی۔ امریکیوں نے جب یہ سنا کہ سامان مع پلوٹونیم غائب ہے تو ان پر گویا بجلی گر پڑی۔

امریکی حکومت پھر بھارتیوں پر زور دینے لگی کہ وہ ہمالیہ کی ''برف'' چھان کر کسی نہ کسی طرح گمشدہ پلوٹونیم برآمد کریں۔ امریکیوں کو ڈر تھا کہ اگر پلوٹونیم کے ذرات دریائی پانی میں شامل ہو کر بھارتیوں کے گھر پہنچ گئے تو لاکھوں لوگ کینسر (سرطان) سے مر سکتے ہیں۔

چناں چہ آئی بی اور سی آئی اے دونوں انٹیلی جنس ایجنسیوں نے کھوجی پارٹیاں تشکیل دے کر کیمپ نمبر چار کے علاقے میں بھجوائیں۔ یہ پارٹیاں سامان تلاش کرنے میں مدد دینے والے جدید ترین سائنسی آلات سے لیس تھیں۔ مگر تمام ڈیٹیکٹر اور سینسر پلوٹونیم، جنریٹر اور دیگر سامان کا کھوج نہیں لگا سکے۔

پلوٹونیم سے چلنے والا جنریٹر ''سنیپ ۱۹ سی'' (Sanap 19c) کہلاتا ہے۔ یہ جنریٹر پلوٹونیم کی تاب کاری کو بجلی میں بدلتا ہے۔ یہ بجلی پھر نندا دیوی میں نصب وہ سائنسی آلات چلانے میں کام آتی جنھیں چینیوں کے ایٹمی تجربوں کی سن گن لینی تھی۔

۱۹۶۶ء کے اوائل میں چین نے ایک اور ایٹمی تجربہ کیا۔ اس بار حسب توقع میزائل میں ایٹم بم نصب کیا گیا۔ مگر امریکی اس تجربے کے متعلق بھی کچھ نہ جان سکے اور ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اس موقع پہ یہ مثل یاد آتی ہے: جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے، وہ خود بھی اس میں گر سکتا ہے۔

لیکن یہ سنسنی خیز داستان ابھی ختم نہیں ہوئی...... بلکہ اس کا المناک انجام باقی ہے۔ دراصل دریائے گنگا کے معاون دریا، رشی گنگا میں نندا دیوی کے گلیشیئروں سے پانی آتا ہے۔ یاد رہے، دریائے گنگا برصغیر پاک و ہند کے طویل ترین دریاؤں میں سے ہے۔ ماہرین کو خدشہ یہ ہے کہ اگر گمشدہ پلوٹونیم کبھی نہ کبھی رشی گنگا میں آ گرا، تو بڑی تباہی لا سکتا ہے۔ کیونکہ تب بہتا تیز پانی رفتہ رفتہ پلوٹونیم کو گھساتے ہوئے اس کے ذرات الگ کر سکتا ہے۔

چونکہ دریائے گنگا کا پانی لاکھوں بھارتی استعمال کرتے ہیں لہٰذا پلوٹونیم کے ذرات مختلف طریقوں سے انھیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ مثلاً انسانی جسم میں یہ ذرات پہنچے تو انسان کو جلد یا بدیر عالم بالا بھجوا دیں گے۔

گویا اس وقت گمشدہ پلوٹونیم کی صورت موت کی تلوار لاکھوں بھارتیوں پر لٹک رہی ہے۔ حد یہ ہے کہ جدید سائنسی آلات بھی گمشدہ پلوٹونیم تلاش نہیں کر سکے۔ شاید وہ منوں برف تلے دب گیا ہے۔ لیکن جب بھی وہ پگھلتی برف یا بہتے پانی کی زد میں آیا، تو لاکھوں بھارتیوں میں موت بانٹنے لگے گا۔ اسی لیے انھیں دریائے گنگا کا ''پوتر'' پانی استعمال کرتے ہوئے احتیاط برتنی چاہیے۔

بھرتی کرتے تھے۔ چناں چہ اس خفیہ ترین مہم کے لیے بھی انھی دیہات سے ۳۲ قلی معقول معاوضے کے عوض کرائے پر لیے گئے۔ نیز نیپال سے ۹ شرپا (Sherpas) خصوصی طور پر آئے جو پہاڑوں پر چڑھنے کی خاص مہارت رکھتے تھے۔

جاسوسی کی سب سے بڑی ٹیم

یہ بلحاظ نفری تب دنیائے انٹیلی جنس میں وجود میں آنے والی سب سے بڑی مہم تھی۔ اس میں قلیوں اور شرپاؤں کے علاوہ کوہ پیماؤں کی امریکی و بھارتی ٹیمیں، ماہرین ایٹمی توانائی، انٹیلی جنس افسر اور ماہرین سگنل شامل تھے۔ لیکن اس مہم کا انجام بہت بھیانک نکلا۔

۲۴ ستمبر کو مہماتی ٹیم کا قافلہ لتا گاؤں میں جمع ہوا اور کوہ پیمائی شروع ہوگئی۔ ٹیم دوران چڑھائی تین بیس کیمپ قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ چوتھا کیمپ چوٹی کے قریب بنایا گیا۔ وہاں سے چوٹی پانچ گھنٹے کی چڑھائی جتنی اور رہ گئی تھی۔

لیکن اسی دوران موسم سرما آ پہنچا۔ تب امریکی و بھارتی کوہ پیماؤں کو احساس ہوا کہ ان سے ایک بڑی غلطی سرزد ہوئی۔ انھیں مئی یا جون میں مہم کا آغاز کرنا چاہیے تھا۔ مگر وہ بھی کیا کرتے؟ پہلے بھارتی ٹیم ایورسٹ سر کرنے میں مصروف رہی۔ پھر امریکا میں مشقیں کرتے انھیں ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔

بہرحال وسط اکتوبر تک شدید سردی کے باعث سبھی لوگوں کا برا حال ہوگیا۔ ایک ہفتے سے مسلسل برف باری جاری تھی اور لگتا تھا کہ کسی بھی لمحے برفانی طوفان (Avalanch e) آسکتا ہے۔

مہم میں مشہور امریکی کوہ پیما، جیرٹیڈ بھی موجود تھا۔ کوہلی نے اس سے مشاورت کی۔ تھکے ماندے اور بیمار ساتھیوں کو دیکھ کر انھوں نے فیصلہ کیا کہ مہم معطّل کر دی جائے۔ وہ باقی ساتھیوں کی زندگیاں خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ اب سارے ساز و سامان کے ساتھ چڑھنا قریباً ناممکن ہو چکا تھا۔

اس ڈبے میں پلوٹونیم ڈالا جانا تھا

مہم کے سربراہ، منموہن سنگھ کوہلی نے بذریعہ ریڈیو اس فیصلے کی اطلاع سی آئی اے افسر، بل مکنف کو بھجوائی جو لتا گاؤں میں ڈیرے ڈالے بیٹھا تھا۔ اس نے یہ افسوس ناک خبر واشنگٹن اور دہلی بھجوا دی۔ ظاہر ہے، وہاں بھی غم و اندوہ کا مظاہرہ سامنے آیا۔

بحث مباحثے کے بعد فیصلہ ہوا کہ سارا سامان کیمپ نمبر چار میں چھوڑ دیا جائے تاکہ اگلے سال ماہ مئی میں مہم شروع کی جائے تو اُنھیں آلات اور جنریٹر دوبارہ نہ چڑھانا پڑیں۔ شرپاؤں نے سارا سامان قریب ہی واقع ایک بڑی چٹان کے نیچے دبا دیا۔ نیز اُسے رسیوں سے باندھ دیا گیا تاکہ وہ ادھر اُدھر نہ ہو سکے۔

معاملہ درپیش ہے۔ تم اپنی ٹیم کے ساتھ کل ہی امریکا روانہ ہو جاؤ۔ تمہارے پاسپورٹ بن چکے۔"

یہ سن کر کوہلی کو بہت حیرانی ہوئی۔ وہ پاسپورٹ نہیں رکھتا تھا...... اور اس زمانے میں کسی بھارتی کا پاسپورٹ بنتے بنتے کئی ماہ لگ جاتے تھے۔ اور اسی بات سے اُسے یہ بھی احساس ہوا کہ معاملہ خاصا سنجیدہ ہے۔ کوہلی کو پھر معلوم ہوا کہ بھارت اور امریکا کی ایک مشترکہ مہم نے کنچن جنگا...... دنیا کی تیسری بلند ترین چوٹی پر جانا ہے تاکہ وہاں ایک شے نصب کر سکے۔ بقیہ تفصیل امریکیوں نے بتانی تھی۔

نندا دیوی پہ چڑھائی

چونکہ قومی سلامتی کا اہم معاملہ تھا لہٰذا کوہلی نے ہامی بھر لی۔ وہ پھر اپنی ٹیم کے چار کوہ پیماؤں کی معیت میں امریکا پہنچ گیا۔ وہاں وہ چالیس دن تک مقیم رہے۔ اس دوران سی آئی اے کے ایجنٹ سائے کی طرح ان کے ساتھ رہے۔

جب بھارتی ٹیم امریکا پہنچی' تو چین نے ایک اور ایٹمی دھماکا کر ڈالا ۔ اس بار انھوں نے ہوائی جہاز سے ایٹم بم گرایا۔ امریکی حکومت کو یقین ہو گیا کہ اگلے تجربے میں میزائل پہ نصب ایٹم بم چلے گا۔ چناں چہ امریکی حکومت سی آئی اے افسروں پر دباؤ ڈالنے لگی کہ مہم جلد از جلد شروع کی جائے۔

پانچوں مہمان بھارتی کوہ پیما انٹیلی جنس افسر تھے۔ شروع میں انھیں نیویارک اور واشنگٹن کی سیر کرائی گئی' پھر کام کا مرحلہ شروع ہوا۔ امریکی و بھارتی ٹیموں نے مل کر ماؤنٹ میکنلے پر مشقیں کیں۔ یہ امریکا کی بلند ترین چوٹی ہے۔

امریکیوں ہی نے کوہلی کو بتایا کہ "سامان" کا کل وزن ۱۳ کلو ہے اور وہ پانچ ٹکڑیوں پر مشتمل ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر سگنل ماہرین نے اُسے ترتیب سے نصب کرنا تھا۔ ساری تفصیل جان کر کوہلی نے سوچا:

"یہ امریکی یقیناً پاگل ہیں۔ اول کنچن جنگا پر چڑھنا جان جوکھم کا کام ہے۔ پھر ہزاروں فٹ کی بلندی پر عام کیمرے کا وزن بھی من جتنا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بلندی پہ تیرہ کلو وزن لے جانا اور پھر وہاں اُسے سیٹ کرنا...... یہ تقریباً ناممکن ہے۔ میں حیران ہوں کہ یہ تجویز بیری بشپ جیسے تجربے کار کوہ پیما کے ذہن میں کیسے آئی؟"

تاہم کوہلی نے امریکیوں کے سامنے ان خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ جب وہ واپس بھارت پہنچا' تو رامشوار کاؤ کو اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد کاؤ اور بھولا ناتھ کے مابین میٹنگ ہوئی۔ آخر طے پایا کہ آلات کم بلند چوٹی' نندا دیوی پر نصب کیے جائیں۔ یہ بھارت کی دوسری اور دنیا میں ۲۳ ویں بلند ترین چوٹی ہے۔

اس زمانے میں امریکی بھارتیوں کی نسبت پاکستان کے زیادہ قریب تھے۔ لہٰذا وہ چاہتے تو کے ٹو پہاڑ پر آلات جاسوسی نصب کرا سکتے تھے۔ مگر انھیں خدشہ تھا کہ کوئی نہ کوئی پاکستانی انٹیلی جنس افسر چین کو ان کے متعلق بتا دے گا۔ اسی لیے انھوں نے بھارت سے مدد لی۔

پچیس ہزار فٹ سے زیادہ بلند نندا دیوی چوٹی بھارتی ریاست' اترکھنڈ میں واقع ہے۔ علاقے میں لتا (Lata) اور رینی (Reini) نامی گاؤں ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہیں۔ ان سے اوپر کسی انسانی بستی کا وجود نہیں ملتا۔ ان دیہات سے نندا دیوی کی چوٹی ۱۲۴ کلومیٹر دور ہے۔

نندا دیوی جانے والے سیاح لتا اور رینی سے قلی

کے خلاف ایک زبردست منصوبہ زیرِعمل آیا۔

چین کا ایٹمی تجربہ

ہوا یہ کہ ۱۶ ستمبر ۱۹۶۴ء کو چین نے سنکیانگ میں اپنا پہلا ایٹمی دھماکا کر ڈالا۔ اس دھماکے نے امریکیوں کو بھونچکا کر دیا۔ وہ تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ایٹم بم بناتے بناتے چینیوں کو پندرہ بیس سال لگ جائیں گے۔ اُدھر بھارتی بھی چینی ایٹمی دھماکے سے بہت خائف ہوئے۔ انھیں یہ خوف تھا کہ چینی اب چند ایٹم بم مار کر بھارت پر قبضہ کرنے کے قابل ہو گئے۔

امریکیوں اور بھارتیوں کے مشترکہ خوف ہی سے یہ منصوبہ شروع ہوا کہ ہمالیہ میں ایسے جدید سائنسی آلات نصب کیے جائیں جو چینی ایٹمی دھماکوں کی معلومات نوٹ کر سکیں۔

منموہن سنگھ کوہلی اور ''را'' کا چیف رامشوار ناتھ کاؤ

اس منصوبے کے خالق امریکی فضائیہ کے سربراہ، جنرل کرٹس لیمے اور بھولا ناتھ ملک تھے۔ بھولا ناتھ نے بعد اصرار اس کی منظوری بھارتی وزیراعظم سے حاصل کر لی۔ تب تک یہ عہدہ لال بہادر شاستری سنبھال چکا تھا۔

جنرل کرٹس اور بشپ بیری بچپن کے دوست تھے۔ جب چین ایٹمی دھماکے کرنے لگا، تو بیری ہی نے جنرل کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ہمالیہ کے پہاڑوں میں انھیں ریکارڈ کرنے والے آلات نصب کیے جائیں۔ یہ تجویز جنرل کرٹس کو پسند آئی۔ اس کی کوششوں سے پھر امریکی و بھارتی حکومتوں نے بھی اُسے منظور کر لیا۔

ایٹمی تجربات کی اہم معلومات ریکارڈ کرنے والے آلات ایک جنریٹر سے چلنے تھے اور اس جنریٹر کا ایندھن پانچ کلو پلوٹونیم کو بننا تھا...... گویا اس پلوٹونیم والے امریکی ایٹم بم سے صرف ایک کلوگرام جوناگاساکی پر گرایا گیا تھا۔

مگر یہ جنریٹر ایٹم بم نہیں تھا، کیونکہ اس میں ٹریگر (Trigger) نصب نہ تھا۔ مگر پلوٹونیم نہایت خطرناک تاب کار (Radioactive) مادہ ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا ذرہ بھی انسانی جسم میں داخل ہو جائے، تو وہ گردوں یا جگر تک پہنچ کر کینسر پیدا کر دیتا ہے۔

☆☆

منموہن سنگھ کوہلی کو خبر نہ تھی کہ بھولا ناتھ ملک ہی نے بشپ کو اس کے پاس بھجوایا تھا۔ تاہم بشپ کھل کر بات نہیں بتا سکا، چناں چہ کوہلی طے شدہ پروگرام کے مطابق نیپال چلا گیا۔ وہاں وہ مع اپنی ٹیم سرخرو رہا۔ یوں بھارتی کوہ پیماؤں نے بھی اپنے دیس میں پہلی بار دنیا کی بلند ترین چوٹی سر کر لی۔

کوہلی ۲۳ جون کو واپس دہلی پہنچا۔ ہوائی اڈے پر مختلف وزرا اور انٹیلی جنس افسروں نے ٹیم کا استقبال کیا۔ وہیں کوہلی کے باس اور سرحدی پولیس کے آئی جی، بلبیر سنگھ نے اُسے بتایا ''ہوائی اڈے کے وی وی آئی پی کمرے میں ایک شخصیت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ یہ رام شوار ناتھ کاؤ تھا۔

کاؤ نے اُسے بتایا ''ہمیں قومی سلامتی کا ایک اہم

قدرتاً من موہن سنگھ کوہلی کو یہ بات سن کر حیرت ہوئی۔ دو دن بعد وہ نیپال جانے والا تھا۔ جبکہ بشپ چاہتا تھا کہ وہ زیمو گلیشیئر پر پہنچ جائے۔ اس نے بشپ سے پوچھا: ''دوست! آپ پاگل تو نہیں ہو گئے؟'' مگر امریکی کوہ پیما نے اصرار جاری رکھا۔ کوہلی نے بڑی مشکل سے اُسے ٹالا تاہم وہ شک میں مبتلا ہو گیا۔

خفیہ منصوبے کا جنم

کوہلی انڈو تبتی سرحدی پولیس کا افسر تھا۔ اس زمانے میں یہ بھارتی تنظیم آئی بی (انٹیلی جنس بیورو) کے تحت کام کر رہی تھی۔

بھولا ناتھ ملک آئی بی کا سربراہ تھا۔ یہ بھارتی سرکاری حلقوں میں ''مہاپتا'' کہلاتا کیونکہ اسی نے نئے ملک میں انٹیلی جنس ڈھانچے کی بنیاد رکھی تھی۔ چناں چہ کوہلی نے اپنے باس' بھولا ناتھ کو یہ پیغام بھجوایا:

''سر! آج مشہور امریکی کوہ پیما' بیری بشپ مجھ سے ملنے آیا۔ وہ بڑی عجیب باتیں کر رہا تھا۔ درخواست ہے کہ اس پر نظر رکھی جائے۔''

تب من موہن سنگھ کوہلی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ وہ عنقریب دنیائے جاسوسی میں ایک بڑے خفیہ منصوبے کا حصہ بننے والا ہے۔ اس منصوبے نے اسی زمانے کی اہم جغرافیائی و سیاسی تبدیلیوں کے بطن سے جنم لیا۔

ہوا یہ کہ ۱۹۶۲ء میں بھارت اور چین کے مابین جنگ چھڑ گئی۔ اس میں بھارتیوں نے عبرت ناک شکست کھائی۔ چینیوں سے شکست نے بھارتی وزیراعظم' پنڈت نہرو کو توڑ مروڑ کے رکھ دیا جو کمیونسٹ بلاک سے قربت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ ''ہندچینی بھائی بھائی'' کے نعرے لگاتے نہ تھکتے۔ یوں بھارت اور کمیونسٹ چین کی دوستی اب کھلی دشمنی میں بدل گئی۔

اسی وقت امریکی بھی کمیونسٹ بلاک سے نبرد آزما تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کمیونسٹ حکومتیں امریکی مفادات کے خلاف کام کرتی ہیں۔ چناں چہ امریکی ویت نام جا پہنچے اور ایک طویل اور فضول جنگ چھیڑ دی۔ وہاں امریکیوں کی چینیوں سے ٹکر ہو گئی جو کمیونسٹ ویت نامیوں کو اسلحہ اور رقم فراہم کر رہے تھے۔

مشہور کہاوت ہے کہ دشمن کا دشمن اپنا دوست ہوتا ہے۔ چناں چہ چین سے مشترکہ دشمنی امریکا اور بھارت کو بہت قریب لے آئی۔ حالانکہ تب بھارت سوویت یونین کے قریبی ساتھیوں میں شامل تھا۔

پنڈت نہرو نے امریکی خفیہ ایجنسی کو بھارت میں کام کرنے کی اجازت دے دی اور اُسے خاصی چھوٹ دی۔ بھارتیوں نے سی آئی اے کے تعاون ہی سے ایک نئے انٹیلی جنس ادارے ''ایوی ایشن ریسرچ سینٹر'' کی بنیاد رکھی۔ اس کا پہلا سربراہ' رامشور ناتھ کاؤ مقرر ہوا۔ کاؤ بھی بھارتی انٹیلی جنس سیٹ اپ کے بانیوں میں شامل ہے۔ اور اسی شخص نے بعدازاں بدنام زمانہ بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کی بنیاد رکھی۔

سی آئی اے اور ایوی ایشن ریسرچ سینٹر کے زیر اہتمام ہی تبتی مہاجرین کو عسکری تربیت دی گئی تاکہ وہ تبت میں چین کے خلاف چھاپہ مار جنگ شروع کر سکیں۔ تاہم پنڈت نہرو نے یہ ضرور دھیان رکھا کہ امریکی بھارتی معاملات میں زیادہ دخیل نہ ہونے پائیں۔ پاکستان کی مثال ان کے سامنے تھی جہاں امریکیوں کے جوڑ توڑ کی وجہ سے حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی رہتی تھیں۔

لیکن بھولا ناتھ ملک خاصا امریکا نواز تھا۔ اور اسی کی کوششوں سے بھارت اور امریکا کے اشتراک سے چین

ہمالیہ کے برفانی پہاڑوں میں گمشدہ

بھارت کا طبی ایٹم بم

ایک انتہائی خفیہ مہم کا سنسنی خیز قصہ جو چین کے خلاف بھارت اور امریکا کی مشترکہ کوششوں سے انجام پائی...... مگر لاکھوں بھارتیوں کی زندگی خطرے میں ڈال گئی

سید عاصم محمود

من موہن سنگھ کوہلی بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ دو دن بعد وہ مع اپنی ٹیم نیپال روانہ ہو جاتا۔ وہاں اُسے دنیا کی بلند ترین چوٹی' ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنی تھی۔ یہ فروری ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔

ابھی کوہلی دہلی ہی میں تھا کہ ایک غیر متوقع مہمان اس سے ملنے آ پہنچا۔ یہ مشہور امریکی کوہ پیما' بیری بشپ تھا۔ بشپ امریکا کی اس کوہ پیما ٹیم کا حصہ تھا جس نے ۱۹۶۳ء میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کی تھی۔ تب وہ بہ حیثیت فوٹوگرافر نیشنل جیوگرافک میگزین سے منسلک تھا۔ مگر اس کے حیران کن دورے کا تعلق تصاویر سے نہیں تھا۔

بیری بشپ نے کوہلی سے کہا: ''تم ایورسٹ جانے کی تیاریاں چھوڑو اور زیمو گلیشیئر پہنچ جاؤ۔'' یہ گلیشیئر نیپال اور سکم کی سرحد پر واقع تھا۔''

کی۔ خرچہ درخواست اور عملے اور اہلکاروں کے نام پر مزید بہت کچھ لیا جو ملا کر فیس سے بھی زیادہ تھا۔ تاہم ضمانت پختہ کروادی۔

بلدیاتی انتخابات ہوئے۔ وہ نوجوان بھاری اکثریت سے جیت گیا کیوں کہ سعودیہ سے کمائی ہوئی دولت کے سامنے مدمقابل کی سب پیش بندیاں ریت کی طرح بہہ گئیں۔ تاہم برادری میں ایک مستقل مناقشت کا آغاز ہوگیا۔ چند روز بعد ہمارے نوجوان منتخب نمایندے کو مخالفین نے سرِ بازار جوتوں سے پیٹا۔ اس کے کپڑے پھاڑ دیے اور بال نوچ ڈالے۔

ایک ہفتہ بعد اس بپھرے نوجوان نے اسی بازار میں مدمقابل کو بندوق کے فائر سے قتل کر دیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور اسے عمر قید کی سزا ہوگئی۔ اب وہ غالباً اسی بارک نمبرے بی کلاس وارڈ، نیوسنٹرل جیل ملتان میں قید ہے۔ مخالفین نے اس کے باپ بھائی اور چچیرے بھائی کو انتقاماً قتل کر ڈالا۔ یوں دو خاندان مکمل طور پر تباہ و برباد ہو گئے۔

چند روز قبل مجھے نوجوان کا پیغام ملا کہ اس کی اپیل نہیں لگ رہی، لہٰذا میں ضمانت کے لیے کوشش کروں۔ پیغام بر سے پتا چلا کہ سعودی ریال ختم ہو چکے۔ اب فیس کی بات پاکستانی سکے کے مطابق ہوگی۔

قانون یہ ہے کہ دو سال تک اگر اپیل کی سماعت نہ ہو تو اپیل کنندہ کو ضمانت پہ رہا ہونے کا حق ہے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کی ضمانت نہیں ہو گی کیوں کہ خواجہ عبد العزیز کی ضمانت بھی نہیں ہوئی تھی حالاں کہ وہ گوجرانوالہ کا کروڑ پتی کاروباری تھا۔ اس لیے میں نے معذرت کر لی۔

آج بھی میں اپنے مالک مکان کے خوبصورت بنگلے کے سامنے سے گزروں تو ہائی کورٹ پہنچنے تک میرے سامنے خوش بختی اور بدبختی کے متضاد مناظر کی فلم چلتی رہتی ہے۔ میرے مالک مکان اپنے محکمے سے گولڈن ہینڈ شیک کر کے خطیر رقم وصول کر چکے۔ بیوی بچے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں۔ بھرپور صحت اور ان کی دلکش زندگی قابلِ رشک ہے۔ ہر گھڑی نیکیوں اور بھلائیوں کی تلاش میں رہنا انھیں برگزیدہ انسان کے مقام بلند کے قریب تر کرتا ہے۔ ان کی زرعی زمین لاہور کے مضافات میں شامل ہونے سے پانچ چھے گنا زیادہ قیمتی ہوگئی۔ وہ دین کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ اور دنیا ان کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ یہ وہ فضل ہے، اللہ جسے چاہے، اسی کو عطا کرتا ہے۔

دوسرے لمحے میرے سامنے ایک عبرت ناک منظر آ موجود ہوتا ہے...... خواجہ عبد العزیز کی لاوارث لاش، غیروں کے ہاتھوں تدفین اور گم نام قبر۔ تیسرے لمحے خوبصورت اور بانکا نوجوان میری نظروں میں گھوم جاتا ہے جس کے ریال ختم ہو چکے اور وہ جیل کی کال کوٹھڑی میں شاید عمر تمام کر دے۔ لیکن اس کے سامنے ابھی توبہ کا دروازہ چوپٹ کھلا ہے۔ اسے اپنا معاملہ اس ربِ غفور سے طے کرنا ہے جس کی رحیمی اور کریمی کا نقشہ میاں محمد نے یوں کھینچا ہے:

اک گناہ میرا ماں پیو دیکھے، دیوے دیس نکالا
لکھ گناہ میرا مولا دیکھے پردے دیون والا

تاہم توبہ کی توفیق بھی انھی کو ملتی ہے جو مقبول بارگاہ ہوں، ورنہ آخری ہچکی تک آدمی گورکھ دھندوں میں پھنسا بے ٹکٹ موت کی گاڑی میں سوار ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ شاعر انتباہ کر چکا:

بے ٹکٹیاں گڈی مول نہ چڑھنا
اس گڈی جانا دیس بیگانے

(ٹکٹ کے بغیر گاڑی پر ہرگز سوار نہ ہونا کہ یہ گاڑی اجنبی دیس جانے والی ہے)۔

ہوتا ہے!''

نوجوان نے بے خیالی سے میری گفتگو سنی اور ناگوار سا تاثر اس کے چہرے پر نمودار ہوا۔ اس نے سگریٹ سلگایا، جھٹکے سے لائٹر بند کیا، دیر تک دھواں منہ میں بند رکھا اور پھر مختصر جواب دیا: ''میں نے کوئی حج نہیں کیا نہ کوئی عمرہ بلکہ نماز بھی شاید ہی کبھی پڑھی ہو! میں تو دولت کمانے گیا تھا، وہ ڈٹ کر کمائی اور بڑھ چڑھ کر خرچ کی!''

میں یہ جواب سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ بات کو بڑھانا مناسب نہ سمجھا، تاہم اسے گوجرانوالہ کے خواجہ عبدالعزیز کی داستانِ بدنصیبی زبردستی سنا ڈالی:

''خواجہ صاحب ساٹھ برس کی عمر میں قید کی سزا پا کر نیوسنٹرل جیل ملتان میں وارد ہوئے۔ وہ امیر کبیر، موٹے تازے انسان اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے ۔اب ایک طرح سے نفسیاتی مریض تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ ۵۵ اور ۱۹۹۶ء میں حج پر گئے۔ حج سے فارغ ہوت ہی اپنی عیاشانہ زندگی کی طرف لوٹ گئے۔ وطن واپسی کا انتظار بھی نہ کر سکے، وہیں جوارِ کعبہ کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں شباب و شراب کی محفلیں جم گئیں۔ وطن واپس آئے تو بدقسمتی کے اندھیرے سایوں نے آن گھیرا۔ دوسری نوجوان بیوی اور اس کے آشنا کو طیش میں آ کر قتل کر ڈالا۔ اس پر انھیں عمر قید کی سزا ہو گئی۔ پہلی بیوی سے ہونے والے جوان لڑکوں نے عیاش اور بدقماش باپ کی دولت اور جائداد پر قبضہ تو کر لیا مگر اس کی خبر لینی مناسب نہ سمجھی۔

''اب کروڑ پتی خواجہ صاحب لاوارث قیدی تھے۔ وہ اپنی سزا کے خلاف اپیل کے لیے وکیل بھی مقرر نہ کر سکے۔ میں نے بحیثیت قیدی منشی جیل سے ان کی اپیل دائر کی۔ لیکن خواجہ صاحب اپیل کے فیصلے کا انتظار نہ کر سکے۔ پہلے انھیں پاگل پن کے دورے پڑے۔ انھیں دماغی امراض کے اسپتال منتقل ہونا پڑا جہاں ان سے اچھا سلوک نہیں ہوا۔ وہ ناز و نعم سے پلے ہوئے تھے، مشقّت برداشت نہ کر سکے۔

ایک سال کے اندر انھیں دل کا جان لیوا دورہ پڑا اور وہ راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ عبرت کی بات یہ ہوئی کہ جوان اولاد اور پہلی بیوی نے ان کی لاش وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ لاوارث قرار پا کر کسی گم نام قبر میں دبا دیے گئے۔ نیم پاگل خواجہ صاحب نیوسنٹرل جیل ملتان کی بارک نمبر ے میں اونچی آواز سے کہا کرتے تھے: ''کعبے کی بے حرمتی کرنے پر سزا ملی ہے مجھے۔''

؎ حذر اے چیرہ دستاں، سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

نوجوان کہانی سن کر مسکرایا۔ اس نے پھر بے پروائی کے ساتھ سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کے مرغولے فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا: ''آپ میری ضمانت کی فکر کریں۔ ایسی داستانیں سنانے والے دنیا میں اور بہت لوگ موجود ہیں۔ آج دنیا بھر کے ایک ارب مسلمانوں میں سے شاید ہی ایک لاکھ نمازی ہوں۔ تو کیا باقی ایک لاکھ کم ایک ارب جیل چلے گئے، یا پاگل ہو گئے ہیں؟ یہ قسمت کے سودے ہیں۔

''مجھے دیکھیں، میں سعودی عرب پانچ سال من مانی زندگی بسر کر کے آیا اور اتنی دولت کما لایا ہوں کہ میرے اقربا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حالاں کہ وہ حاجی ہیں اور نمازی بھی۔ آپ مہربانی فرما کر میری پکی ضمانت کروا دیں کیوں کہ مجھے آیندہ بلدیاتی الیکشن لڑنا ہے۔ میرا منصوبہ یہ ہے کہ چیئرمین بلدیہ منتخب ہو جاؤں۔ یہ اخلاقی درس آپ کسی اور کو دیں۔''

بات آئی گئی ہو گئی۔ میں نے ڈٹ کر فیس وصول

میرے تکیے پر کون رکھ دیتا تھا۔ میرے مالک مکان میری نگاہ میں ایک مثالی انسان ہیں۔ اب وہ پاکستان واپس آ گئے ہیں۔ اس کے بعد بھی دو تین عمرے کر چکے کیوں کہ ان کا دل انھی پُرنور فضاؤں میں اٹکا ہوا ہے۔

ان کی عمدہ صحت، نورانی چہرہ، متقیانہ زندگی اور امانت و دیانت، اس دنیا میں بھلائی اور آخرت کی یقینی بھلائی..... کس چیز کا تذکرہ کیا اور کس چیز کا چھوڑا جائے؟ اس عظیم اور انمول کردار کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ میں ان کا نام اور پتا ظاہر نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ اجرِ عظیم کی خاطر اللہ تعالیٰ کے ہاں گم نام محسنوں کی صف میں شامل ہو کر حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ تاہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ ملت مسلمہ کا ایک گراں قدر ہیرا ہیں۔ ملت کا عظیم وجود انھی جیسے ہیروں اور موتیوں کا مرہونِ منت ہے۔

بعض اوقات وہ اپنے قریبی اعزہ و اقارب کو بھی یاد رکھتے اور تاثر دیتے کہ یہ قرضِ حسنہ کی مد میں ہیں۔ ان کا ایک ہی تقاضا ہوتا کہ تقسیم عطیات کا سارا کام رمضان کے مقدس مہینے میں تکمیل پائے تاکہ وہ کم از کم ستر گنا اجرو ثواب کے مستحق ٹھہریں۔

اپنے اس بے لوث محسن کی عظیم داستان کے ساتھ ساتھ ایک بدنصیب دوست کی دکھی کہانی سنانے کو بھی جی چاہتا ہے تاکہ نگاہِ عبرت کچھ تو دیکھ سکے۔ یہ صاحب میرے آبائی گاؤں سے ملحق ایک بڑے قصبے کے باسی اور اہم قبیلے کے فرد ہیں۔

اگست ۱۹۹۱، ۱۹۹۲ء کی بات ہے۔ ایک دوپہر وہ میرے پاس منصورہ تشریف لائے۔ ان کے پاس ایف آئی آر کی نقل تھی۔ وہ ہوائی فائرنگ کے الزام میں ضمانت قبل از گرفتاری چاہتے تھے جو بڑی ہی آسان بات تھی۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ وہ براہِ راست ہائی کورٹ اس لیے آئے ہیں تاکہ ناکامی کی صورت میں گرفتاری کا خطرہ نہ رہے۔ میں نے بھاری فیس مانگی۔ انھوں نے بے پروائی سے نیلے سبز نوٹ میرے سامنے رکھ دیے اور فرمایا: ''میں نے پانچ سال سعودی عرب میں خوب دولت کمائی ہے، اس لیے فیس ویس کوئی مسئلہ نہیں۔ ضمانت لازمی طور پر ہونی چاہیے۔''

میں نے اس نوجوان کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ درمیانہ قد، چھریرا بلکہ پھرتیلا بدن، گورا چٹا رنگ، خوبصورت آنکھیں، ستواں ناک، خوبصورت چمکیلے دانت، سفید لٹھے کا کلف لگا تہبند، جو زمین پر ٹخنوں سے نیچے گھسٹ رہا تھا۔ دو گھوڑا بوسکی کا کڑھائی والا کرتا، طلائی بٹن اور اسٹڈ، گلے میں طلائی زنجیر اور انگلیوں میں سونے کی مختلف نگوں سے مزیّن دو انگوٹھیاں۔ اس پر مستزاد ہاتھ میں نفیس رولڈ گولڈ لائٹر اور غیر ملکی سگریٹوں کا پیکٹ تھا۔ وہ سگریٹ کا کش بڑی دلجمعی لگاتا اور نیم وا آنکھوں کے ساتھ بڑے لاابالی انداز سے دھوئیں کے مرغولے فضا میں بکھیرتا۔ مجھے بھاری فیس کے علاوہ بھی اس نوجوان سے دلچسپی ہوگئی کیوں کہ میں اس کے نام اور خاندان کو غائبانہ طور پر جانتا تھا۔ دور پار کی رشتے داری بھی تھی۔

میں نے بات بڑھائی اور سعودی عرب کے حوالے سے پوچھا: ''پھر آپ تو بڑے خوش قسمت ہیں کہ دولت دنیا بھی حرمین شریفین کے جوار میں رہ کر کمائی۔ دو تین حج اور دو تین عمرے تو کہیں نہیں گئے۔ ہوسکتا ہے اس سے زیادہ بھی سعادت ملی ہو۔ پھر حرمین شریفین میں نمازِ پنجگانہ کا عظیم ثواب جو کسی نصیب والے کی قسمت میں

اداروں کو دیا گیا۔ میں رسیدیں حاصل کر کے مالک مکان کے حوالے کر دیتا۔ ہر شعبان میں ان کا خط بلکہ حکم نامہ مجھے موصول ہوجاتا ''دس ہزار جہادِ کشمیر فنڈ اور دس ہزار جہادِ افغانستان فنڈ میں جمع کرادیں۔ بقایا چار ہزار جمعیت طلبہ عربیہ کے شہید فلاں نوجوان کی والدہ کو وہاڑی کے پتے پر منی آرڈر کردیں۔''

عطیات بھیجتے بھیجتے مجھے اسلامی تعلیمی مراکز کے پتے ازبر ہوگئے۔ بعض اوقات وہ اپنے قریبی اعزہ و اقارب کو بھی یاد رکھتے اور تاثر دیتے کہ یہ قرضِ حسنہ کی مد میں ہیں۔ ان کا ایک ہی تقاضا ہوتا کہ تقسیم عطیات کا سارا کام رمضان کے مقدس مہینے میں تکمیل پائے تاکہ وہ کم از کم ستر گنا اجروثواب کے مستحق ٹھہریں۔

میں اپنے مالک مکان کے جذبۂ انفاق پر حیران تھا اور خوش بھی۔ اکثر سوچتا کہ یاالٰہی! دنیا میں ایسے مخیّر لوگ بھی بستے ہیں۔ یہ خیال بھی آتا کہ میرے ممدوح مالک مکان سعودیہ میں ملازمت کر رہے ہیں۔ وہاں ریال کماتے ہیں، اس لیے تیس چالیس ہزار روپے فی سبیل اللہ خرچ کرڈالنا ان کے لیے بڑی بات نہیں۔

میں ۱۹۸۵ء میں عمرے کی سعادت حاصل کرنے مکہ مکرمہ گیا، تو ان کے مکان پر پہنچا۔ انھوں نے انتہائی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ کچھ پوچھے بغیر میرا سامان خود اٹھا کر بالائی منزل پر لے گئے۔ میں دس روز ان کا مہمان رہا۔ غالباً دسمبر کے آخری ایام تھے۔ وہ صبح ناشتا، دو بجے ظہرانہ اور آٹھ نو بجے رات کا کھانا کھاتے۔ میرے لیے بھاری ناشتا پراٹھا وغیرہ تیار کراتے اور رات کا کھانا نمازِ مغرب کے فوراً بعد میرے کمرے میں پہنچا دیا جاتا۔ انھوں نے نہ صرف خود مجھے بے حد عزت و اکرام سے نوازا بلکہ ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے بھی میری خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جدہ روانگی کے وقت میرا بھاری سامان خود اٹھا کر ٹیکسی اڈے پر لے گئے اور مجھے محبّت کے ساتھ روانہ کیا۔

قیامِ حرم کے دوران انھوں نے مجھے منیٰ، مزدلفہ، عرفات، جبلِ نور اور جبلِ ثور کی زیارت کرائی۔ خود کار چلاتے رہے۔ میں نے پوچھا ''وطن واپسی کب ہوگی؟'' مجھے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ مکان خالی کرنا ہوگا، اور مضافاتِ لاہور میں ان کی جو پچاس ایکڑ زمین مزارعت پر لے رکھی ہے، وہ بھی چھوڑنا ہوگی۔

وہ مسکرائے اور فرمایا: ''خاطر جمع رکھو، واپسی کا ابھی کوئی ارادہ نہیں۔ بھلے آدمی، یہاں سے کوئی مسلمان از خود واپسی کا سوچ سکتا ہے؟ جب تک ممکن ہوا حرم پاک کی نمازوں اور سعادتوں سے فیض یاب ہوتا رہوں گا۔ جب ممکن نہ رہا تو یہاں کی پاکیزہ یادیں سینے سے لگائے آپ لوگوں کی خدمت میں آجاؤں گا۔''

سعودیہ میں برسوں قیام کے باوجود ان کا سازو سامان معمولی حیثیت والا تھا۔ غیر ملکی اشیا کی چمک دمک ان کے گھر میں نہیں تھی۔ وہ بہت کماتے لیکن راہِ خدا میں خرچ کر ڈالتے۔ میرے دس روزہ قیام کے دوران تین چار مہمان اور آئے اور میری طرح بے تکلفی سے اپنا گھر سمجھ کر ڈیرے ڈال دیے۔ بعد میں پاکستانی دوستوں نے بتایا کہ تمھارے مالک مکان کا گھر تو حج کے دنوں میں مدینۃ الحجاج کا منظر پیش کرتا ہے۔

مہمانوں کی خوراک و رہائش کا اہتمام تو درکنار، مالکہ مکان حاجیوں کے کپڑے دھونے اور استری کرنے کا فریضہ بھی خود انجام دیتیں۔ ایامِ حج میں ان کے ہاں اکثر اوقات پچاس ساٹھ حاجی قیام کرتے۔ تب مجھے یاد آیا کہ قیام عمرہ کے دوران روزانہ دھلے دھلائے کپڑے

ایک ہی دنیا میں تین مختلف انسان بستے ہیں

"رب کی نافرمانی پر مجھے سزا ملی"

عیش و عشرت میں مست گناہ گاروں کا عبرت اثر قصہ جو اپنے خالق کی ہدایات کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے

محمد اکرم رانجھا

میرا تعلق بنیادی طور پر سرگودھا کے دیہی علاقے سے ہے۔ میں جب کبھی لاہور آتا، جماعت اسلامی کے ممتاز رہنما سید اسعد گیلانی مرحوم یہ کہہ کر مجھے ہجرت پر اکساتے "سرگودھے والے باسی اخبارات پڑھتے اور باسی پھل کھاتے ہیں۔" پھر مجھے قائل کیا کرتے کہ چھوٹے شہر سے ہجرت کر کے بڑے میں آ بسنا سنتِ رسولؐ عربی ہے۔ ہجرت مکہ کے بعد نبی کریمؐ اور آپؐ کے ساتھی کسی ویرانے میں جا بستے تو وہی ویرانہ رشک صد فردوس بن جاتا۔ لیکن

یثرب کو شرفِ ہجرت بخشا جانا یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ بڑے شہر اعصابی مراکز اور کسی تحریک سے وابستہ افراد کی کامیابی کا اولین زینہ ہوتے ہیں۔

بہر حال گیلانی صاحب کی ترغیب سے اور کچھ دنیاوی اغراض کی خاطر ۱۹۷۹ء میں لاہور آ بسا۔ یہاں آ کر مجھے دو ہزار ماہانہ کرائے کے مکان میں رہنا پڑا۔ میرے مالک مکان وہ پہلا کردار تھے جو مجھے باور کرا گئے کہ زمین پہ ایک سے ایک بڑھ کر اللہ کی مخلوق موجود ہے۔ نیز اللہ کے بندے زمین پر عاجزانہ چال چلنے والے ہیں۔ وہ راتوں کو مصلوں کی زینت ہوتے اور دن کے وقت دیانت و امانت سے رزق حلال کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ میرے مالک مکان نے ۱۹۸۲ء میں وطن چھوڑا اور بسلسلہ ملازمت حرمین شریفین کی متبرک زمین کو وطن ثانی بنالیا۔

میں ان کے مکان میں ۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۴ء تک مقیم رہا۔ مکان کا سالانہ کرایہ ۲۴۰۰۰ سالانہ سے شروع ہو کر ۶۰۰۰۰ روپے سالانہ تک پہنچا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ انھوں نے کبھی کرایہ وصول نہیں کیا۔ دس برس کا تمام کرایہ میرے ہاتھوں مختلف خیراتی

چودھری شجاعت حسین نے نیا پتا پھینکا اور جنرل اشفاق کیانی پر الزام لگایا کہ وہ بھی انتخابات میں دھاندلی کرانے میں ملوث تھے۔ دراصل یہ چال چل کر وہ پاک فوج کو اقتدار پر قبضہ کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔

اس موقع پر جنرل راحیل شریف نے نواز شریف حکومت کے خلاف سازش کو ناکام بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ وہ غیر سیاسی رہے اور یہ طے کر لیا کہ پاکستان میں علم جمہوریت بلند رکھا جائے۔

☆

یہ تھا نجم سیٹھی کا تجزیہ جسے نواز لیگ کے حامی میڈیا نے خاصا اُچھالا۔ مگر تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھنا چاہیے۔ عمران خاں اور ڈاکٹر طاہر القادری کا بنیادی نعرہ یہ ہے کہ وہ ملک کا نظام (یا عوامی زبان میں سسٹم) تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے اس مطالبے میں بڑا وزن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا نظام مملکت فرسودہ اور کرپٹ ہو چکا۔

آپ کسی بھی ترقی یافتہ ملک کے سرکاری دفتر جائیے۔ وہاں کسی پریشانی و گھبراہٹ کے بغیر آپ کا کام ہو جائے گا۔ کوئی رشوت لے گا نہ سفارش طلب کرے گا۔ لیکن وطن عزیز میں کوئی سرکاری کام کرانے سے قبل کسی رکن اسمبلی یا سرکاری افسر کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ یا پھر آپ مالدار ہیں، تو پیسا پھینک اور تماشا دیکھ۔

گویا یہ سچ ہے کہ پاکستان میں ایک تا دو ہزار طاقتور و بااثر لوگوں و خاندانوں نے نظامِ مملکت کو ''ہائی جیک'' کر رکھا ہے۔ وہ اس کے ذریعے اپنے مفادات پورے کرتے اور عام پاکستانیوں کو اپنے ماتحت رکھتے ہیں۔ رشوت، سفارش اور اقربا پروری پر مبنی یہ فرسودہ نظام انھیں متکبر اور مغرور بھی بنا چکا۔

اسی کرپٹ نظام نے عام پاکستانیوں کو بھی بے ایمانی کی طرف مائل کر دیا۔ اب وہ بجلی چراتے، ٹیکس بچاتے اور روپیہ کمانے کی ناجائز راہیں ڈھونڈتے ہیں...... مگر جب یہی پاکستانی بیرون ملک جائیں، تو قانون پسند و ایماندارانہ نظام پہ دل و جان سے چلتے ہیں۔

اگر مملکت پاکستان اس کرپٹ نظام سے نجات پا لے اور ملک میں قانون و میرٹ کی حکمرانی آ جائے، عدل و انصاف کا بول بالا ہو، تو وطن عزیز بھی جنوبی کوریا، ملائیشیا اور سنگاپور کی طرح ترقی یافتہ ایشیائی ملک بن سکتا ہے۔ ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے قدرتی وسائل کی بافراط نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ بقول شاعر مشرق ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کرپٹ نظام کے خلاف جہاد فرمایا جو چودہ سو سال قبل کے کرپٹ عرب معاشرے میں رائج تھا۔ گویا یہ سنت رسولؐ ہے۔ جب ایک معزز عورت، فاطمہ بنت اسود چوری کرتے پکڑی گئی، تو آپؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم فرمایا۔ تب مجرمہ کے سفارشیوں کا تانتا بندھ گیا۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مروجہ کرپٹ کے خلاف جو ارشاد فرمایا، وہ آبِ زریں سے لکھنے کے قابل ہے: (مفہوم)

''مسلمانو! یاد رکھو، تم سے پہلے کی قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ ان میں کوئی بااثر و طاقتور جرم کرتا، تو اُسے چھوڑ دیا جاتا۔ لیکن کمزور و غریب سے جرم سرزد ہوتا، تو اُسے کڑی سزا دی جاتی۔ اللہ پاک کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ بھی چوری کرے گی، تو اس کا ہاتھ بھی کاٹا جائے گا۔''

آپ خود سوچیے، کیا پاکستان میں قانون کی حکمرانی اور عدل و انصاف والا ایسا نظام رائج ہے جسے قائم کرنے کی تلقین قرآن و سنت میں دی گئی؟

کے باوجود اس کی بابت اپنے قائد کو آگاہ نہ کر سکیں۔

لیکن اسلام آباد کے تازہ دھرنے شروع ہوئے، تو جلد ہی سیکڑوں کالم نگار اور ٹی وی اینکر دو اور پہلو بھی سامنے لے آئے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صورت حال پہ جتنے منہ اتنی باتیں کی مثل فٹ بیٹھی ہے۔

میڈیا کے ایک گروہ نے پاک فوج کو ان دھرنوں کا ذمے دار قرار دیا۔ صحافی نجم سیٹھی اس گروہ کے اہم راہنما رہے۔ انھوں نے ۵ ستمبر کو اپنے انگریزی ہفتہ وار رسالے فرائیڈے ٹائمز میں ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون کا خلاصہ درج ذیل ہے:

جنرل اشفاق پرویز کیانی وزیراعظم نواز شریف کی خارجہ پالیسیوں سے ناخوش تھے۔ نواز شریف چاہتے ہیں کہ بھارت اور افغانستان سے تعلّقات بہتر ہو جائیں۔ نیز وہ پاکستانی طالبان سے مذاکرات پر آمادہ تھے۔ مزید برآں وہ بضد تھے کہ جنرل مشرف پہ غداری کا مقدمہ چلایا جائے۔ یہ مقدمہ چلتا، تو جنرل کیانی سمیت دیگر جرنیل بھی اس کی لپیٹ میں آ جاتے کیونکہ انھوں نے ۱۹۹۹ء میں صدر مشرف کا ساتھ دیا تھا۔

وزیراعظم نواز شریف کو ''راہ راست'' پر لانے کے لیے پھر دھرنوں کی سیاست کا آغاز ہوا۔ فوجی جرنیل ان دھرنوں کے ذریعے نواز شریف کو پیغام دینا چاہتے تھے کہ اگر وہ اسٹیبلشمنٹ کی ''ڈکٹیشن'' پہ نہ چلے، تو ان کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ اس ضمن میں فوج کے سدابہار کارندے شیخ رشید اور چودھری برادران بھی عمران و طاہر القادری سے آ ملے۔

اسی دوران حکومت اور اس کے ہم نوا میڈیا سے بھاری غلطیاں سرزد ہوئیں جن کی وجہ سے دھرنا سیاست کو عملی جامہ پہنانا ممکن ہو گیا۔ سب سے پہلے جیو چینل نے آئی ایس آئی کو کئی گھنٹے تختہ مشق بنائے رکھا۔ دوم ماڈل ٹاؤن میں پولیس مظاہرین پر چڑھ دوڑی۔

سانحہ ماڈل ٹاؤن کو بہانہ بنا کر ڈاکٹر طاہر القادری اسلام آباد جا پہنچے۔ اُدھر عمران خان نے انتخابات میں دھاندلی کو موضوعِ دھرنا بنایا اور وفاقی دارالحکومت پر یلغار کر دی۔

تاہم دھرنا سیاست دو خرابیوں کے باعث مطلوبہ نتیجہ نہیں دے سکی۔ اول عمران و طاہر القادری لاکھوں لوگ اسلام آباد نہیں لا سکے۔ دوم ماڈل ٹاؤن کے برعکس نواز حکومت نے مظاہرین پر طاقت کا استعمال نہیں کیا۔ چناں چہ اتنی ہلاکتیں نہیں ہوئی جتنی قائدین دھرنا سیاست چاہتے تھے۔

جب نواز شریف حکومت کے خلاف سازش کامیاب ثابت نہ ہو سکی، تو اس میں نئی جان ڈالنے کی غرض سے الیکشن کمیشن کے سابق ایڈیشنل سیکرٹری محمد افضل کو میدان میں اتارا گیا۔

افضل صاحب نے طے شدہ اسکرپٹ کے مطابق سابق چیف جسٹس، افتخار محمد چودھری، جسٹس تصدق حسین جیلانی اور جیو پر یہ الزام لگائے کہ انھوں نے انتخابات میں دھندلی کرائی تاکہ نواز لیگ کامیاب ہو سکے۔ اس انکشاف نے عدالتِ عظمٰی کا مقام خاصی حد تک داغدار کر ڈالا اور وہ ''بیک فٹ'' پر چلی گئی۔

دھرنا سیاست کا نیا موڑ اس وقت سامنے آیا جب ''باغی'' جاوید ہاشمی نے تحریک انصاف میں بغاوت کر ڈالی۔ انھوں نے اشاروں اشاروں میں پیغام دیا کہ دھرنوں کے پیچھے پاک فوج کا ہاتھ ہے اور یہ کہ سب کچھ طے شدہ اسکرپٹ کے مطابق انجام پا رہا ہے۔

جب جاوید ہاشمی نے خفیہ سازش بے نقاب کی، تو

دھرنوں کا اسکرپٹ امریکا نے لکھا!

تحریک انصاف کی اہم رہنما کا انکشاف

عاصم محمود

۱۴ جنوری ۲۰۱۳ء کے انگریزی اخبار ''دی نیوز'' میں تحریک انصاف کی ترجمان، شیریں مزاری کا ایک مضمون شائع ہوا۔ تب اسلام آباد میں ڈاکٹر طاہر القادری کا دھرنا زور شور سے جاری تھا۔ مضمون میں شیریں صاحبہ نے انکشاف کیا کہ اس دھرنے کے پیچھے امریکا کا ہاتھ ہے۔

انھوں نے اپنے انکشاف کی بنیاد اس تجزیے پہ رکھی کہ ۲۰۱۴ء میں امریکا افغانستان سے نکل رہا ہے۔ ایسے نازک وقت میں وہ پاکستان میں منتخب حکومت کے بجائے نگران حکومت چاہتا ہے۔ امریکیوں کو خطرہ ہے کہ جمہوری حکومت کے ساتھ معاملات طے کرنے میں انھیں دشواری آ سکتی ہے۔ امریکا کو پھر یہ بھی علم نہ تھا کہ آمدہ انتخابات کون جیتے گا۔

شیریں صاحبہ کے مضمون سے عیاں ہے کہ اسلام آباد میں عمران خان اور ڈاکٹر طاہر القادری کے دھرنے پہلے سے طے شدہ منصوبے کا حصہ تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب عمران خان بھی امریکی ایجنڈے کا حصہ بن گئے جس کے ذریعے وہ پاکستان میں من پسند حکومت لانا چاہتے ہیں۔ اور شیریں صاحبہ امریکی سازش سے آگاہ ہونے

ستونِ سریر

سریر کا مطلب ہے سونے کی جگہ۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں آنحضرت ﷺ نے اعتکاف فرمایا۔ اس جگہ آپ ؐ کا بستر بچھا ہوتا۔ اسی بستر میں اکثر آپ ؐ آرام فرماتے۔ اس لیے ستون کا نام ستونِ سریر ہے۔

ستونِ وفود

اس جگہ مدینہ سے باہر آئے ہوئے غیر مسلم یا مسلمان وفود سے آپ ؐ ملاقات فرماتے اور دین اسلام کے متعلق انھیں تبلیغ کیا کرتے۔ اسی لیے ستون کا نام ستونِ وفود ہے۔

ستونِ حضرت علیؓ

اس جگہ حضرت علیؓ اکثر نماز ادا کیا کرتے تھے۔ نیز اسی جگہ بیٹھ کر سرکار دو جہاں ﷺ کی پاسبانی فرمایا کرتے۔ آنحضرت ؐ جب حضرت عائشہؓ کے حجرے سے نکل کر مسجد میں داخل ہوتے تو اسی جگہ سے ہو کر گزرتے۔ اکثر اوقات دیگر اصحابہ کرامؓ بھی حضرت علیؓ کے ساتھ آ کر بیٹھ جایا کرتے۔ اس مناسبت سے اس ستون کو ستونِ علیؓ کہتے ہیں۔

ستونِ تہجّد

یہ ستون اصحاب صُفہ کے چبوترے کے سامنے اور حضرت فاطمہؓ کے حجرے کے کونے پر واقع ہے۔ اس جگہ رسول اکرم ﷺ نماز تہجّد ادا فرماتے۔ (یاد رہے کہ نماز تہجّد آنحضرت ؐ پر فرض تھی) اسی لیے اس ستون کا نام ستونِ تہجّد ہے۔

ستونِ جبرئیلؑ

اس جگہ سے حضرت جبرئیلؑ داخل ہو کر آقائے دو جہاں ؐ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے۔ آج کل یہ ستون روضہ مبارک کی حدود کے اندر آنے کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہے۔

◆●●

اقوالِ زریں

☆ میں اس شخص کے متعلق بتا دوں جس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو نرم مزاج اور نرم خو ہو۔
☆ مومن اپنی خوش خلقی کے ذریعے رات کو عبادت کرنے اور دن کو روزہ رکھنے والے شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔
☆ جو شخص عیب جوئی کرتا اور لوگوں پر آوازیں کستا ہے، اس کے لیے بڑی تباہی ہے۔
☆ جو کوئی اللہ پر توکل رکھے، اللہ اس کے لیے کافی ہو گا۔
☆ سب سے زیادہ نیکی اپنے دوستوں اور ہم نشینوں کی عزت کرنا ہے۔
☆ امانت سے رزق بڑھتا ہے، خیانت سے افلاس لازم آتا ہے۔
☆ خود کو مظلوم کی بددعا سے بچاؤ، اس لیے کہ وہ خدا سے صرف اپنا حق مانگتا ہے...... اور خدا حق دار کو اپنا حق مانگنے سے نہیں روکتا۔
☆ وہ شخص کامل مومن نہیں ہو سکتا جو خود تو سیر ہو کر کھائے لیکن اس کا ہمسایہ بھوکا رہے۔
☆ سادگی ایمان کی علامت ہے۔

(انتخاب: اطیب جان، واہ کینٹ)

جگہ اکثر نمازیں ادا فرماتے تھے۔ اس جگہ جو ستون کھڑا کیا گیا، وہ حضرت عائشہؓ کے نام سے موسوم ہے۔

ستون ابی لبابہؓ

روضہ رسولؐ کے بالکل سامنے ستون ابی لبابہؓ واقع ہے جسے ستون توبہ بھی کہتے ہیں۔ اس ستون کی وجہ تسمیہ کچھ اس طرح ہے کہ جب مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تو وہاں پہلے ہی یہودی کافی تعداد میں آباد تھے۔ مسلمانوں نے ان سے امن معاہدہ کر لیا۔ لیکن یہودیوں نے معاہدے کی پاسداری نہ کی اور اسے توڑ دیا۔ نتیجہ اللہ اور نبی کریم ﷺ نے سخت برہمی کا اظہار فرمایا۔ اللہ کی طرف سے حکم نازل ہوا کہ امن معاہدے کی حدیں پامال کرنے والے یہودیوں کو قتل کر دیا جائے۔

حضرت ابی لبابہؓ مدینہ کے پرانے رہائشی تھے۔ ان کے یہودی قبیلہ بنوقریظہ سے دوستانہ مراسم تھے۔ ابی لبابہؓ نے یہ خبر جلد ہی یہودیوں کو جا بتائی اور ہاتھ سے گردن کی طرف اشارہ کیا کہ اب آپ کے گلے کاٹے جائیں گے۔ بعد میں ابی لبابہؓ کو اپنی اس غلطی کا احساس ہو گیا کہ انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اپنی اس غلطی پر وہ اتنے شرمندہ ہوئے کہ احساس ندامت سے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو اللہ اور رسولؐ کا مجرم گردانتے ہوئے مسجد نبویؐ میں ایک درختِ کھجور کے ساتھ رسیوں سے باندھ لیا۔ پھر اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر اپنی غلطی کی معافی مانگنے لگے۔ ان کا کہنا تھا ''جب تک اللہ مجھے معاف نہیں کرے گا، میں اسی طرح اپنے آپ کو رسیوں سے باندھے رکھوں گا۔''

صحابہ کرامؓ نے آنحضور ﷺ سے درخواست کی کہ آپؐ ابی لبابہؓ کی معافی کے لیے بارگاہِ الٰہی دعا فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا ''اگر ابی لبابہؓ خود کو باندھنے سے قبل میرے پاس آتے اور اللہ سے معافی کی درخواست کرتے تو میں ان کے لیے معافی و استغفار کی دعا کرتا۔ اب تو انھوں نے رسیوں سے اپنے آپ کو باندھ لیا ہے۔ اب یہ معاملہ براہ راست اللہ اور ان کے درمیان ہے۔ آپؐ نے پھر خاموشی اختیار کر لی۔ اس دوران حضرت ابی لبابہؓ کی بیوی اور بیٹی آتے اور اُن کو نماز اور حوائج ضروریہ کے وقت کھول دیتے۔ پھر دوبارہ انھیں اسی طرح باندھ دیا جاتا۔

ایک دن نبی کریم ﷺ حضرت اُم سلمٰی کے ہاں قیام فرما تھے، تہجّد کا وقت تھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السّلام تشریف لائے۔ انھوں نے آپؐ کو حضرت ابی لبابہؓ اور چند دوسرے اصحابہؓ کے متعلّق آگاہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی توبہ و استغفار قبول کر لی ہے۔ اُن کی توبہ قبول ہونے کے متعلّق سورہ توبہ (آیت ۱۰۲) میں واضح احکامات موجود ہیں۔

آپؐ نے یہ خوشخبری صحابہؓ کو سنائی کہ اللہ نے ابی لبابہؓ کی غلطی معاف فرما دی ہے۔ صحابہؓ نے یہ بشارت حضرت ابی لبابہؓ کو سنائی اور اُن کی رسیوں کو کھولنا چاہا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر منع کر دیا ''آنحضور ﷺ اپنے دست مبارک سے مجھے آزاد فرمائیں گے۔ میں کسی اور کو اجازت نہیں دوں گا۔'' آنحضور ﷺ نماز فجر کے وقت مسجد میں تشریف لائے۔ خود اپنے دست مبارک سے ابی لبابہؓ کی رسیاں کھولیں اور اُن کو آزاد فرما دیا۔

بعد ازاں اسی جگہ ایک ستون بنایا گیا جسے ستون ابی لبابہؓ کہتے ہیں۔ زائرین اس ستون کے پاس دو رکعت نماز ادا اور توبہ و استغفار کرنے کو باعث فضیلت سمجھتے ہیں۔

مرتبہ ہمارے نزدیک بہت ارفع و افضل ہے۔ اس حدیث کوحضرت ابوہریرہؓ نے روایت کیا ہے۔

زائرین وہاں نماز پڑھتے اور عبادت کرتے ہوئے یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ جنت کے حصے ہی میں بیٹھے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارکہ کے مطابق مسجد الحرام میں ایک نماز کا ثواب ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ گویا مسجد نبویؐ کا مقام مرتبہ مسجدالحرام کے بعد آتا ہے۔ لیکن مسجد نبویؐ میں ریاض الجنّتہ کا مقام و مرتبہ درج بالا حدیث کی رو سے بہت بلند ہے۔

ریاض الجنّتہ روضتہ الرسولؐ سے منبر تک بائیس میٹر طویل اور پندرہ میٹر چوڑا ہے۔ اس حصے میں آٹھ ستون ایسے ہیں جنھیں مسجد نبویؐ کے باقی ستونوں سے امتیاز حاصل ہے۔ ان ستونوں کو سنگ مرمر اور سنہری میناکاری سے مسجد کے باقی ستونوں سے نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ ستون روضہ انورؐ کی مغربی دیوار کے ساتھ ممتاز کر دیے گئے ہیں جو ریاض الجنّتہ کے اندر واقع ہیں۔ ان متبرک ستونوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

ستون حنانہ

یہ منبر رسولؐ کے نزدیک واقع ہے۔ جب کسی اونٹنی کے بچے کو ماں سے جدا کر دیا جائے تو وہ اپنی مادر کے فراق میں روتا اور بلکتا ہے۔ اس آواز کو عربی میں حنانہ کہتے ہیں۔ دراصل اس ستون کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے اسے حنانہ کا نام دیا گیا۔ منبر رسولؐ کے تیار ہونے سے قبل اس جگہ پر کھڑے ہو کر آپ ﷺ اُس کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے۔ لیکن جب منبر تیار ہو گیا تو آپؐ منبر پر کھڑ ہو کر خطبہ دینے لگے۔ تب کھجور کے درخت نے آپؐ کے فراق میں اس طرح رونا چلانا شروع کر دیا جس طرح اونٹنی کا بچہ روتا اور چلاتا ہے۔ اس درخت نے آہ وزاری کے شور سے ساری مسجد کو گویا سر پر اٹھالیا۔

یہ منظر دیکھ کر آنحضور ﷺ منبر سے نیچے تشریف لائے اور اس درخت پر شفقت سے اپنا دست مبارک رکھا۔ درخت نے رونا چلانا بند کر دیا۔ آپؐ نے اس کو مخاطب ہو کر فرمایا ''قیامت میں تو میرے ساتھ جنت میں داخل ہوگا۔'' اس دلاسے کے بعد اُس درخت نے رونا چلانا بند کر دیا۔ جب کھجور کا تنا خشک ہوگیا تو اسے اسی جگہ دفن کر کے ایک ستون کھڑا کر دیا گیا۔ اسی کو حنانہ کہتے ہیں۔ آپؐ کا فرمان ہے ''اگر میں اس درخت کو دلاسا نہ دیتا تو یہ قیامت تک اسی طرح روتا رہتا اور آہ وزاری کرتا رہتا۔'' حجاج کرام اور زائرین اس ستون سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔

ستون عائشہؓ

روضہ رسول ﷺ کی جانب سے چلیں، تو راستے میں آنے والا تیسرا ستون' ستون عائشہؓ کہلاتا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں فرمایا تھا کہ اس مسجد میں ایک ایسی متبرک جگہ موجود ہے کہ اگر لوگوں کو اس کی فضیلت اور نماز پڑھنے کے ثواب کا اندازہ ہو جائے تو وہاں نماز پڑھنے کے لیے وہ قرعہ اندازی اور لمبی لمبی قطاروں میں اپنی باری کا انتظار کریں۔ مگر آپؐ نے اس جگہ کی نشاندہی نہیں فرمائی تھی۔

آپؐ کے وصال کے بعد اصحابہؓ نے حضرت عائشہؓ سے درخواست کی کہ اُس جگہ کی نشاندہی فرمائیے لیکن آپؓ نے انکار کر دیا۔ لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے اصرار پر حضرت عائشہؓ نے اُس جگہ کی نشاندہی فرما دی۔ اس حدیث کی راوی خود حضرت عائشہؓ ہی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اس

ریاض الجنتہ

روضۂ رسول ﷺ اور منبرِ مصطفیٰ ﷺ کے درمیان واقع متبرک علاقے کا روح پرور تذکرہ

فقیر اللہ خان

مسجد نبویؐ کا چپہ چپہ، گوشہ گوشہ مقدس و مطہر اور عطر بیز ہواؤں سے مشکبار ہے۔ آج دور نبوتؐ کا سارا شہر مدینہ مسجد نبویؐ میں شامل ہو چکا ۔ پورے شہر میں وہ کون سی جگہ ہو گی جسے نبی ﷺ مطہر کے قدم چومنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی؟ اس شہر کا ہر ذرہ آفتاب و مہتاب سے بھی زیادہ اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتا ہے کہ اُن کے سینوں پر آفتابِ رسالتؐ کے قدم پڑتے رہے۔ ہماری آنکھوں کی پلکیں اُن ذروں کو چومنے کے لیے ہمہ وقت بیتاب رہتی ہیں۔

مسجد نبویؐ کا وہ حصہ جو روضۂ رسولؐ اور منبر مصطفیٰ ﷺ کے درمیان واقع ہے، بقیہ سب حصوں سے ممتاز اور محترم ہے۔ اس حصے کو نبی آخرالزماں ﷺ نے ''ریاض الجنّتہ'' کا نام عطا فرمایا۔ اس مخصوص ٹکڑے سے متعلق رسول اکرم ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے: ''مابین بیتی ومنبری روضہ ریاض الجنّتہ'' (میرے گھر اور منبر کے درمیان والی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے) یعنی یہ حصہ جنت کا ایک ٹکڑا ہے جو اس دنیا میں اتارا گیا۔ قیامت کے دن یہ ٹکڑا واپس جنت کی طرف اٹھا لیا جائے گا۔ اسی لیے ریاض الجنّتہ کا مقام و

آہ......! تایا گل حسن

یہ حقیقت ہے کہ جو اِس جہان فانی میں آیا اُسے ایک دن جانا ہے۔ موت کا ایک دن معین ہے اور وقت بہت بڑا مرہم مگر کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے جانے سے ایک کمی کا احساس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا...... ایک ایسی ہی ہستی ہمارے تایا جان...... گل حسن تھے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا' تو اُنھیں بچوں اور بڑوں سے شفقت و محبّت سے پیش آتے دیکھا۔ وہ پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رسول اکرم ﷺ کی عقیدت میں وہ ساری ساری رات عبادت میں مصروف رہتے۔ اپنی چھیانوے سالہ زندگی میں سے سینتیس سال بڑی جانفشانی سے ادارہ اردو ڈائجسٹ کے حسابات اور اکاؤنٹس کی نگرانی کرتے رہے۔

تایا گل حسن کی زندگی کے ماہ و سال دعاؤں میں گزرے۔ دواؤں سے وہ پرہیز ہی کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اسپتال کی کبھی بھولے سے شکل نہ دیکھی تھی۔ مگر چند ہفتے پہلے ان کو اچانک سانس لینے میں دشواری محسوس ہوئی تو فوری طور پر ڈاکٹرز اسپتال لے جایا گیا اور یوں ان کی زندگی کے آخری ایام اسی اسپتال کے آئی سی یو میں گزرے۔ میں گاہے گاہے اُن کی عیادت کو جاتا رہا اور ان کی صحت کے بارے میں رپورٹس دیکھنے کے علاوہ ڈاکٹروں سے بھی پوچھتا۔ دوران علاج ایک ڈاکٹر نے طویل عمری اور صحت کے بارے میں تایا جان سے پوچھا کہ اس کا راز کیا ہے؟ تو تایا نے برجستہ جواب دیا "میں نے پیٹ میں آج تک حرام کا ایک لقمہ بھی نہیں جانے دیا۔ اور دوسرا ہمیشہ اپنے کام سے انصاف کیا۔"

تایا جان کی آمدنی اگرچہ قلیل تھی لیکن اس میں سے بھی وہ حتی المقدور عزیز و اقارب اور جاننے والے مستحقین کی مدد اس طرح کرتے کہ دوسرے ہاتھ کو بھی علم نہ ہوتا۔ یہ چار ستمبر ۲۰۱۴ء کا ذکر ہے جب ڈاکٹروں کی تمام تر کوششوں کے باوجود تایا جان کی سانسیں بحال نہ ہو سکیں اور یوں ایک شجر سایہ دار ہم سے دور اُس جہان میں چلا گیا جہاں جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ اُن کی یادیں اُن کے پیاروں کو ہر لمحہ ستاتی ہیں۔ تایا گل حسن جتنے دن اسپتال میں صاحب فراش رہے اُن کے بھتیجے کامران الطاف' بھتیجی قرطبہ مظہر (جن کی پرورش تایا جان نے کی) مظہر سعید' ذکی اعجاز' فاروق اعجاز' قاسم اعجاز' روشن آرا اور زمرد آرا' نواسے دانش اور پوتے بلال دن رات اُن کی خدمت عبادت سمجھ کر کرتے اور اُن کی صحت یابی کے لیے دعائیں مانگتے رہے۔ تایا بھی بچوں سے پیار و شفقت فرماتے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے خاندان کی تیسری نسل کے بچے بھی ان سے بے حد مانوس تھے اور اُن کی کمی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ چار ستمبر جمعرات کو عشا کی اذان سے پہلے موسلا دھار بارش کی وجہ سے لاہور تقریباً ڈوب چکا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا شاید وہ بھی تایا جان کے سفر آخرت پر شدت غم سے آنسو بہا رہا ہے... مگر اُن کے چاہنے والے عزیز و اقارب کا جم غفیر نہر کے قریب واقع جامع مسجد میاں محمد فاضل میں اُن کی نماز جنازہ پر اُمڈ آیا تھا تاکہ ایک ایسی ہستی کو الوداع کہا جا سکے جن کے جانے پہ کہا جا سکتا ہے

بچھڑا کچھ اِس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

تایا گل حسن کی نماز جنازہ کے بعد ان کو لاہور کے قدیم قبرستان میانی صاحب میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

آج ان کو ہم سے جدا ہوئے کئی ہفتے ہو گئے ہیں لیکن اس مہربان ہستی کی یادیں میرے دل سے محو نہیں ہو پاتیں جنھوں نے اپنی ساری زندگی قرآن و سنت کے مطابق بسر کی اور خدمت خلق کو اپنی زندگی کا شعار بنائے رکھا۔ بس یہی دعا کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تایا گل حسن کے درجات بلند فرمائے اور ہم سب کو صبر دے (آمین)

(طیب اعجاز قریشی)

چوک سے ہوتا ہے۔ وہاں آئے دن پولیس پر پتھراؤ معمول کی بات ہے۔ ہمیں ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ چاہے کتنا ہی شدید احتجاج ہو، پولیس یا فوج کے جوان مسجد کے اندر داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتے۔ مسجد کے طرزِ تعمیر کی خاص بات اس کا مقامی بدھ طرز تعمیر کے مطابق بنایا جانا ہے۔ لکڑی کا خوبصورت کام دل کو موہ لیتا ہے۔ مسجد کے اندر ۳۶۰ لکڑی کے ستون عجب نظارہ پیش کرتے ہیں۔

مسجد سے باہر نکلے تو سامنے سے ایک نوجوان موٹر سائیکل پر تیز رفتاری سے گزرا۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ مشتاق لٹرم کا بھانجا ہے۔ ہمارے لیے یہ عجیب سا نام تھا...... لٹرم پٹرم ٹائپ۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ کشمیریوں کی ایک ذات ہے۔ مشتاق احمد لٹرم ہمارے ہاں مشتاق احمد زرگر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ جامع مسجد سری نگر کے نواح میں پلا بڑھا اور بھارتی فوج کے ظلم وستم سے تنگ آ کر اس نے ہتھیار اٹھا لیے اور مجاہدین کی صف میں شامل ہوگیا۔ بعدازاں اس نے اپنی گوریلا تنظیم ''العمر'' کے نام سے بنائی۔ ۱۹۹۲ء میں اسے گرفتار کیا اور اس پر درجنوں جھوٹے سچے مقدمات بنا کر لمبے عرصے کے لیے قید میں ڈال دیا۔

جب مجاہدین ۱۹۹۹ء میں بھارتی طیارہ اغوا کر کے قندھار لے گئے تو اس وقت بھارتی حکومت کو اپنے مسافروں کی رہائی کے بدلے انھیں رہا کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ زیرِ زمین چلے گئے۔ مسجد کی خوبصورتی ہمیں بار بار تصاویر لینے پر مجبور کرتی رہی۔ اس کے بعد ہم ہوٹل روانہ ہوئے اور بمشکل ساڑھے گیارہ بجے پہنچے۔ وہاں نرلیش اپنے بھائی اور بیگمات کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

عجلت ہمارے چہروں سے عیاں تھی۔ پھر بھی اُن لوگوں کے ساتھ الوداعی لمحات خوش کن ماحول میں بسر ہوئے۔ ہم نے اُن کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے بھی ہمیں مسکراتے چہروں سے رخصت کیا۔

فراغت پائی تو ہم نے فٹافٹ سامان لیا، بل بنوایا اور ہوائی اڈے کی طرف نکل پڑے۔ اس کی حدود میں گاڑیوں کی لمبی قطاریں لگی تھیں۔ پہلا ہی مرحلہ پندرہ منٹ میں طے ہوا۔ اگلے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے وکرم نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور ہم پہلو سے ہوتے ہوئے دوسری قطار میں چلے گئے۔ لیکن ابھی اذیت ختم نہیں ہوئی تھی، وہاں ہمیں سامان سمیت اترنا، سامان اسکین کروا کے واپس رکھنا اور پھر آگے جانا تھا۔ تھوڑا آگے گئے تو ایک بار پھر سامان سمیت اتارے گئے اور دوبارہ سامان اسکین ہوا۔ اُسے واپس گاڑی میں رکھا۔ اب کہیں جا کر ہوائی اڈے کی عمارت نظر آئی۔

وکرم نے ایک قلی ہمارے ہمراہ کر دیا۔ وہ ہمارا سامان لیے قطار میں لگ گیا۔ ہم نے وکرم کو الوداع کہتے ہوئے ان کی شاندار مہمان نوازی پہ شکریہ ادا کیا۔ پھر انھیں بھائی وشال سمیت پاکستان آنے کی دعوت دی۔ بعدازاں سری نگر کو الوداع کہتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ قلی ہمارا سامان اسکین کروا کے لے آیا اور ہم نے بورڈنگ پاس لیا۔

کشمیر کے باسیوں کا پیار اور مہمان نوازی ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ خاص طور پر پاکستان اور پاکستانیوں سے اُن کا دلی لگاؤ بے مثال ہے۔ کشمیری بہت ہی کھلے دل کے مالک ہیں۔ مہمانوں کے ساتھ محبّت سے پیش آتے اور ان کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔

◆◆◆

کی قیمتیں ہزار روپے سے لے کر دس ہزار اور اس سے بھی زیادہ تھیں۔ پشمینہ شال پر کام دیکھ کر آنکھیں دنگ رہ گئیں۔ کڑھائی اتنی نفیس اور باریک تھی کہ کپڑا نظر ہی نہیں آتا۔ دکان پر ہی وشال کے فون آنے لگے۔ اس باعث ہمارے بٹوے کی شامت کچھ کم ہی آئی۔

دس پندرہ منٹ میں ہم گونجی باغ میں واقع وشال اور وکرم کے گھر پہنچے۔ بچوں کے اسکول کی چھٹیاں تھیں' اس لیے دونوں کے اہل خانہ امرتسر گئے ہوئے تھے۔ صرف اُن کی والدہ موجود تھیں۔ والد صاحب دو سال پہلے آنجہانی ہو گئے تھے۔ ان کے والد کا کیا ذکر کروں' ایسی شخصیت صدیوں بعد پیدا ہوتی ہے۔ ملے بغیر ہی ہم اُن کے گرویدہ ہو گئے۔

وکرم نے ہمیں اپنے باغ کی سیر کروائی۔ وہاں پہ متنوع پودوں کے بے شمار خوبصورت پھول کھلے تھے جن کی دیکھ بھال مالی کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی کرتے ہیں۔ ایک طرف اُن کا کچن گارڈن تھا جہاں ہر قسم کی سبزی اور پھل لگے ہوئے تھے۔ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔

کھانے کی باری آئی تو تمام مشہور کشمیری کھانے انھوں نے تیار کروا رکھے تھے۔ گشتابہ' آلو بخارے میں پکا مرغ پلاؤ' مولی چٹنی' اخروٹ چٹنی۔ یہ نعمتیں کھا کر پیٹ بھر گیا پر نیت نہیں بھری۔ میٹھے میں خاص کھیر اور رس گلے تھے۔ خوب مزہ آیا۔ قہوے کی باری آئی تو فیصلہ ہوا کہ لِلت ہوٹل جا کر پیا جائے۔

لِلت ہوٹل اصل میں مہاراجا کشمیر کی رہائش گاہ اور گلاب بھون کے نام سے مشہور تھی۔ یہ محل ۱۹۱۰ء میں مہاراجا پرتاپ سنگھ نے تعمیر کروایا۔ بعدازاں مہاراجا ہری سنگھ نے اس کی مزید تزئین او آرائش کی۔ یہ کئی ایکڑ پر بنا اور خوبصورت باغات سے گھرا ہوا ہوٹل ہے۔ اگر نہ دیکھتے تو افسوس رہ جاتا۔ وہاں ایک رہائشی حصے (سویٹ) کا کرایہ ایک لاکھ بھارتی روپے فی رات ہے۔ اس میں دراصل خواب گاہ کے ساتھ بچوں اور ملازمین کے کمرے ملحق ہیں۔ بھارتی اداکار امیتابھ بچن اکثر وہاں ٹھہرتا ہے۔

وکرم نے ہمیں ہوٹل کے مختلف حصے دکھائے اور وہ جگہ بھی جہاں فلموں کی شوٹنگ ہوتی تھی۔ قہوے کا لطف ہم نے سری نگر کا نظارہ کرتے ہوئے اٹھایا۔ آج سری نگر میں ہماری آخری رات تھی۔ ہم اتنا تھک چکے تھے کہ ہوٹل پہنچتے ہی سونے کو ترجیح دی۔ صبح پھر ہمیں جلد نکلنا تھا تاکہ بارہ بجے ہوائی اڈے پہ پہنچ سکیں۔ اس سے پہلے ہم مزید تین جگہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

وکرم کے ساتھ صبح آٹھ بجے کا وقت طے پایا۔ ہم تیار ہو کر ٹھیک وقت پر لابی میں پہنچے' لیکن شفیق عباسی کی سستی کے باعث نکلتے نکلتے نو بج گئے۔ اب دو گھنٹوں میں ہمیں واپس آ کر ہوٹل سے سامان اُٹھانا اور چیک آؤٹ کرنا تھا۔

بھاگم بھاگ جامع مسجد سری نگر پہنچے۔ عجلت میں اندر کا چکر لگایا۔ دو رکعت نماز ادا کی۔ امام مسجد سے ملاقات ہوئی۔ میر واعظ جہاں بیٹھ کر خطبہ دیتے ہیں' وہ جگہ دیکھی۔ مسجد کے چار دروازے ہیں جن میں دو کو عام دنوں میں کھولا جاتا ہے۔ جمعہ کے دن تمام چاروں دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ مسجد کے ایک احاطے سے پہاڑ نظر آتے ہیں جس پر ہندوؤں کا مشہور شنکراچاریہ مندر واقع ہے۔

مسجد کے ساتھ ہی سری نگر کا مشہور نوہاٹا چوک ہے۔ سری نگر میں کوئی بھی احتجاج ہو' اس کا آغاز اسی

والے لوگ اس پر تحفّظات رکھتے ہیں کہ اگر دونوں کشمیر کے درمیان تجارتی اشیا کی فہرست بڑھ گئی تو ان کے مفادات متاثر ہوں گے۔ ہم نے اس پر تجویز دی کہ اس بات کو یقینی بنائیں، کشمیر کی تجارتی اشیا صرف کشمیر کے اندر ہی رہیں۔ اگر کوئی چیز کشمیر کی حدود سے باہر جائے تو آپ اس پر ڈیوٹی لگا دیں۔ اس سے مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور واہگہ بارڈر کی تجارت متاثر نہیں ہوگی۔''

میں نے رؤف احمد کو بتایا کہ پاکستانی صنعت کاروں کے ذہن میں یہ خدشات ہیں کہ اگر بارڈر پر تجارت شروع ہوئی تو وہ بھارت کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے اور بھارتی ان کی مارکیٹ پر قبضہ کر لیں گے۔ اگرچہ اب نواز شریف حکومت اس حوالے سے اہم اقدامات کرنا چاہتی ہے تاکہ پاکستانی صنعت کاروں کے خدشات دور یا کم ہو سکیں۔

رؤف صاحب نے بتایا کہ کشمیر کے لوگ اپنی کشمیری شناخت کے حوالے سے بہت حساس ہیں۔ مثال کے طور پر شیخ عبداللہ کا بھائی، شیخ نذیر آج تک دہلی نہیں گیا۔ وہ کہتا ہے کہ میں پیدائشی طور پر کشمیری ہوں اور کچھ نہیں۔ اس نے انڈیا کا پاسپورٹ بھی نہیں لیا اور اس وجہ سے حج پر بھی نہیں گیا۔ کیونکہ آپ کو اگر بھارت سے باہر جانا ہے تو دہلی سے ہی پاسپورٹ ملتا ہے۔

میں نے بجلی کے فی یونٹ ریٹ کے حوالے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ یہاں فی یونٹ ۳ روپے ۴۰ پیسے ادا کر رہے ہیں۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ پاکستان میں ہم ۱۹ روپے فی یونٹ ادا کر رہے ہیں تو وہ بہت حیران ہوئے۔ اگرچہ کشمیر میں بجلی کے لائن لاسز بہت زیادہ ہیں یعنی ۶۷ فیصد! وجہ یہ ہے کہ کشمیر میں بننے والی بجلی پہلے دہلی نیشنل گرڈ میں جاتی پھر واپس کشمیر آتی ہے۔ سری نگر میں کئی لوگ بجلی کے ہیٹر پر ہی کھانا پکاتے ہیں۔ جبکہ ہم پاکستان میں بارہ بارہ گھنٹوں کی لوڈ شیڈنگ بھگت رہے ہیں۔ کشمیر میں پن بجلی کے کئی منصوبے زیرِ تعمیر ہیں جن کی تعمیر کے بعد وہاں بجلی کے نرخ فی یونٹ ا روپیہ ۲۵ پیسے ہو جائیں گے۔

میں نے اپنے میزبانوں کو لاہور آنے کی دعوت دیتے ہوئے ان سے پوچھا کہ کشمیر چیمبر کی تاریخ کتنی پرانی ہے؟ انھوں نے بتایا کہ کشمیر چیمبر کا کسی بین الاقوامی فیڈریشن سے الحاق نہیں اور وہ اپنی علیحدہ شناخت قائم رکھے ہوئے ہے۔ کشمیر چیمبر آف کامرس انگریز دور میں قائم ہوا تھا۔ میں نے مشورہ دیا کہ وہ سارک چیمبر کے رکن بن جائیں تاکہ انھیں بھی سارک ممالک میں سفر کے حوالے سے ویزہ کا استثنا حاصل ہو سکے۔ یوں تجارت کے مزید مواقع بھی پیدا ہوں گے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور ہمیں ہوٹل واپس پہنچنا تھا اس لیے اپنے مہمانوں سے اجازت طلب کی اور ہوٹل کی راہ لی۔

پشمینہ شال کی کڑھائی

لگ بھگ سات بجے ہم ہوٹل واپس پہنچے۔ آج ہمارا رات کا کھانا وشال اور وکرم کے گھر پر تھا۔ ہوٹل سے ذرا تازہ دم ہو کر وکرم کے ہمراہ اُن کے گھر روانہ ہوئے۔ راستے میں چند دکانیں کھلی نظر آئیں۔ ہڑتال کے باعث تمام بازار بند تھے۔ دکانیں کھلی دیکھ کر خواتین کی تو جیسے عید ہو گئی۔ اُن کے پرزور اصرار پر گاڑی مارکیٹ کی طرف موڑ لی۔

وہاں سے ہاتھ کی کڑھائی کے چند ملبوسات خریدے۔ کمال کی ورائٹی اور ڈیزائننگ دیکھنے کو ملی۔ ایک ہی دکان میں ملبوسات کی ہمہ رنگ اقسام موجود تھی۔ اُن

آئین میں خصوصی درجہ دے دیا گیا۔ نہرو نے وعدہ کیا کہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت عمل کیا جائے گا۔ اس دور میں کشمیر کے اندر کسی قسم کی سرمایہ کاری نہیں ہوئی۔ مالدار لوگ اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں مسئلہ کشمیر کا کیا حل نکلتا ہے۔

دوسرا دور ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۹ء تک کا ہے۔ اس دور میں شیخ عبداللہ کا اندرا گاندھی سے معاہدہ ہو گیا۔ یوں کشمیر کو بھی بھارت کی دیگر ریاستوں کی طرح دیکھا جانے لگا اور وہاں وزیراعظم کی جگہ وزیراعلیٰ نے لے لی۔ اس دور میں بیرونی سرمایہ کاری نے کشمیر کا رخ کیا۔ بڑے بڑے ہوٹل بنے اور کارخانے لگے' تو لوگوں کے لیے روزگار کے دروازے کھل گئے۔

تیسرا دور ۱۹۸۹ء سے ۲۰۱۴ء تک محیط ہے۔ اس دوران کشمیر میں آزادی کی مسلح جدوجہد شروع ہوئی۔ اس دور میں پھر سرمایہ کاری کے حوالے سے جمود طاری ہو گیا ہے۔ ۲۰۰۸ء میں من موہن سنگھ اور آصف علی زرداری نے لائن آف کنٹرول پر تجارت اور مظفر آباد سری نگر بس سروس کا معاہدہ کیا۔ اس سے امید کی کرن روشن ہوئی کہ چلو کوئی نئی منڈی تو ملی۔ اب راولپنڈی سے تجارت ہو گی۔

اس سلسلے میں پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل فارن ٹریڈ سے سفارت خانے میں ملاقات ہوئی۔ انھیں بتایا کہ ابھی تک صرف اشیا کے تبادلے کی حد تک تجارت ہو رہی ہے اور وہ بھی کافی کم ہے۔ ہم نے انھیں کہا: ''آپ اشیائے تجارت کی تعداد' بھارت کے ساتھ تنازعات ضرور سامنے رکھیں لیکن تجارت کو بھی بڑھائیں۔ اسے واہگہ بارڈر پر ہونے والی بین الاقوامی تجارت کی طرح سے نہ لیں مگر کوئی ایسا میکانزم بنائیں کہ دونوں طرف کے کشمیری تاجر اپنے اپنے ملک کی کرنسیوں میں قیمتوں کا تعین کر کے تجارت بڑھا سکیں۔

انھوں نے ہماری بات بڑی توجہ سے سنی لیکن اپنی مجبوریوں سے بھی آگاہ کیا۔ بہرحال موجودہ تجارت کچھ بھی نہیں بلکہ یہ ٹریڈ کے نام پر دھبا ہے۔ ابھی تک صرف بارٹر (Barter) یا مال کے بدلے مال کی تجارت ہو رہی ہے۔ رؤف صاحب نے بتایا ''اس میں بھی مسئلہ یہ ہے۔ مثال کے طور پر میں یہاں کشمیری شالوں کا کاروبار کرتا ہوں۔ میری ایک شال کی قیمت دو لاکھ روپے ہے۔ میں اگر پاکستان دس شالیں بھجواتا ہوں تو اس کا بل ۲۰ لاکھ بنتا ہے۔ لیکن میں بدلے میں ۲۰ لاکھ کے پیاز تو نہیں منگوا سکتا۔ یہ قباحت ہے بارٹر تجارت میں۔''

پاکستان اور بھارت کے مابین کشیدہ تعلّقات بھی دونوں کشمیری علاقوں کے مابین تجارت بڑھنے نہیں دیتے۔ اگر میں نے پچاس لاکھ کا سامان بھجوا دیا اور کسی وجہ سے حالات خراب ہو جاتے ہیں تو میرے پیسے تو گئے نا!''

میں نے ان سے پوچھا کہ ان کے خیال میں مسائل کا کیا حل ہے؟ وہ کہنے لگے: ''ہم چاہتے ہیں کہ دونوں اطراف لائن آف کنٹرول پر تجارتی اشیا کی فہرست میں لامحدود اضافہ کیا جائے۔ کشمیری لوگوں میں اب جذبات کم ہو رہے ہیں۔ وہ زیادہ پریکٹیکل ہو چکے۔ ہم دونوں خطوں کے درمیان تجارت چاہتے ہیں۔ پاکستانی کشمیر کے لوگ ہمارے بھائی ہیں اور باہمی تجارت کرنا ہمارا حق ہے۔ اس حق سے ہمیں محروم نہ کیا جائے۔

''ایک اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ واہگہ بارڈر پر بین الاقوامی تجارت ہوتی ہے اور اس پر کسٹمز ڈیوٹی اور دیگر ٹیکس ادا ہوتے ہیں۔ ایل او سی کی تجارت پر کوئی ٹیکس یا کسٹمز ڈیوٹی نہیں۔ چناں چہ واہگہ کے راستے تجارت کرنے

للٹ ہوٹل سری نگر

ڈل جھیل کا بہترین نظارہ کرنا ممکن ہے۔ یہ باغ آٹھ دالان رکھتا ہے۔ داراشکوہ یہاں اساتذہ کے ساتھ علم فلکیات سیکھتا تھا۔

واپسی پہ چشمہ شاہی رکے، یہ باغ مغل بادشاہ شاہ جہان کے گورنر علی مردان نے ایک قدرتی چشمے کے گرد ۱۶۳۲ء میں تعمیر کروایا۔ اس کا رقبہ تقریباً ایک ایکڑ کے قریب ہے۔ چشمے کا پانی بہت ٹھنڈا اور لذیذ تھا۔ پی کر ساری تکان دور ہوگئی۔ ایک روایت کے مطابق چشمہ شاہی شاہ جہان نے اپنے سب سے بڑے، بیٹے دارا شکوہ کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ چشمے کا پانی پیا ٹھنڈا اور میٹھا پانی پی کر ہم سب تازہ دم ہو گئے یقیناً پانی میں کوئی خاص بات تھی۔

چشمہ شاہی سے نکل کر ہم چیمبر آف کامرس کی طرف روانہ ہوئے اور خواتین کو ہوٹل بھجوا دیا۔ سری نگر چیمبر آف کامرس پہنچے تو سابقہ صدر رؤف احمد پنجابی نے موجودہ صدر کے ہمراہ ہمارا استقبال کیا۔ رسمی سلام دعا کے بعد میں نے اُن سے سوال کیا کہ آج کل حالات میں کشمیر کی معیشت کس سمت جا رہی ہے؟ انھوں نے بتایا کہ سری نگر اور وادی کے دیگر علاقوں میں بیرونی سرمایہ کاری نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو بھی سرمایہ آ رہا ہے وہ صرف جموں تک ہی آتا ہے۔ یہاں کے غیر یقینی حالات کے سبب کوئی ادھر سرمایہ کاری کرنے کا خطرہ مول نہیں لیتا۔

انھوں نے معاشی ترقی کے حوالے سے کشمیر کو تین ادوار میں تقسیم کیا۔ پہلا دور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۵ء تک کا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب کشمیر کا بھارت سے الحاق ہوا تو یہاں کے مسلمانوں نے اس پر سخت احتجاج کیا اور ایک گوریلا جنگ شروع ہوگئی۔ چناں چہ کشمیر کے کچھ حصے پاکستان کے پاس چلے گئے۔ بھارت نے استصواب رائے کرانے کا وعدہ کیا تو یہ جنگ ختم ہوئی۔ کشمیر کو بھارتی

تو کھانا بعد میں لگتا ہے اور کھانے والے پہلے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ کشمیریوں کی یہ اخلاقی قدر بھی بہت بھائی کہ جو بھی آپ کے ساتھ کھڑا ہے، وہ کھانے میں آپ کے ساتھ زمین پر بیٹھے گا، چاہے وہ امیر ہو یا غریب، گورا ہو یا کالا! تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہماری تھالی میں ایک نئی ڈش ڈال دی جاتی ہر ڈش ذائقے میں لاجواب تھی ہم جو لاہور میں شہباز شریف کی مہربانی سے ون ڈش کے عادی ہو چکے ہیں کچھ ہی دیر بعد اپنی شکست کا اعلان کر بیٹھے لیکن میزبان تھے کہ انکار کے باوجود ہماری تھالی کشمیری کھانوں کی مختلف انواع سے بھرتے جا رہے تھے سلاد، دہی، اچار، چمچ، چھری اور ٹشو پیپر سب ایک علیحدہ پیکٹ میں موجود تھا ہر فرد کیلئے ایک ایک پیکٹ دیا گیا تھا۔ میں نے کھانے بعد میزبان سے کھانے کی تعریف کی انھوں نے مجھے بتایا کہ شادی بیاہ کے موقع پر کھانا پکانے والے خصوصی لوگ ہوتے ہیں گوشت بنانے سے لے کر مصالحہ کی تیاری گھر سے باہر شامیانوں کے زیر سایہ ہو رہی تھی ایک تھالی جسے چار افراد کھاتے ہیں کی تیاری پر لگ بھگ چار سے پانچ ہزار بھارتی روپے خرچ ہوتے ہیں تقریباً پندرہ ڈشوں پر مشتمل یہ کھانے تمام رات تیار ہوتے ہیں۔ عام طور پر شادی بیاہ کے فنکشن دن ہی میں کیے جاتے ہیں عام سے عام آدمی بھی چھے سے سات کھانے ضرور اپنے مہمانوں کو کھلاتا ہے یہ کشمیری رسم ورواج کا ایک لازمی حصہ بن چکا ہے۔ جتنا امیر ہوگا اتنی ہی ڈشیں زیادہ ہوگی لیکن کھانے کا انداز اور ترتیب ایک طرح ...... سب لوگ فرش پر ہی بیٹھتے ہیں چار افراد مل کر ایک تھالی میں ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں۔

خواتین کو اگلے دن یعنی بارات کی دوپہر کھانا کھلایا جاتا ہے۔ مہندی میں صرف گھر کی چند خواتین شامل ہوتی ہیں۔ جب ہم اندر گئے تو وہاں چند بچیاں ڈھولک بجا کر کشمیری زبان میں گانے گا رہی تھیں۔ اُن کا ڈھولک بھی ہماری ڈھولکی سے مختلف تھا جیسے ستار ہوتا ہے لیکن پچھلا ڈنڈا بہت لمبا نہیں تھا۔ اُسے ایک ہاتھ سے بجاتے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ بارات میں صرف مرد حضرات آتے ہیں اور محض دو یا تین خواتین اُن کے ہمراہ ہوتی ہیں۔

پری محل کی سمت سفر

شادی سے فارغ ہو کر اگلی منزل کے لیے رواں دواں ہوئے۔ وکرم کے بس میں ہوتا تو آج سری نگر کا کوئی کونا ہمیں دکھائے بغیر واپس نہ جانے دیتے۔ شام کو ۵ بجے ہمیں کشمیر چیمبر آف کامرس کی میٹنگ میں پہنچنا تھا۔ چار بج چکے تھے اور ایک گھنٹے میں ہمیں پری محل اور چشمہ شاہی کی سیر کر کے واپس آنا تھا۔ یہ اب وکرم کی ڈرائیوری کا بھی امتحان تھا کہ ہمیں اونچائی پر جلد پہنچاتے اور واپس لے آتے۔ راستہ بہت خوبصورت تھا۔ ایک تنگ سی سڑک دائیں بائیں استادہ درختوں میں سے گزر رہی تھی۔ قدرتی مناظر سے مالامال اس سفر سے ہم لطف اندوز ہوئے مگر وقت پر پہنچنے کی فکر بھی تھی۔

خیر ہم بخیر وخوبی پری محل پہنچے۔ ٹکٹ خریدی اور ایک چکر لگایا۔ تصویریں اُتاریں۔ وہاں کشمیری لباس میں ملبوس خواتین اور بچے تصویریں بنوا رہے تھے۔ دل تو میرا بھی چاہا کہ کشمیری لباس پہن کر ایک یادگار تصویر بنوا لی جائے لیکن وقت کی کمی نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

سری نگر زبروان نامی سلسلہ ہائے کوہ کے دامن میں آباد ہے۔ اسی سلسلے کے ایک پہاڑ پہ شاہجہان کے فرزند، داراشکوہ نے ۱۶۵۰ء میں ایک خوبصورت باغ بنوایا جو اب پری محل کہلاتا ہے۔ وہاں سے سری نگر اور

یہ ہے کہ اِس کی صفائی رہائشی کشتیوں اور شکارے والوں نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔

رہائشی کشتیاں

ڈل جھیل کے کنارے جا بجا رہائشی کشتیاں لنگر انداز ہوتی ہیں۔ ان کشادہ کشتیوں پر مستقل قیام کرنا بھی ممکن ہے۔ اسی لیے ڈل کی بیشتر رہائشی کشتیاں اب ہوٹل بن چکیں۔ یہ مقامی دیودار کی لکڑی سے بنتی ہیں۔

کشتی کی لمبائی ۷۹ تا ۱۲۵ فٹ اور چوڑائی ۸ء۹ سے ۷ء۱۹ فٹ تک ہوتی ہے۔ ہر کشتی میں قیام و طعام کا بہترین انتظام ہوتا ہے۔ کشتی ایک شکارا (یا چھوٹی کشتی) بھی رکھتی ہے۔ اس کے ذریعے مہمان ساحل پر آتے جاتے ہیں۔

وہاں پہنچے تو وشال کے ساتھ اُن کے چند دوست احباب نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا۔ ہم نے کشتی پہ جھیل کی سیر کی اور ایک رہائشی کشتی (House Boat) اندر سے دیکھی۔ اِن رہائشی کشتیوں میں گرمی کے باعث مچھر بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے وشال اور وکرم نے ہمیں وہاں قیام نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اِن میں ائیرکنڈیشن کا بھی کوئی انتظام نہیں ہوتا' بمشکل پنکھے ہوتے ہیں۔ وہاں میری توقع سے زیادہ گرمی تھی۔ اگرچہ شام کو موسم نسبتاً بہتر ہو جاتا۔ رہائشی کشتی تین کمروں پر مشتمل تھی۔ کشادہ غسل خانے' وسیع ڈائنگ ہال اور باورچی خانہ جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ آپ چاہیں تو پوری رہائشی کشتی بک کرائیں یا صرف ایک کمرا۔ کرایہ فی کمرا ۳۵۰۰ روپے ماہانہ تھا۔

سری نگر کے باسیوں کی معاشرتی' معاشی اور ثقافتی زندگی میں ڈل جھیل کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ زمانہ قدیم میں یہاں کشتیاں ہی آمد و رفت کا بنیادی ذریعہ تھیں۔ آج بھی شہری جھیل میں مچھلیاں پالتے اور سیاحوں کو کشتیوں کی سیر کرا کے روزی کماتے ہیں۔ جھیل میں ''تیرتی سبزی منڈی'' سیاحوں کو اچھوتے مناظر دکھاتی ہے۔

یہ جھیل ۲۲ مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۴۴ء۷ کلومیٹر جبکہ چوڑائی ۵۰ء۳ کلو میٹر ہے۔ بیشتر مقامات پر اس کی گہرائی ۴ء۷ فٹ ہے۔ تاہم وسط میں گہرائی ۲۰ فٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ موسم سرما میں جھیل منجمد رہتی ہے۔ جبکہ گرمیاں شروع ہوتے ہی سائبیریا اور وسطی ایشیا سے ہمہ رنگ پرندے یہاں آ کر قیام کرتے ہیں۔

شادی کی تقریب میں شرکت

جھیل سے واپس آ کر ہم نے کشمیری چائے اور قہوے سے اپنی تکان اُتاری۔ دوپہر کو ایک کشمیری شادی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ شہر کے کچھ علاقوں میں کرفیو نافذ تھا' اس لیے شادی والے گھر تک پہنچنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ کچھ دور اندیشوں کی رائے تھی کہ ہمیں نہیں جانا چاہیے لیکن ایسی نادر تقریب دیکھنے کا موقع پھر کب ملتا؟ لہٰذا کسی چیز کی پروا کیے بغیر وہاں جانے پر اتفاق ہو گیا۔ وہاں پہنچے تو گاڑیوں کا ہجوم نظر آیا' کچھ ہی دیر میں کھانا شروع ہونے والا تھا۔ شادی سری نگر کے ایک بڑے تاجر کے ہاں تھی۔

آج رات مہندی کی رسم تھی۔ دوپہر میں صرف مرد حضرات کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ ایک بڑے تھال میں چاولوں کے اوپر خشک گوشت کی ڈشز ہوتی ہیں۔ باقی سالن بعد میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک اچھی بات یہ دیکھی کہ جب تک سب کو کھانا مل نہ جائے' کوئی تناول نہیں کرتا۔ سب اکٹھے کھانا شروع کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں

میں سے سید عبداللہ ہندوستان آئے۔ ان کے پاس آپ ﷺ کا ایک موئے مبارک بھی تھا۔ جسے بعدازاں مرحوم کے فرزند' سید حامد نے ایک امیر کشمیری تاجر' خواجہ نور الدین ایشائی کو فروخت کر دیا۔

۱۷۰۰ء میں خواجہ صاحب کی دختر' عنایت بیگم نے ایک عمارت تعمیر کرائی اور وہاں موئے مبارک محفوظ کر دیا۔ رفتہ رفتہ ان کے اہل خانہ وہاں دفن بھی ہونے لگے۔ چناں چہ عمارت کو درگاہ حضرت بل کہا جانے لگا۔ یہ وادی کشمیر میں سب سے مقدس اسلامی عمارت سمجھی جاتی ہے۔

درگاہ حضرت بل میں ہمارے لیے بھی سب سے بڑی کشش آنحضرت ﷺ کے موئے مبارک کی زیارت تھی۔ درگاہ کے متولی محمد علی نے بتایا کہ موئے مبارک کی زیارت پورے سال میں دس مرتبہ کروائی جاتی ہے۔ پھر اسے حفاظت کے ساتھ پولیس کے سخت پہرے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ ان ایام کے علاوہ اس مبارک تبرک کو کھولا نہیں جاتا۔ اس سال پہلی مرتبہ ۱۸فروری کو عید میلادالنبی کے موقع پر تین دن موئے مبارک کی زیارت کروائی گئی۔ پھر ۲۷مئی کو شب معراج پر تین دن کے لیے عامتہ الناس اس کی زیارت سے فیض یاب ہوئے۔ تیسری مرتبہ ۲۰جولائی کو اکیس رمضان میں پھر ایک بار موئے مبارک کی زیارت کروائی گئی اور اب آئندہ ستمبر میں ایک دن کے لیے زیارت ہونی تھی۔ درگاہ حضرت بل میں موجود یہ موئے مبارک نبی کریم ﷺ کی ڈاڑھی مبارک کا ہے۔ لہٰذا زیارت کی حسرت دل میں لیے وہاں سے رخصت ہوئے۔

اب ہماری اگلی منزل نگین جھیل تھی جہاں وکرم کے بڑے بھائی ہمارے منتظر تھے۔ نگین جھیل ڈل جھیل ہی کا حصہ ہے' دونوں جھیلیں ایک نالے جیسی گزرگاہ سے ملی ہوئی ہیں' اسی لیے نگین کو علیحدہ جھیل سمجھا جاتا ہے۔ یہ ڈل کے مقابلے میں کہیں زیادہ صاف ستھری ہے۔ اس کی وجہ

چشمہ شاہی سری نگر

پری محل سری نگر

جنھیں ہم خریدے بغیر نہ رہ سکے۔ ہمیں بتایا گیا کہ چندر کوٹ کی چھلیاں اپنے منفرد ذائقے اور مٹھاس کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑی گرین بیلٹ تھی جس میں چنار کے درخت قطار در قطار دعوت نظارہ دے رہے تھے۔ اس جگہ کا اصل نظارہ ستمبر سے اکتوبر کے درمیان موسم خزاں میں دیکھنے والا ہوتا ہے۔ تب درختوں کے زرد پتے جھڑنے کے بعد زمین پر قالین کی طرح بچھ جاتے ہیں۔ آنجہانی اندرا گاندھی خاص طور پر ان پُرکیف لمحات کا لطف اٹھانے وہاں آتی تھیں۔ چنار کے درختوں سے میرا ذہن شیخ عبداللہ کی سوانح حیات ”آتش چنار“ کی طرف چلا گیا۔

درگاہ حضرت بل سے کچھ پہلے ڈل جھیل کے مغربی کنارے پر ۲۶۳ ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی یونیورسٹی آف کشمیر کا قابل دید کیمپس واقع ہے۔ آخر کار ہم اپنی منزل مراد حضرت بل پہنچ گئے۔ پہلے درگاہ میں موجود مزارات پر فاتحہ پڑھی۔ درگاہ کے باہر کبوتروں کا جھنڈ غٹرغوں کر رہا تھا' اُنھیں دانہ ڈالا۔ اس کے بعد دو رکعت نماز ادا کی۔ یہاں پر صفائی کا نظام بہت عمدہ تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی حضرت بلؒ سے عقیدت و احترام کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم سے پہلے وکرم سر ڈھانپ کر مزار میں داخل ہوئے۔ وہاں میں نے ہندو عورتوں کو بھی عقیدت و احترام کا اظہار کرتے دیکھا۔

موئے مبارک کی تاریخ

سری نگر کے مرکز سے دس کلو میٹر دور حضرت بل کا تاریخی علاقہ پھیلا ہوا ہے۔ یہیں مغلوں کے تعمیر کردہ عالی شان باغات موجود ہیں۔ لیکن علاقے کو شہرت ۱۷۰۰ء کے بعد ملی جب وہاں درگاہ حضرت بل تعمیر ہوئی۔ ”بل“ کشمیری زبان میں جگہ کو کہتے ہیں۔ لہٰذا حضرت بل کے لغوی معنی ہیں: محترم و مقدس جگہ۔

روایت ہے کہ ۱۶۳۵ء میں نبی کریم ﷺ کی اولاد

ہفتے کا دن ہم نے سری نگر میں گھومنے اور خریداری کے لیے مختص کر رکھا تھا۔لیکن اطلاع ملی کہ ہفتے کو ہڑتال کا اعلان ہوا ہے۔ چناں چہ نیا پروگرام دوبارہ سے وشال اور وکرم نے مل کر بنایا۔ وکرم ٹھیک دس بجے ہمیں لینے پہنچ گئے۔ طے پایا تھا کہ جہاں راستے بند ہیں اور پتھراؤ ہو رہا ہے، وہاں اگلے دن پاکستان روانگی سے قبل جایا جائے۔

درگاہ حضرت بل

ہمارے ہوٹل سے درگاہ حضرت بل کا راستہ ڈل جھیل کے گرد چکر لگاتے ہوئے طے ہوا۔ راستے میں سب سے پہلے وزیراعلیٰ عمر عبداللہ کا گھر آیا۔ عمر عبداللہ شیخ عبداللہ کا پوتا ہے جنھیں مقامی کشمیری شیر کشمیر کے لقب سے بھی یاد کرتے ہیں۔ شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس طویل عرصے سے کشمیر میں اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھی ہوئی ہے ۔ شیخ عبداللہ کے بعد فاروق عبداللہ نے اپنے والد کی سیاسی گدی سنبھالی۔ بعدازاں ایک وسیع وعریض جائداد اسی روڈ پر مہاراجا کرن سنگھ کی تھی جسے اس کی اولاد تیزی سے بیچ رہی ہے۔ باداموں کے پیڑوں سے ڈھکی ایک گرین بیلٹ کے ساتھ ہی للت ہوٹل کی پرشکوہ عمارت تھی۔ تھوڑا سا آگے بڑھے تو پتا چلا کہ ہم گورنر ہاؤس کے آگے سے گزر رہے ہیں۔

گورنر ہاؤس کو یہاں راج بھون کہا جاتا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر تین خطوں...... جموں، وادی کشمیر اور لداخ پر مشتمل ہے۔ سری نگر ریاست کا سرمائی دارالحکومت جبکہ جموں گرمیوں کا دارالحکومت ہے۔ آج کل راج بھون میں شری این این ووہرا ریاستی گورنر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ہمارا حضرت بل کی جانب سفر جاری تھا۔ ایک طرف ڈل جھیل اور دوسری جانب اہم سرکاری اور نجی عمارتیں، خوبصورت فطری مناظر اور مغلیہ عہد کی نشانیاں جیسے چشمہ شاہی، پری محل اور نشاط باغ ہمیں اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ ہمیں حضرت بل کا سفر ہزار داستان محسوس ہوا۔ ایک سے بڑھ کر ایک منظر اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ ایک جگہ سڑک پر نصب بڑے سے بورڈ پر محبوبہ مفتی کی تصویر اور ان کی جماعت کا نعرہ نظر آیا محبوبہ مفتی کشمیر کی منتخب نمائندہ ہیں ان کے بارے میں زبان زد عام ہے کہ ان کے اپنے شوہر سے تعلقات کشیدہ رہے اور ایک روز ان کے شوہر نے محبوبہ کا ایک کان ہی اپنے دانتوں سے چبا ڈالا۔ تصویر میں محبوبہ وہ کان اپنی چادر میں چھپاتے نظر آتی ہے ہم چاروں کو یہ واقعہ بڑا عجیب لگا خاتون سے ایسا سلوک آج کے دور میں ۔۔۔ محبوبہ مفتی، مرحوم مفتی محمد سعید کی صاحبزادی ہیں جو انڈیا کے ہوم منسٹر اور جموں و کشمیر کے چیف منسٹر بھی رہے۔ محبوبہ مفتی جموں و کشمیر پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کی سربراہ ہیں۔

نشاط باغ سے آگے گزرے تو ہمیں بتایا گیا کہ باغ کی پچھلی سمت واقع پہاڑ کے پیچھے ڈاچی گام نیشنل سفاری پارک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں خاص طور پر کشمیری بارہ سنگھوں کی قدرتی ماحول میں پرورش کی جاتی ہے۔ اگر صبح سویرے چار بجے ادھر جایا جائے تو ان کے غول کے غول چرتے ملیں گے۔ ڈاچی گام کا مقامی زبان میں مطلب ہے "دس گاؤں۔" اصل میں اس پارک کو بنانے کے لیے یہ گاؤں یہاں سے منتقل کیے گئے تھے۔ یہ پارک ۱۴۱ مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ ۱۹۱۰ء میں مہاراجا جموں و کشمیر نے بنوایا اور اس کا مقصد سری نگر شہر کو صاف پانی مہیا کرنا تھا۔ بعد میں ۱۹۸۱ء میں اسے نیشنل پارک کا درجہ دے دیا گیا۔

راستے میں ایک کشمیری چھلیاں (بھٹے) بیچ رہا تھا

وشال کو بھی ہم نے وہاں پہنچنے کا پیغام بھجوا دیا۔ ان کے چھوٹے بھائی وکرم جو امرتسر سے اسی دن آئے تھے' وہ بھی ہمراہ آ گئے۔ کھانے میں تمام ڈشیں گوشت سے بنی تھیں۔ ایک حیران کن بات یہ کہ راکیش کی بیگم سبزی خور ہیں لیکن گوشت والے سارے کھانے انھوں نے اپنے ہاتھ سے بنائے۔ عموماً سبزی خور کسی بھی قسم کے گوشت کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔

کھانے پر ہماری ملاقات دور درشن (ٹیلی ویژن) کے ایک سابقہ پروڈیوسر' قیوم ودیرا سے ہوئی۔ انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران پیش آنے والے دل خراش واقعات ہم سے بیان کیے۔ کہنے لگے' میں بھارت کا شہری ہوں اور مجھے اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہے لیکن کچھ کشمیریوں کو میرا دور درشن میں کام کرنا پسند نہیں تھا۔ وہ اس حوالے سے مجھے تنگ کرتے رہتے۔ کئی دفعہ رات کے وقت دروازے پر دستک ہوتی اور تین چار مشٹنڈے میرے ڈرائنگ روم میں گھس جاتے اور دھمکیاں دینے لگتے۔ پھر ہزار، پانچ سو روپے لے کر رخصت ہوتے۔ کئی دفعہ انھیں پکڑ کر مارا گیا۔ اُن کے خیال میں کشمیر کے اندر مسلح جدوجہد کرنے والے لوگوں کو باہر خصوصاً عرب ممالک سے مالی مدد ملتی ہے۔ اِن حالات میں انھیں سری نگر چھوڑ کر دہلی جانا پڑا۔ وہاں انھوں نے ''میری بات'' کے نام سے دور درشن پر بچوں کا ایک پروگرام شروع کیا جس کی سات سو کے قریب قسطیں آ چکی ہیں۔ یہ بھارتی قومی ٹیلی ویژن کے مقبول ترین پروگرام کا درجہ رکھتا ہے۔ اس پروگرام میں بچے اپنے مسائل پر کھل کر گفتگو کرتے اور آخر میں میزبان اور مہمان اس مسئلے کا حل بتاتے لیکن شرکاء پر حل تھوپا نہ جاتا بلکہ اُن کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا یوں نوجوان آزادی سے گفتگو کرتے مثلاً فاسٹ فوڈ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اس کے نقصانات جیسے موضوعات۔

میں نے ان سے کشمیری نوجوانوں کے مستقبل سے متعلق سوال کیا' تو کہنے لگے کہ شروع میں کشمیر کے حالات خراب نہ تھے۔ نہرو نے مسئلہ کشمیر کے حل کا وعدہ کیا لیکن اُس نے مسئلے کو لٹکائے رکھا جس سے نوجوانوں کے دلوں میں رنجش پیدا ہوگئی کہ بھارت اُن سے دھوکا کر رہا ہے۔ پھر لوگوں کے درمیان معاشی خلیج بھی کافی بڑھ چکی تھی۔ غریب نوجوان جب امیروں کے بڑے بڑے گھر اور بنگلے دیکھتے' تو ان کے اندر نفرت کے جذبات ابھرنے لگتے۔

جب کشمیر میں مسلح جدوجہد شروع ہوئی تو اس میں بھی بہت سے جرائم پیشہ لوگ شامل ہو گئے۔ وہ تحریک کی آڑ میں لوگوں سے بھتہ وغیرہ لینے لگے۔ انھوں نے بتایا کہ آج بھی مودی حکومت جموں اور لداخ کی ترقی کی بات تو کرتی ہے اور وہاں پر بڑے بڑے پروجیکٹ لگائے جا رہے ہیں لیکن وادی کے لوگوں کو حالات کے رحم وکرم پر ہی چھوڑا ہوا ہے۔

قیوم ودیرا کے مطابق بھارتی حکومت کی لداخ پر خاص توجہ کے پیچھے وہاں چین کا بڑھتا ہوا اثر ہے۔ لداخ کے باشندے بھارت سے زیادہ چین سے قربت محسوس کرتے ہیں۔ وہاں اکثر مصنوعات پر ''میڈ اِن چائنا'' کی بھرمار نظر آتی ہے۔ اسی خطرے کی بو پا کر مودی فوری طور پر لداخ کی طرف متوجہ ہوا ہے۔

یہ سبھی معلومات ہمیں راکیش کے گھر کھانے کے دوران ملیں۔ بہرحال کھانے بھی خوب مزے کے تھے۔ طعام سے فارغ ہو کر ہم نے رخصت لی۔ اس طرح جمعتہ المبارک کا دن خیر و عافیت سے اختتام کو پہنچا۔

کرنے پہلگام آتے ہیں۔

پہلگام سے ۱۶ کلومیٹر دور چندن واڑی نامی مقام واقع ہے۔ وہیں سے ہندو "امرناتھ یاترا" کا آغاز کرتے ہیں۔ یہ ۳۰ کلومیٹر طویل یاترا ایک غار میں واقع امرناتھ مندر جا کر ختم ہوتی ہے۔ ہندومت میں یہ مندر بڑا پوتر (مقدس) سمجھا جاتا ہے۔

ہم طویل سفر طے کر کے بخیر و عافیت پہلگام پہنچے۔ راستے میں مشہور مقامات' اسلام آباد اور اننت ناگ دیکھے۔ رستے میں جگہ جگہ بھارتی فوج چار چار کی ٹولیوں میں سڑک کے دونوں اطراف موجود تھی جو کشمیر کی کشیدہ صورت حال کا واضح اشارہ تھا گو کہ ان دنوں حالات نسبتاً بہتر تھے لیکن یاترا کے مسئلہ کی وجہ سے حالات بگڑنے کا خدشہ موجود تھا شاید یہی وجہ تھی کہ بھارتی فوج بڑی تعداد میں تعینات تھی۔ نماز جمعہ پہلگام کی مسجد میں پڑھی۔ وضو گاہ تلاش کے باوجود نظر نہ آئی اور بیت الخلاء کا برا حال تھا مسجد کے ساتھ ہی دریا بہہ رہا تھا دو کشمیری نوجوان مجھے پتھروں پر چلاتے دریا کے کنارے لے گئے میں نے دریا کے بہتے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کیا خوبصورت منظر تھا سامنے اونچے سرسبز پہاڑ بہتا دریا اور دور تک دریا کے کنارے پتھر۔۔۔ مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھر چکی تھی مسجد کے ہال کے باہر برآمدے میں جگہ ملی قالین اور دریوں کی حالت بتا رہی تھی کہ صفائی کا نظام ناقص ہے پتہ نہیں ہم مسلمان جن کے ایمان کا نصف صفائی ہے اس کا خیال کیوں نہیں رکھتے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو صفائی کی بڑی تاکید کرتے اس کے مقابلے میں سکھوں کے گردوارے نہایت صاف ستھرے اور اس کا انتظام بہترین دیکھا گیا۔ نماز کے بعد وہ دونوں کشمیری نوجوان مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے آ ملے وہ پاکستان کے بارے میں جاننا چاہتے تھے اور کوئی پاکستانی نشانی بھی چاہتے تھے ہم نے آپس میں ای میل اور وائٹس اپ کا تبادلہ کیا اور رابطہ رکھنے کا وعدہ کیا ان کا تعلق آئی ٹی کے شعبے سے تھے وہ دیر تک پاکستان سے محبت کا اظہار کرتے رہے کچھ دیر قیام کرنے کے بعد ہم آدھ گھنٹے کی مسافت پر بیتاب وادی کی طرف رواں دواں تھے۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ وادی کا نام بیتاب اس لیے رکھا گیا کہ وہاں بیتاب نامی فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ بیتاب فلم ۵/اگست ۱۹۸۴ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ اسے ہندی سینما کی تاریخ میں رجحان ساز سمجھا جاتا ہے کہ اس نے جدید رومانی فلموں کی داغ بیل ڈالی۔ اس فلم کی کہانی' شبانہ اعظمی کے شوہر جاوید اختر نے لکھی۔ یہ امرتا سنگھ کی پہلی فلم تھی جس کی سیف علی خاں سے شادی بھی ہوئی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ دھرمیندر کے بیٹے سنی دیول کی بھی یہ پہلی فلم تھی۔ وادی بیتاب ہی میں "راک اسٹار" فلم کی شوٹنگ بھی ہوئی۔

وہاں ایک جھیل کے کنارے چادر بچھا کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ یہ وادی پہلگام سے پندرہ کلومیٹر دور واقع ہے۔ وادی میں ہرے بھرے گھاس کے میدان کثرت سے ہیں جنھیں دیکھ کر آنکھوں کو تقویت ملتی ہے۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد واپسی کا سفر شروع ہوا کیونکہ رات کو ہمیں راکیش صاحب کے گھر کھانے پر جانا تھا۔ موسم وہاں بہتر تھا بلکہ دوران سیاحت شال اوڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

راستے میں طے پایا کہ اسی علاقے میں واقع چھے ہزار سال پرانا مندر بھی دیکھ لیں۔ نجانے کیوں وہ نہایت پراسرار محسوس ہوا۔ ہم ٹھیک آٹھ بجے ہوٹل پہنچے اور ساڑھے آٹھ بجے راکیش ہمیں لینے آ گئے۔

کر کے سیدھا ہمارے پاس آگئے اور یوں ہم ان کی راہنمائی میں پولو مارکیٹ پہنچے۔ وہاں ملبوسات پہ کشمیری دست کاری کا کام دیکھ کر خواتین دنگ رہ گئیں۔ کام میں اتنی باریکی اور نفاست ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ کوئی شے خریدنے کے لیے سودے بازی خوب کرنی پڑتی ہے۔ کچھ خریداری کر چکے تو یوشال کے قریبی دوست نریش کے گھر کی جانب روانہ ہوئے جنھوں نے ہمیں کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ اُن کا اسکول و کالج کی کتابوں اور سٹیشنری کا ہول سیل کاروبار تھا۔ اُن کا گھر اندرون شہر میں واقع ہے جہاں دن کو تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں ہوتی۔ تاہم رات کو بڑے آرام سے ہم گاڑی اُن کے دروازے تک لے گئے۔

امرتسر سے تعلق رکھنے والا یہ ہندو خاندان کئی دہائیوں پہلے یہاں آباد ہوا تھا ہمارا پاکستانی اور لاہوری ہونے کی وجہ سے میزبانوں نے بڑی خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ مشترکہ خاندان میں رہتے ہیں۔ اُن کے چھوٹے بھائی کا خاندان اور والدہ بھی ساتھ ہی مقیم تھیں۔ بیٹھک میں وہی زمین پر بیٹھنے کا رواج تھا۔ آج پھر ہم کشمیری کھانوں سے محظوظ ہوئے۔ کشمیر میں چاول بہت زیادہ استعمال کیے جاتے ہیں لیکن باسمتی نہیں۔ کشمیری خاص چاول پکاتے ہیں جو لمبا تو اتنا نہیں لیکن چوڑا زیادہ ہوتا ہے۔ کھانے کے دوران کشمیر اور پاکستان کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی اور ہمیں ایک ہندو خاندان کے خیالات جاننے کا موقع ملا اس کے باوجود کہ وہ ہندو تھے خاندان کے تمام لوگ صدیوں پرانی کشمیری شناخت قائم رکھنا چاہتے تھے ان کا رہن سہن کشمیری مسلمانوں کی ہی طرح تھا لباس شلوار قمیض کھانا پینا سب کشمیری مسلمانوں جیسا تھا وہ بتا رہے تھے کہ وہ یعنی ہندو اور مسلمان صدیوں سے یہاں کشمیر میں اکٹھے رہ رہے ہیں اور کبھی ہمارے درمیان تصادم یا فسادات نہیں ہوئے اور اس کی بنیادی وجہ صوفی بزرگ شاہ ہمدان جو ایران سے کشمیر تشریف لائے تھے کی تعلیمات اور تربیت ہے شاہ ہمدان نے ۲۴ ہزار لوگوں کو مسلمان کیا اور تمام مذاہب کے لوگوں سے رواداری اور بہتر سلوک کی تربیت دی وہ اپنے ساتھ ۷۰۰ سو لوگ لائے تھے جو اپنے اپنے شعبوں کے ماہر تھے جنہوں نے کشمیر کے عوام کو متعدد ہونا سیکھا جس میں قالین بافی، پیپر ماشی اور فرنیچر پر کارونگ وغیرہ شامل ہیں یہی وجہ کہ کشمیر میں کوئی کشمیری بیکاری نظر نہیں آتا ہر کوئی ہنر مند ہے اور اپنے گزر بسر کیلئے روزی کما لیتا ہے۔ غریب سے غریب کشمیری کا بھی اپنا گھر ہے۔ ہم آج اتنا تھک چکے تھے کہ کھانا کھاتے ہی وہاں سے نکل پڑے۔

صحت افزا مقام...... پہلگام

یہ طے پایا تھا کہ نریش ہمارے ساتھ پہلگام چلیں گے جو سری نگر سے تین گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ عباسی صاحب نے اُن کی والدہ سے درخواست کی کہ ہمیں کچھ پراٹھے اور اچار ہمراہ دے دیں۔ صبح ۹ بجے نکلنے کا وقت طے پایا۔ ہم صبح صبح تیار ہو کر ہوٹل کی لابی میں بیٹھ گئے لیکن پراٹھوں نے دیر کروا دی۔ نریش پراٹھوں کے ساتھ ساتھ آلو کی بھجیا، پنیر کا سالن، اچار اور برتن غرض کھانے کے لیے ضروری ہر شے ساتھ لے کر آئے۔

ضلع اننت ناگ میں واقع صحت افزا پہاڑی مقام، پہل گام سری نگر سے ۷۸ کلومیٹر دور ہے۔ یہ دریائے لدر کے کنارے واقع ہے۔ یہ دریائے جہلم کا معاون دریا ہے۔ پہل گام کے اردگرد واقع میدان اور پہاڑ موسم گرما میں سبزے اور رنگ برنگ پھولوں سے بھر جاتے ہیں۔ تب دنیا بھر سے سیاح قدرتی دلکشیوں کا نظارہ

ایشیا کا سوئٹزر لینڈ

صبح ہم جلد بیدار ہو گئے اور گلمرگ جانے کے لیے نکل پڑے۔ گلمرگ کو ایشیا کا سوئٹزر لینڈ بھی کہا جاتا ہے۔

دو گھنٹے سفر طے کر کے ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ وہاں کا فطری حسن واقعی بہت ہی خوبصورت تھا۔ پہاڑوں پر جمی برف حسین منظر پیش کر رہی تھی۔ وہاں کی خاص چیز کیبل کار' گنڈولا (Gondola) سے ۱۴۰۰۰ فٹ بلند پہاڑ پر جانا ہے۔ راستے میں دو اسٹاپ آتے ہیں۔ موسم ناخوشگوار ہو تو دوسری منزل پر نہیں جا سکتے۔ اس قدر بلندی تک یہ کیبل کار فرانسیسی کمپنی کی مدد سے لگائی گئی اور سیاحوں کی بڑی تعداد روزانہ یہاں کے پرلطف مناظر دیکھنے کھنچی چلی آتی ہے۔

بلندی پر جانے کے لیے گھوڑے اور خچر بھی استعمال کیے جاتے ہیں یا پھر اپنی ٹانگوں کا امتحان لینا پڑتا ہے کہ آپ میں اب تک کتنا دم خم ہے۔ وہاں برف پر چلنے کے لیے خاص جوتے اور سردی سے بچاؤ کی خاطر جیکٹیں بھی کرائے پر دستیاب تھیں۔ خواتین نے تو پیدل ہی جانے کا فیصلہ کیا جبکہ میں اور شفیق عباسی گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔

پہاڑ پر چڑھنے کا ایک عجیب اور الگ ہی مزا ہے۔ گلمرگ میں برف پر اسکی انگ (Skiing) بھی سکھائی جاتی ہے۔ سردیوں میں بیرون ملک سے بے شمار لوگ وہاں ''اسکی انگ'' اور سیر کرنے آتے ہیں اور خوب رونق رہتی ہے۔ وکرم صاحب کی بارہ سالہ بیٹی بھی اس کھیل کی ماہر ہے۔ وہ ہر سال ایک مہینے کے لیے (موسم سرما کی چھٹیوں کے دوران) تنہا وہاں رہتی ہے۔ بچوں کو اسکی انگ سکھانے کا بہترین انتظام ہے۔ کوچ بھی مہیا کیا جاتا ہے۔

کیبل کار سے واپسی کا سفر شروع کیا' تو خوبصورت مناظر نظر آئے۔ نیچے پہنچنے کے بعد مشہور ہوٹل خیبر میں کھانے کے لیے شیف کو پہلے ہی سے ہدایات دے دی گئیں تھیں۔ ہمارے میزبانوں نے اس ہوٹل کی بہت تعریف کر رکھی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہمارے معیارِ ذائقہ پر پورا اترا۔ بقول اُن کے اگر وہاں سے کھانا کھائے بغیر واپس گئے تو پچھتائیں گے۔

ضلع بارہ مولا میں واقع پہاڑی مقام (ہل اسٹیشن) گلمرگ' سری نگر سے ۵۲ کلومیٹر دور واقع ہے۔ یہ ۸۸۲۵ فٹ کی بلندی پر آباد ہے۔ اس کے اردگرد پیر پنجال سلسلہ ہائے کوہ کے پہاڑ واقع ہیں۔ ان پہ موسم سرما میں خوب برف باری ہوتی ہے۔ پاک بھارت کی عارضی سرحد لائن آف کنٹرول گلمرگ کے نزدیک ہی ہے۔

کشمیری نوجوان گائیڈز کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں تو اُن کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ وہ ہم سے پاکستان کی کوئی نشانی مانگنے لگے۔ میرے پاس بٹوے میں سو روپے کے چند پاکستانی نوٹ تھے جو میں نے اُن میں بانٹ دیے۔ انھوں نے ہمارے ساتھ بڑی محبّت اور عقیدت سے تصویریں بھی بنوائیں۔ وہ پاکستان کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے تھے لیکن ہم نے احتیاطاً زیادہ گفتگو سے پرہیز کیا۔

کھانے کے بعد واپسی کا سفر شروع ہوا۔ ماہ اگست میں سری نگر اور اس کے گرد و نواح میں اچھی خاصی گرمی تھی' میری اُمید سے بھی زیادہ۔ اسی لیے ہلکے پھلکے کپڑے ہی زیب تن کیے گئے۔

ہوٹل پہنچنے کے بعد ایک گھنٹا آرام کیا اور پھر سوچا کہ کچھ دکانیں دیکھ لی جائیں۔ وشال اپنے دفتر سے کام ختم

کھانے سے فارغ ہوئے تو پروگرام کے مطابق وشال ہمیں اندرون شہر (جسے منّی پاکستان بھی کہا جاتا ہے) اور ڈل جھیل کی سیر کروانے لے گیا۔ اندرون شہر کی چھوٹی چھوٹی گلیاں اور پرانی عمارات دیکھ کر سری نگر کی پسماندگی کا اندازہ ہوا۔

ڈل جھیل جو کبھی خوبصورتی کی علامت تھی، وہاں کوڑا کرکٹ اور غلاظت پھیلی دیکھ کر بہت دُکھ ہوا۔ ہوٹل اور گھر نما رہائشی کشتیوں (ہاؤس بوٹ) کی تمام گندگی اور کچرا جھیل میں جاتا ہے جس کے باعث پانی کی سطح پر دور دور تک کائی جمی ہوئی تھی۔ ہم بحیثیت مسلمان صفائی نصف ایمان پر یقین رکھتے ہیں، لیکن وہاں دگرگوں حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔

ڈل جھیل کے سامنے واقع ریاض کبتہ کے گھر ہم کشمیری چائے سے لطف اندوز ہوئے۔ ریاض صاحب وشال کے والد کے دوست تھے اور وشال سے بہت محبّت کرتے تھے ان دنوں اُن کا ایک بیٹا لندن سے سری نگر آیا ہوا تھا دوران گفتگو پتہ چلا کہ وہ پاکستان آنے کیلئے بے تاب تھا بلکہ اُس کی شدید خواہش تھی کہ اس کے والد اُس کی شادی کیلئے دلہن کا انتخاب بھی پاکستان سے کریں ہم چاروں یہ جان کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے اور اُسے اس کی دلہن کے انتخاب میں مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ کشمیری گھروں کے ڈرائنگ روم یعنی بیٹھک میں زمین پر بیٹھنے کا رواج ہے۔ ہر گھر میں قالین اور گاؤ تکیوں کی سجاوٹ دیکھنے کو ملتی ہے۔ صاحب خانہ اپنے گھر کے ساتھ مسجد تعمیر کروا رہے تھے جس کے عطیات وصول کرنے کی خاطر انھوں نے مائیک لگا رکھا تھا۔

گفتگو کے دوران ہی نماز مغرب کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ ہم نے نماز ادا کی۔ نماز سے فراغت کے بعد اُن سے اجازت لے کر باہر نکلے تو ڈل جھیل میں چاند کے عکس نے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور ہم چند لمحے اسی منظر کے سحر میں کھو گئے۔ عید کی وجہ سے دفاتر اور اسکولوں میں چھٹیاں تھیں جس کے باعث علاقے میں ٹریفک کے ساتھ ساتھ لوگوں کا ہجوم بھی تھا۔ لاہور کی طرح وہاں بھی لڑکے موٹر سائیکلوں پر ہلڑبازی کرتے، ون ویلنگ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پولیس کا نام ونشان نہیں تھا۔ ہمارے میزبان بتانے لگے کہ پولیس اگر آ بھی جائے تو کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ کوئی اُس کی نہیں سنتا۔ اگر کبھی پکڑنے کی کوشش بھی کریں تو لڑکے مل کر پولیس پر پتھراؤ کرنے لگتے ہیں۔ کشمیری نوجوان حالات سے تنگ آ چکے ہیں آگے بڑھنے اور ترقی کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں بھارتی حکومت کی پالیسی کی وجہ سے سری نگر اور آس پاس کے علاقوں میں کارخانے یا صنعتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پڑھے لکھے افراد خصوصاً کشمیری مسلمانوں کو بھارت کے دوسرے شہروں میں ملازمتیں نہیں دی جاتیں اور انہیں شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لہٰذا زیادہ تر نوجوان غیر تعمیری سرگرمیوں میں صرف کرتے ہیں اور فرسٹریشن کا شکار نظر آتے ہیں آئے روز کسی نہ کسی ایشو کی وجہ سے سری نگر سمیت اہم شہروں میں حالات کشیدہ ہونے کی وجہ سے کرفیو لگا دیا جاتا ہے یا کشمیری رہنماؤں کی کال پر ہڑتال ہو جاتی ہے۔

رات کا کھانا ہم نے ایک ریستوران میں کھایا۔ پھر تاج ہوٹل جا کر قہوہ پیا اور بلندی سے ڈل جھیل کا نظارہ کرتے رہے۔ دن بھر کی سیاحت سے کافی تکان ہو گئی تھی لہٰذا ہوٹل پہنچ کر آرام کرنے کا سوچا کیونکہ اگلے روز گلمرگ کا پروگرام تھا۔

درگاہ حضرت بل سری نگر

ہیں۔شہر کے اطراف میں جنگل، جھیلیں اور سرسبز میدان واقع ہیں۔اپنی قدرتی خوبصورتی کے باعث شہر ''مشرق کا وینس'' کہلاتا ہے۔مغل بادشاہوں کو یہ شہر بہت پسند تھا۔ وہ اکثر موسم گرما یہاں گزارا کرتے۔ چناں چہ انھوں نے سری نگر خصوصاً ڈل جھیل کے کناروں پر دیدہ زیب باغات تعمیر کرائے۔ ان میں چشمہ شاہی، پری محل، نشاط باغ، شالامار باغ اور نسیم باغ نمایاں ہیں۔

سری نگر ۲۹۴ مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ آبادی قریباً پونے تیرہ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ وادی کے تمام علاقوں کی طرح سری نگر میں بھی اردو وسیع پیمانے پر بولی جاتی ہے۔ یاد رہے، اردو ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان بھی ہے۔ماضی کی تاریخ سے ہمارا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب گاڑی ہوٹل براڈ وے پہنچ کر رکی۔ہوٹل براڈ وے سری نگر کا پرانا اور مشہور ہوٹل ہے اپنی لوکیشن اور خوبصورتی کی وجہ سے سیاحوں کیلئے کشش رکھتا ہے یہ سری نگر کا واحد ہوٹل ہے جہاں غیر ملکیوں اور غیر مسلموں کو آسانی سے شراب دستیاب ہوتی ہے ورنہ پورے کشمیر میں کھلے عام شراب کی فروخت پر پابندی ہے۔

ہوٹل پہنچنے پر ہم نے اپنے میزبان وشال ملہوترا کو منتظر پایا۔ معلوم ہوا انھوں نے ہمارے لیے تین دن کی سیر وتفریح کا ایسا پروگرام ترتیب دیا ہے کہ سری نگر کی کوئی مشہور جگہ ایسی نہ ہو جس کی سیاحت اور مناظر سے ہم لطف اندوز ہوئے بغیر واپس چلے جائیں۔

دوپہر کا کھانا ہم نے ہوٹل ہی میں کھایا اور کشمیری کھانے کو ترجیح دی۔ مشہور کشمیری کھانا ''گشتابہ'' کھا کر واقعی مزا آ گیا۔ گشتابہ دیکھنے میں تو کوفتے کی طرح کا سالن ہے لیکن اس کو بنانے کی ترکیب بالکل مختلف ہے۔ یہ ٹماٹر کے مسالے کے علاوہ دہی میں بھی بنتا ہے۔ عموماً شادیوں اور اہم تقریبات میں پکایا جاتا ہے۔

آنے کا مقصد، قیام کا ایڈریس، میزبانوں کی معلومات اور پاکستان میں ہمارے کوائف درج کرنا تھے۔ کچھ وقت تو لگا لیکن بھارت کیلئے سری نگر اور کشمیر کی حساس نوعیت کی وجہ سے حیرت نہ ہوئی کہ غیر معمولی حالات غیر معمولی اقدامات کا تقاضا کرتے ہیں ہم بھارتی حکومت کا انٹرنل سیکورٹی پر توجہ اور اقدامات کا کشمیر کے دورے میں مشاہدہ کرتے رہے اور جب ان کا مقابلہ پاکستان سے کرتے تو معلوم ہوتا کہ ہماری حکومتوں نے وار ان ٹیررازم میں انٹرنل سیکیورٹی پر بالکل توجہ نہیں دی یہی وجہ ہے کہ عوام اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔

باہر ائیر پورٹ پر ہمیں دو گاڑیاں لینے آئی ہوئی تھیں اور گاڑی کا انتظام وشال ملہوترا نے کیا تھا اور دوسرا ہمارے پٹھان کوٹ کے دوست نریش مہاجن نے کیا تھا میں اور میری اہلیہ ایک جیپ میں بیٹھ گئے اور جیسے ہی سری نگر ہوائی اڈے سے باہر نکلے تو ہماری اُمیدوں کے برعکس جنت نظیر کشمیر دھول اور مٹی میں اٹا دیکھ کر ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ لیکن جب وہاں زیادہ گھومنے پھرنے کا موقع ملا تو سری نگر کے قدرتی حسن نے دل موہ لیا۔

تقریباً ۲۰ سال پہلے میں اپنے دو دوستوں کے ہمراہ آزاد کشمیر کی سیاحت کیلئے گیا تھا مظفر آباد سے نیل تک کا

سفر میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا اس دورے کے دوران ہماری ملاقات مقبوضہ کشمیر سے ہجرت کر کے آئے مہاجرین جن میں بزرگ بچے خواتین سب شامل تھے سے بھی ہوئی۔ جنہوں نے ہمیں بھارتی افواج کے مظالم اور رستے کی دشواریوں کا ذکر کر کے ہمیں آبدیدہ کر دیا تھا اسی دورے کے دوران ہمیں کشمیر کی تاریخی اہمیت کا اندازہ ہوا اور معلوم ہوا کہ کیوں کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ کہا جاتا ہے۔ اس دورے کے بعد شدید خواہش رہی کہ اگر موقع ملا تو مقبوضہ کشمیر کا دورہ کر کے وہاں کے حالات جاننے اور اس کی خوبصورتی کا مشاہدہ ضرور کروں گا۔

کشمیر کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ سری نگر دو ہزار سال قبل آباد ہوا۔ بعدازاں اس پر بدھی اور ہندو راجا حکومت کرتے رہے۔ اشوک اعظم کے دور میں یہ شہر خوب پھلا پھولا۔ ۹۶۰ء میں سری نگر جموں و کشمیر کا دارالحکومت قرار پایا۔ اکبر اعظم کے دور میں یہ مغل سلطنت کا حصہ بن گیا۔ ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے یہ شہر گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا۔ اُس نے سری نگر کے علاقے، شیر گڑھی میں اپنا محل بنوایا اور وہاں رہائش اختیار کر لی۔

سری نگر دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر پھیلا ہوا ہے۔ دریا پر بنے نو پل شہر کے مختلف حصوں کو ملاتے

سری نگر کی مشہور روایتی ڈش گشتابہ

نگین جھیل، سری نگر

بچپن سے سنتے آئے تھے کہ اگر روئے زمین پر مثل جنت کوئی مقام دیکھنا ہو تو کشمیر دیکھ لو۔ یہی سوچ دل میں لیے ہم نے امرتسر پہنچ کر سری نگر کی پرواز پکڑی۔ واہگہ، اٹاری پر بھارتی کسٹم حکام نے ہمارے سامان کی اچھی طرح چیکنگ کے بعد ہمیں کلیئر کیا اُن کو معلوم تھا کہ ہم لوگ سری نگر جا رہے ہیں سپائس جیٹ کی پرواز بھارت کے وقت کے مطابق ۱۲ بج کر ۲۰ منٹ پر روانہ ہونا تھی۔ بارڈر ہمارے وقت کے مطابق صبح ۹:۳۰ بجے کھلتا ہے ہم چاروں ایک ہی گاڑی میں صبح ۹ بجے ہی واہگہ بارڈر پہنچ گئے تھے۔ تاکہ کلیئرنس کے بعد ہم بروقت سری گرو رام داس جی انٹرنیشنل ایئرپورٹ امرتسر پہنچ کر فلائیٹ لے لیں وقت کم تھا اور مقابلہ سخت۔۔۔ میں نے اپنی اور اہلیہ کے ساتھ ساتھ شفیق عباسی اور طلعت بھابھی کی نشستیں انٹرنیٹ کے ذریعے بک کروا لیں تھیں تقریباً پچاس منٹ کی اس پرواز کے دوران ہم چار پاکستانیوں کے علاوہ دو میاں بیوی پاکستانی بھی ہماری نشستوں کے قریب بیٹھے تھے۔ تعارف کے بعد پتہ چلا کہ پاکستان کی آٹو انڈسٹری کی بڑی کاروباری شخصیت ہیں اور بھارتی سکھ دوست کے ہمراہ عید کی تعطیلات کے دوران بھارت کی سیر کو جا رہے ہیں۔ وہ سکھ دوست اپنی اہلیہ کے ہمراہ جالندھر سے سری نگر پہنچیں گے وہ بھی ہماری طرح سارک چیمبر آف کامرس کے ممبر تھے اور اکثر ان کا تجارت اور کانفرنس کی غرض سے بھارت کے مختلف شہروں میں جانا ہوتا۔ سری نگر ایئرپورٹ پہنچ کر تمام غیر ملکی مسافروں کو پولیس رپورٹ کروانا لازمی تھا پاکستانی مسافروں کیلئے ایک علیحدہ کاؤنٹر بنایا گیا تھا جس پر لگے بورڈ پر اُردو میں معلومات درج تھیں جبکہ دوسرے ممالک کے مسافروں کیلئے علیحدہ انتظام تھا۔ کاؤنٹر پر موجود پولیس کے اہلکار نے تین صفحات پر مشتمل فارم ہمیں تھما دیا۔ جس میں ہمیں سری نگر

دلچسپ سفر نامہ

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

طیب اعجاز قریشی

چلو مقبوضہ کشمیر چلتے ہیں

- جب پُرجوش و متجسّس پاکستانی سیاح مقبوضہ کشمیر پہنچے تو اس سرسبز و شاداب سرزمین پہ سیاحت کرتے ہوئے بھرپور لطف اٹھایا اور کشمیری تہذیب و معاشرت کی نادر و نایاب جھلکیاں بھی ساتھ سمیٹ لائے
- بھارتی تسلّط کی وجہ سے کشمیری نوجوان فرسٹریشن میں مبتلا ہیں
- کشمیر میں آج تک شیعہ سنی یا ہندو مسلم فسادات نہیں ہوئے
- ہر کشمیری بھارت سے علیحدہ اپنی صدیوں پرانی شناخت قائم رکھنا چاہتا ہے
- شاہ ہمدانؒ کے پیغام اور تربیت کی وجہ سے ہر کشمیری کوئی نہ کوئی ہنر جانتا ہے
- بھارتی حکومت ہندو اکثریتی علاقے جموں اور کھٹوا میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر رہی ہے
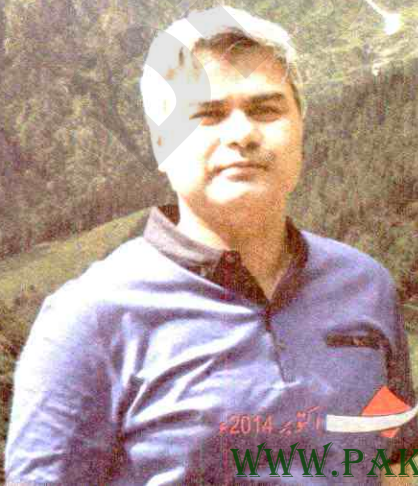
اردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بن کر

560 روپے کی غیر معمولی بچت پائیے ✿ اس قیمت میں خصوصی نمبر بھی حاصل کیجیے

اُردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے
معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھریئے

دِلچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُرلطف بنائیے

قیمت فی پرچہ -/100 روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	1200 روپے	360 روپے	1560 روپے	1000 روپے	560 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام ____________ فون نمبر ____________

پتا ____________ ای میل ____________

میں ماہ ________ 20ء سے اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اُردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔

1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کر دوں گا۔ یا

2۔ میں مطلوبہ رقم -/1000 روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا

3۔ میں نے -/1000 روپے اُردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر 110-800380 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں۔ اور اپنا ایڈریس ای میل کر رہا ہوں۔ یا

4۔ ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکرپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔ یا

5۔ ہمیں 0301-8431886 پر ایس ایم ایس کریں۔ ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔

تاریخ ____________ دستخط ____________

اُردو ڈائجسٹ۔ سرکولیشن منیجر۔ سمن آباد۔ لاہور 54500۔ پاکستان: فون نمبر: 35290738-42-92+ 37589957-42-92+
ای میل: subscription@urdu-digest.com ویب سائٹ: urdudigest.pk فیکس: 35290731-42-92+

پابندیوں کی وجہ سے امریکی، ایران میں سروے نہ کر سکے جہاں حجاب کا استعمال دیگر ممالک سے زیادہ ہے۔ یہ حجاب کی مقبولیت ہی ہے جس نے تجارتی اداروں اور ایڈورٹائزنگ کمپنیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ حجاب کو معاشرے کی دیگر ضرورتوں کی طرح ایک ضرورت سمجھیں اور خواتین کی ضروریات کے مطابق مصنوعات مارکیٹ میں لائیں۔ مثال کے طور پر خشکی دور (اینٹی ڈینڈرف) شیمپو بنانے والی ایک کمپنی کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اسکارف یا برقع پہننے والی خواتین کے لیے خصوصی شیمپو تیار کیا ہے۔ اب تو اشتہارات اور ڈراموں میں بھی خواتین کو حجاب میں پیش کیا جانے لگا ہے۔

میں ذاتی طور پر ایسے کئی خاندانوں کو جانتا ہوں جن میں مائیں اور نانیاں بے حجاب تھیں لیکن ان کی بیٹیاں حجاب یا نقاب کر رہی ہیں اور اس بات کی منتظر ہیں کہ ان کی بڑی بوڑھیاں کب اس طرف آتی ہیں۔

میرا ایک دلچسپ مشاہدہ یہ بھی ہے کہ گزشتہ دس برس میں دو کروڑ کے قریب آبادی والے شہر کراچی میں پردے کا رواج تیزی سے بڑھا ہے۔ پچیس سال قبل میں لاہور منتقل ہوا لیکن سال میں تین چار دورے کراچی کے ضرور ہو جاتے ہیں۔ میرا تاثر ہے کہ کراچی کی خواتین میں پردے کے رجحان میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے۔ وہاں میرے عزیزوں نے بھی اس امر کی تصدیق کی ہے۔ جب میں نے اس نقطۂ نظر سے پبلک ٹرانسپورٹ اور بازاروں وغیرہ کا جائزہ لیا تو بات صحیح لگی۔

کراچی کے ایک علاقے، گلبرگ میں تعلیمی اکیڈمیوں کا بازار سا لگا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف دکانوں کے بجائے اکیڈمیاں سجی ہوئی ہیں۔ شام کے وقت جب تمام اداروں سے طلبہ کی چھٹی ہوئی، تو میں نے دیکھا، لڑکیوں کے گروہ باہر آ رہے تھے۔ تقریباً تمام بچیاں اسکارف یا کم از کم عام دوپٹے سر کے گرد لپیٹے نظر آئیں۔ خال خال بچیاں ننگے سر تھیں۔ میری ایک عزیزہ نے ہمیشہ دوپٹہ لیا لیکن چند سال پہلے ان کی دو غیر شادی شدہ بیٹیوں نے اچانک برقعے پہننا شروع کر دیے۔ میں نے عزیزہ سے پوچھا "یہ کیسے ہوا؟"

ان کا کہنا تھا کہ مجھے تو خود سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ انقلاب کیسے آیا۔ بچیوں سے پوچھا تو وہ صرف مسکرا دیں۔ میرے خالہ زاد بھائی کی نواسی سے میں حال ہی میں ملا، وہ مکمل اسکارف میں تھی، جب کہ بچی کی والدہ اور نانی دونوں دوپٹہ میں۔ میں نے ان کی نانی سے پوچھا تو پتا چلا کہ کسی نے نہیں کہا، بچی نے خود ہی اسکارف لینا شروع کر دیا۔

ایک اور خوش آئند بات یہ کہ ان کے والدین خوش تھے کہ بچیاں حجاب کر رہی ہیں۔ آپ نے اندازہ لگایا کہ ان بچیوں کے دلوں پر کس نے دستک دی؟ ظاہر ہے اللہ نے!

ان شاء اللہ یہ صدی مسلمانوں کے عروج کی ثابت ہو گی۔ مجھے الہام نہیں ہوا، میں ان معلومات کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں جو روزانہ مجھے انٹرنیٹ پر مغربی اور مسلمان میڈیا کے توسط سے حاصل ہو رہی ہیں۔ ہمارے پاس آنے والی بعض پریشان کن خبروں میں ہی یہ امید کی کرنیں بھی چھپی ہیں۔ ان شاء اللہ ہم نہیں تو ہماری اگلی نسل یا اس سے اگلی نسل ضرور مسلم دنیا ہی نہیں بلکہ یورپ امریکا تک اسلام کا جھنڈا لہراتا دیکھے گی۔ ♦♦♦

تراکیب جیسے موضوع شامل ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی مغربی آزادیِ نسواں کی علمبردار خواتین کے مضامین بھی چھپتے ہیں۔ لیکن رسالے کی سب سے دلچسپ انفرادیت یہ ہے کہ اس میں مسلم خواتین کے لیے اسکارف و نقاب اور دیگر لباس کے رنگ برنگ فیشن پیش کیے جاتے ہیں۔ مثلاً مراکشی کفتان، گلف کی عبائیں، سعودی برقع اور دیگر مسلم ممالک کی خواتین کے لباس۔ اس کے علاوہ حجاب کے بے شمار فیشن رسالے میں شائع ہوتے ہیں۔ حجاب کے سلسلے میں یہ اہم پیش رفت ہے۔

'ہفتہ حجاب' ہر سال یورپ میں منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر ہونے والے فیشن شوز میں دنیا بھر سے مرد و خواتین فیشن ڈیزائنر شریک ہوتے اور حجاب و اسی قسم کے دیگر ملبوسات کے نئے نمونے پیش کرتے ہیں۔ پیش نظر یہ بھی ہوتا ہے کہ مغربی دنیا میں موجود حجاب سے متعلّق منفی تاثر ختم کیا جائے...... مغرب حجاب کو عورت کا استحصال سمجھتا ہے۔

یہ صورت حال کیا ظاہر کرتی ہے؟ یہ کہ حجاب ایک مفید چیز ہے؟ اور کیا تمام مسلمان خواتین خوش ہیں کہ انھیں معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام مل گیا؟ کئی مصری خواتین سماجی دباؤ کی بات کرتی ہیں جس میں اپنے خاندان، محلّہ، پڑوس یا دفاتر کے لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے انھیں پردہ کرنا پڑتا ہے۔ بہت سے مرد اس شرط پر شادی کرتے ہیں کہ عورت کو پردہ کرنا ہو گا۔ کئی مذہبی گھرانوں میں بیٹیاں پردہ کرنے پر مجبور ہوتی ہیں کیونکہ ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا۔ اس مکالمے پر ایال ساگل کا مذکورہ مضمون اپنے اختتام کو پہنچا۔

......☆......

اس موضوع پر میں اپنے چند مشاہدات بھی قارئین کی نذر کرنا چاہوں گا۔ انٹرنیٹ کی وجہ سے ''دنیا گلوبل ویلیج'' بن چکی۔ آج دنیا بھر میں ہونے والی تبدیلیوں کی خبریں ہمیں لیپ ٹاپ یا اسمارٹ فون پر لمحہ بہ لمحہ ملتی ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان نوجوانوں میں ڈاڑھی رکھنے اور مسلم خواتین میں کسی نہ کسی شکل میں پردے کرنے کا رواج بڑھ رہا ہے۔

حال ہی میں امریکا کے پیو (PEW) ریسرچ سینٹر نے ایک رپورٹ شائع کی۔ اس میں بتایا گیا کہ تیونس، مصر، ترکی، عراق، لبنان، پاکستان اور سعودی عرب میں مجموعی طور پر ۴ فیصد خواتین سر ڈھانپنا پسند نہیں کرتیں، ۱۲ فیصد دوپٹہ یا چادر لیتی جب کہ ۹۰ فیصد اسکارف یا نقاب پہنتی ہیں۔ پاکستان میں جہاں ہم پریشان رہتے ہیں کہ معاشرہ بگڑتا جا رہا ہے، وہاں صرف ۲ فی صد خواتین سر ڈھانپنا پسند نہیں کرتیں، ۵ فیصد دوپٹہ لیتی جب کہ ۹۰ فیصد کی اکثریت کسی نہ کسی شکل میں حجاب کرتی ہے۔ تحقیق میں حسب ذیل تفصیلی نقشہ پیش کیا گیا:

ملک	اسکارف یا نقاب (%)	دوپٹہ میں (%)	ننگے سر (%)
تیونس	62	23	15
مصر	83	13	4
ترکی	51	17	32
عراق	87	10	3
لبنان	39	12	49
پاکستان	90	8	2
سعودی عرب	92	5	3
تمام ممالک کا اوسط (Mediam)	84	12	4

رہی ہیں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں کیونکہ پورے عرب معاشرے خصوصاً مصر میں مذہب مضبوط تر رہا ہے۔ وقتاً فوقتاً قاہرہ کا سفر کرنے والا ہر سیاح مصری خواتین کے لباس، عادات، حجاب اور نقاب میں آنے والی تبدیلیوں کا بآسانی مشاہدہ کرسکتا ہے۔ ان غیر مسلم سیاحوں کی طرح جو عرب ممالک آتے جاتے رہتے اور وہاں رہائش نہیں رکھتے، مجھے بھی یہ سب دیکھ کر رنج ہوا۔

میری نظر میں مذہب پر اس طرح عمل درآمد عورت کو زمانہ قدیم کے قبائلی نظام کی طرف لے جانا ہے، جہاں عورت کے لیے سختی ہی ہے۔

اپریل ۲۰۱۴ء میں اسرائیلی اخبار، ہارٹز(Haartez) کے نیٹ ایڈیشن پر یہودی صحافی ایال ساگل بزوی (Eyal Sagul Bizawe) کا ''مصر میں حجاب فیشن'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا۔ اس مضمون میں مصنف نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے مصر اور عمومی طور پر مغرب میں پردے کے بڑھتے رجحان کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی کے بعض حصوں کا ترجمہ پیش ہے۔

میرے نزدیک حجاب مصری عورت کی کمتری اور اس کے استحصال ومحکومی کی علامت تھا۔ لیکن میں نے بعض ایسی باتیں بھی نوٹ کیں جو میری اس سوچ سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ مثلاً میں نے دیکھا کہ ایک بڑا فیشن اسٹور، المتاحجیبہ مختلف رنگوں اور ڈیزائن کے برقعوں اور اسکارف سے بھرا ہوا تھا۔ ساتھ ہی شفاف کپڑے سے بنے حجاب اور نائیٹ گاؤن بھی موجود تھے۔

میں نے سوچا کہ ان کا مصر میں کیا کام؟ پھر خیال آیا، اپنے بیڈ روم میں شوہر کے سامنے بیوی ایسے لباس پہن سکتی ہے۔ اس کے باوجود مصری معاشرے میں عورت ترجیح دیتی ہے کہ عوامی مقامات پر اپنے کو چھپائے تاکہ دیکھی نہ جاسکے۔ ایسی لڑکیاں بھی نظر آئیں جنھوں نے سر ڈھانپ رکھتے تھے لیکن وہ دریائے نیل کے ساحل پر لڑکوں کے ساتھ سیر کررہی تھیں۔

دفاتر وغیرہ میں ایسی خواتین نظر آئیں جو پورے میک اپ، جینز، ہائی ہیل کے ساتھ حجاب میں تھیں۔ میں نے گلیوں میں ایسے مناظر بھی دیکھے کہ ماں کا سر اور بال دونوں کھلے ہیں لیکن بیٹی نے پردہ کیا ہوا ہے۔ شبینہ (نائٹ) کلب تک میں بہت سی خواتین اسکارف میں دیکھیں۔

قاہرہ کے اس دورے میں مجھے ایسی خواتین بھی حجاب میں ملبوس ملیں جو پہلے آزادی نسواں کی علمبردار تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کئی خواتین کے لیے اب حجاب مذہبی تقاضا ہی نہیں بلکہ ان کی علیحدہ شناخت کا ذریعہ بن چکا۔ اب ان کے لیے یہ شناخت دراصل مغربی تہذیب سے خود کو علیحدہ رکھنے کا نام ہے، بالفاظ دیگر وہ مغرب کی عورت سے کہہ رہی ہیں ''تم اپنے جسم کی نمائش کرنا چاہتی ہو جب کہ ہم اسے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ تمھارا فیشن امریکا مغربی تہذیب کے لیے وقف ہے جب کہ ہمارا اسلام کو۔'' اس سے بڑھ کر یہ کہ اب بہت سی خواتین نے حجاب کو اسلامی آزادی نسواں بنا دیا ہے جو ان کے لیے اختیارات اور طاقت کا ایک ذریعہ بن چکا۔

۲۰۰۴ء سے مسلم خواتین کے لیے ایک رسالہ ''حجاب فیشن'' شائع ہو رہا ہے۔ یہ رسالہ برطانیہ سے شائع ہوکر پوری عرب دنیا میں فروخت ہوتا ہے۔ دنیا کے دیگر خواتین میگزین کی طرح حجاب فیشن میں بھی خاندان، رشتوں، صحت، بیوٹی کیئر اور کھانا پکا...

عالم اسلام میں خواتین کے مابین

حجاب
کی بڑھتی مقبولیت

شرم وحیا اور پاک بازی کی یہ مقدس علامت
عورت کے لیے ڈھال ہے اور سایہ عاطفت بھی

ایال ساگل/انیس احمد خان

دس سال بعد قاہرہ کا یہ میرا دوسرا دورہ ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے، شور میں ڈوبی گلیاں، اندرون شہر یورپی طرز تعمیر پر بنی بستیاں، پُرہجوم مارکیٹیں، بہترین فٹ پاتھ، مساجد، قبطی گرجے، ریستوران اور چائے خانے اس وقت قاہرہ کی شناخت تھے۔ سب کچھ ویسا ہی تھا لیکن ایک تبدیلی اتنی واضح تھی جس سے میں صرف نظر نہ کر سکا۔

۱۹۸۰ء میں اندرونِ شہر خواتین حجاب اور مختصر آستین دونوں کے ساتھ نظر آتی تھیں۔ ۱۹۹۰ء کے بعد آستنیں دراز ہوگئیں اور حجاب کی بہتات نظر آئی جواب وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اکثر مصری خواتین حجاب کے روایتی طریقہ سے سر ڈھانپ

کسی نے ہمارے ہاتھ میں منیٰ کا نقشہ تھما دیا جس میں تمام سڑکیں، پل اور کیمپ دیے ہوئے تھے۔ یہ نقشہ ہمیں جلد ہی ازبر ہو گیا۔ پھر منیٰ کی سڑکیں ہمارے لیے یوں ہو گئیں جیسے اپنے ہاتھ کی لکیریں۔ تب ہم مختلف شاہراہوں پر چلتے ہوئے اللہ کی عبادت میں مصروف لوگوں کا نظارہ کرتے۔ کئی لوگ ملتے جو راستہ بھول کر کہیں کے کہیں نکلے ہوتے۔ ہم انھیں ان کے کیمپ پہنچا آتے۔ ایک دفعہ ایک ہم وطن نوجوان ملا۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا:

''یار میں صبح سے چل چل کر سو ریال کا تو پانی ہی پی گیا ہوں لیکن کیمپ ہے کہ ملتا ہی نہیں۔''

ایک دفعہ بنگلہ دیش کے دو بوڑھے ملے۔ انھوں نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بتایا کہ صبح رمی کے لیے گئے تھے۔ جب سے اپنا کیمپ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں لیکن ملتا نہیں۔ (جب وہ مجھے ملے غالباً عصر کا وقت تھا) میں نے ان سے کیمپ کا نمبر پوچھا تو ان کی اردو ختم ہو گئی۔ ایک بوڑھے نے مایوسی میں اوشٹو دش کہا۔ اور ہم سمجھ گئے۔

ہم نے انگلیوں پر گن کر ان سے تصدیق چاہی کہ ان کے کیمپ کا نمبر اٹھارہ ہی ہے نا؟ ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی، امید کی ایک کرن جاگ اُٹھی۔ وہ اپنے کیمپ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ ہم نے انھیں پتا سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ التجا کرنے لگے کہ ہم انھیں چھوڑ آئیں۔ ہم تو تھے ہی اسی مشن پر! انھیں ساتھ لیا اور تھوڑی دیر میں مطلوبہ کیمپ کے سامنے لا کھڑا کیا۔

ایک بوڑھے نے دائیں بائیں دیکھا اور بولا ''اس سڑک پر سے تو ہم کئی دفعہ گزرے ہیں۔ یہ تو نا ہی ہے اوشٹو دش۔'' ہم نے دروازے کی پیشانی پر لگا ہوا بینر پڑھا۔ اس پر معلّم کا نام اور کیمپ نمبر اٹھارہ ہی لکھا تھا۔ ہم نے بینر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہی ہے اوشٹو دش۔ دوسرا بوڑھا بڑا ملنسار اور ہنس مکھ تھا۔ وہ راستے میں بھی ہم سے اٹکھیلیاں کرتا آیا تھا۔

اس نے ہم سے کہا ''پوری دوپہر سورج اس بڈھے کے سر پر چمکتا رہا ہے۔ لگتا ہے اس کا دماغ چل چکا۔'' اس نے ہاتھ سے دماغ چلنے کا اشارہ بھی کیا۔ ہم نے اجازت چاہی اور پھر بھیڑ میں گم ہو گئے۔

میدان عرفات

رہی یہ بات کہ ہمیں اوشٹو دش کا مطلب کیسے پتا چلا تو بات یہ ہے کہ ہمیں بنگالی زبان میں صرف ایک فقرہ اور گنتی کا ایک لفظ آتا ہے۔ فقرہ ہے، آمی تمار جنو بوت ای چنتی تو (ہم تمہارے بغیر بہت اُداس رہے) اور گنتی میں صرف ایک لفظ ''اوشٹو دش''۔ مشرقی پاکستان کی جدائی سے پہلے کی بات ہے۔ لاہور میں طلبہ کی ایک تنظیم کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس میں بار بار اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی میں ''اوشٹو دش پر شاکھ شومے لون'' کا اعلان ہوتا رہا۔ برسوں پہلے سیکھا ہوا لفظ شاید آج ہی کے لیے یاد رہ گیا تھا۔

کرنل (ر) اشفاق حسین ممتاز ادیب ہیں۔ یہ سفرنامہ آپ کی تخلیق ''جنٹل مین اللہ اللہ'' سے بصد شکریہ لیا گیا۔ یہ سفرنامہ ادارہ مطبوعات سلیمانی، لاہور نے شائع کیا۔ ہم پر ناشر کا شکریہ واجب ہے۔

بندہ خانہ کعبہ کے بالکل قریب طواف کر رہا ہو تو بھول بھی جائے تو نئے سرے سے شروع کر سکتا ہے۔

لیکن ایک تو یوم عید جو حاجیوں پر ویسے ہی بڑا بھاری گزرتا ہے...... منہ اندھیرے مزدلفہ سے چلنا' منیٰ پہنچ کر رمی کرنا' قربانی دینا' طواف وداع کے لیے مکہ آنا اور پھر پہلی منزل پر طواف! اچھا بھلا نوجوان صحت مند' توانا آدمی تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ اللہ میاں ''اسپیشل'' توانائی عطا فرماتے ہیں اس دن' قوت و ہمت کا خاص کوٹہ!

خالی ہاتھ کوئی نہیں لوٹتا

دس ذوالحج کے بعد حاجیوں کو کم از کم دو روز منیٰ میں رکنا ہوتا ہے۔ کوئی چاہے تو تیسرے روز بھی رک سکتا ہے۔ حکم یہ ہے کہ ان دنوں میں اپنے رب کو خوب یاد کرو۔ اسلام سے پہلے یہاں مختلف قبیلوں کی منڈلیاں جمتی تھیں جس میں اپنے اپنے قبیلے کے آبا و اجداد کے کارنامے خوب بڑھا چڑھا کر پیش ہوتے۔ ان کی شان میں قصیدے کہے جاتے' زوردار تقریریں ہوتیں اور سارا زورِ بیان اسی میں صرف ہو جاتا کہ انہی کا قبیلہ سب سے برتر' شجیع' افضل ترین تھا۔

اب رب کے ذکر کی محفلیں جمتی ہیں۔ اس کی تسبیح بیان ہوتی ہے۔ اسی کی بڑائی اور عظمت کے گن گائے جاتے ہیں یا اس کے حبیب ﷺ پر درود و صلوٰۃ کی محفلیں برپا ہوتی ہیں۔ نفل گزارے جاتے ہیں' راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر' پچھلے پہر۔ جو لوگ کچھ نہ کر سکیں' کچھ نہ پڑھ سکیں' بس نیت رکھیں' خلوص کے ساتھ' خالی ہاتھ وہ بھی نہیں لوٹائے جاتے۔

لیفٹیننٹ کرنل منصور رشید نے یہ واقعہ سنایا۔ ان کے کیمپ میں لوگ حسب توفیق عبادت میں مصروف تھے۔ کوئی نماز پڑھ رہا تھا' کوئی قرآن اور کوئی تسبیح پھیر رہا تھا۔ سامنے والے خیمے میں ایک بڑھیا بالکل بے علم دکھائی پڑتی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی ایک سمت تکتی' کبھی دوسری سمت' آخر گھبرا کر اس نے اپنے میاں کو جھنجھوڑا جو بے سدھ ہو کر سویا پڑا تھا۔

''ارے اُٹھ' دیکھ وقت نکلا جا رہا ہے۔''

بڑے میاں ہڑبڑا کر اٹھے۔ پوچھا ''کیا بات ہے؟''

بڑھیا پھر بولی ''دیکھ پوری دنیا عبادت میں مصروف ہے۔ ہر کوئی کچھ نہ کچھ پڑھ رہا ہے۔ ہمیں تو کچھ پڑھنا بھی نہیں آتا۔ ہمارا کیا بنے گا؟''

بڑھیا کی آواز میں اتنا درد' سوز' اتنی فکر تھی کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بوڑھے نے اطمینان سے جواب دیا:

''فکر کیوں کرے ہے' جس نے بلایا وہی ہمارا بھی مالک ہے۔ خالی ہاتھ تھوڑا ہی بھیج دے گا۔''

اس کا ایمان' یقین اور اطمینان سننے والوں کو سرشار کر گیا۔

مکہ کی گلیوں میں

ہم سے کیمپ میں بیٹھا نہ جاتا۔ اللہ میاں کی وہ بستی جو اس نے دو تین دنوں کے لیے بسائی تھی' ہمیں پکارتی اور تھکن کے باوجود ہم اُٹھ کھڑے ہو جاتے۔ رمی کے بعد تو یہ حالت ہوتی جیسے ٹانگوں میں جان ہی نہیں لیکن ہم شوق میں چل نکلتے۔ شروع شروع میں پاؤں دکھتے' ٹانگیں درد کرتیں پھر ایک مرحلہ ایسا آ جاتا کہ درد' تھکن' تکلیف سب رفع ہو جاتی۔ ہم روبوٹ کی طرح چلتے رہتے' چلتے رہتے ٹانگیں سن ہو جاتیں' احتجاج کے حق سے دستبردار۔

"میں تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔" ہم نے وضاحت کی۔

"مجھے نہیں ضرورت تمہاری مدد کی۔" اس نے بھی وضاحت فرمائی اور وضو کرنے لگا۔ پاکستانی کھڑا پیچ و تاب کھاتا رہا لیکن ہمارے اشارے پر خاموش کھڑا رہا۔

میدان عرفات میں

عرفات کا میدان خوب بھرا ہوا تھا جس طرف نگاہ اٹھتی سفید احرام میں ملبوس انسان دکھائی دیتے۔ بوڑھے بچے، جوان، نوجوان لڑکیاں، خواتین، ہر ملک کے لوگ، ہر قوم کے افراد۔ مصری، ترکی اور ایرانی بڑے بڑے قافلوں کی صورت میں آتے اور دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ منظم ہوتے ہیں۔ مصریوں کا ایک کیمپ دیکھا۔ کافی بڑا تھا۔ ڈھائی تین ہزار کا مجمع تو ہوگا۔ اسٹیج پر ایک نوجوان قبلہ رخ ہو کر ہاتھ اُٹھائے بڑے خشوع و خضوع سے دعائیں مانگ رہا تھا۔ پورا مجمع اس کے ساتھ ساتھ دعائیں دہرا رہا تھا۔ گونج تھی، جیسے عرش ہل رہا ہو:

"ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخسرین۔"

ہم ان کے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اُٹھا لیے "اللہ! جو کچھ یہ مانگ رہے ہیں، مجھے بھی ان میں شریک رکھ۔ جو کچھ انھیں عطا ہونا ہے، مجھے بھی عطا ہو۔ مجھے تو مانگنا بھی نہیں آتا۔ دعاؤں کے آداب تک سے واقف نہیں۔ تو رحیم ہے، تو عظیم ہے۔ ان کی دعاؤں میں، میری شمولیت ہی کو قبولیت عطا ہو۔"

افریقا کے لوگ جتنے سیاہ ہیں، اتنے ہی بھڑکیلے، شوخ، تیز رنگ کپڑے پہنتے ہیں۔ یوں کہہ لیں کہ پورے ماحول کو رنگ دیتے ہیں۔ رنگوں کے یہ دھارے آج ہر طرف بہ رہے تھے، منیٰ سے مکہ تک! طواف وداع بھی آج ہی کرنا تھا۔ رمی کر کے لوگ مکہ کی طرف جا رہے تھے۔

خانہ کعبہ کے چکر

بیت اللہ کا طواف کرنے اپنے ساتھی، اختر کے ساتھ ہم ایک ویگن میں مکہ پہنچے تو دیکھا منیٰ کی رونق خانہ کعبہ میں سمٹ آئی تھی۔ پہلے طواف کے وقت بیت اللہ کا غالب منظر بلیک اینڈ وہائٹ تھا۔ بیچ میں سیاہ غلاف میں ملبوس خانہ کعبہ اور اردگرد سپیدیوں کے دھارے اور نور کی گردش! آج سارا منظر ٹیکنی کلر ہو گیا تھا۔ جیسے شادی کے موقع پر دلہن کے اردگرد زرق برق کپڑوں میں ملبوس سہیلیوں کا جھرمٹ۔ نچلے والے فرش پر تو قدم رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ پہلی منزل پر پہنچے۔ طواف کا پہلا چکر ہی اتنا طویل لگا جیسے میلوں کی مسافت طے کی ہو۔ ہم نے ہنستے ہوئے اختر کو خبردار کیا کہ چکروں کا حساب رکھنا، اگر بھول گئے تو حکم یہ ہے کہ پھر سے شروع کرو۔ اختر چلتے چلتے کھڑا ہو گیا "کیا؟"

"جی ہاں، حکم یہی ہے کہ بھول جاؤ تو نئے سرے سے شروع کرو۔"

منیٰ کا ایک خوبصورت منظر

شروع کر دی۔ سورہ فاتحہ کے بعد اس نے سورہ اخلاص یعنی قل ھواللہ پڑھی اور پھر "اللہ اچبر" کہتے ہوئے رکوع میں چلا گیا۔ اس کے ہر اللہ اچبر پر ہمارا دھیان بٹتا لیکن وہ تھا کہ دھڑا دھڑ نفل پہ نفل پڑھے جا رہا تھا۔ چونکہ سرگوشی سے ذرا بلند آواز میں تلاوت کرتا تھا اس لیے یہ بھی پتا چلا کہ وہ ہر رکعت میں صرف سورہ اخلاص ہی پڑھ رہا تھا۔

اب معلوم نہیں کہ کوئی منت مان کر آیا تھا کہ اس نے سورہ اخلاص کے ساتھ اتنے نوافل پڑھنے ہیں۔ یا نبی رحمتؐ کا یہ فرمان اس کے پیش نظر تھا کہ سورہ اخلاص سے محبت اس کے پڑھنے والے کو جنت کا مستحق بنا دیتی ہے یا اسے بس یاد ہی ایک سورت تھی۔ دوسرے وہ اللہ اکبر کو اللہ اچبر کیوں کہہ رہا تھا۔ ہماری صحافیانہ حس نے ہمیں انٹرویو پر اُکسایا' لیکن وہ اردگرد سے بے نیاز اللہ سے راز و نیاز میں مصروف تھا۔

یہ واقعہ حافظ ادریس نے سنایا کہ لاہور کا ایک سر پھرا باب ملتزم سے لپٹا دعا کر رہا تھا: "اللہ میاں! ہے تو تیرا گھر' ہم کچھ کہہ تو نہیں سکتے پر تو جانتا ہے کہ لاہور لاہور ہے۔ بس واپسی کی ٹکٹ کا بندوبست کر دے۔" جانے بچارہ کب سے واپسی کی ٹکٹ کے لیے دھکے کھا رہا تھا۔

ایک اور بدو کا قصہ سناتے ہیں کہ وہ خانہ کعبہ سے لپٹتا رو رو کر پکارتا تھا: "یا اللہ! گنا' یا اللہ! گنا۔"

حافظ ادریس کافی دیر تو حیران ہوتے رہے کہ خانہ کعبہ میں یہ شخص محض گنے مانگنے آیا ہے۔ پھر یاد آیا کہ مصری مقامی بولی میں جیم کو گاف بولتے ہیں۔ اپنے جمال عبدالناصر کو بھی گمال عبدالناصر کہتے تھے تو وہ اللہ میاں سے جنہ طلب کر رہا تھا جو اس کی زبان میں گنا ہی تھی۔

خانہ کعبہ میں جہاں اپنے آپ سے بے خبر عبادت کی دھن میں ڈوبے لوگ نظر آتے ہیں' ایسے بھی دکھائی پڑتے ہیں جو اپنی انا کا لبادہ لپیٹے رہتے ہیں اور اس کے دربار میں بھی خود سے جدا نہیں کرتے۔ ایک دفعہ وضو خانوں میں گئے۔ ان دنوں وہاں ایسے نلکے لگے تھے جن سے پانی حاصل کرنے کے لیے دبانا پڑتا تھا۔ حج کا موقع تھا۔ بہت ہجوم تھا۔ ہم نے نلکا دبانے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو عربی لباس میں ملبوس ایک شخص نے ہمیں دھکا دے کر پرے کیا اور خود نلکے پر جھک گیا۔ ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے یہ کیا ہوا کہ قریب کھڑے ایک صحت مند پاکستانی نے اسے کندھے سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "سر! تسی وضو کرو۔"

اس نے ہمیں سر کہہ کر مخاطب کیا۔ شاید ہماری یونٹ کا کوئی فرد تھا یا بس ایک پاکستانی جو اپنے ہم وطن کی مدد کے لیے عین خانہ کعبہ میں مرنے مارنے پر اتر آیا تھا۔ عرب نے سنبھلتے ہی مغلّظات بکنا شروع کر دیں۔ وہ پاکستانی کو پیچھے دھکیلنے لگا تھا کہ اُس نے بھی آنکھیں نکالتے ہوئے خالص پنجابی میں جوابی کارروائی شروع کر دی۔ "او تیری میں......" ہم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے خاموش رہنے کی تلقین کی۔

"سر! آپ نہیں سمجھتے انھیں' یہ اپنے آپ کو پھنے خان سمجھتے ہیں۔ خانہ کعبہ ان کے باپ کا ہے؟ میں نکالتا ہوں ابھی اس کے کس بل۔"

میں نے پھر اسے سمجھایا "احرام کی حالت میں لڑائی جھگڑا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اگر یہ جہالت پر اترا ہوا ہے تو ہمیں اپنے اعمال ضائع نہیں کرنے چاہئیں۔"

"سر! لیکن وضو پہلے آپ کریں۔" غیرت کے ہاتھوں مجبور پاکستانی نے پھر اس عرب کو پیچھے کھینچا جو ہماری گفتگو کے دوران نلکے پر حاوی ہو چکا تھا۔ اسے سمجھایا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم نے عرب کو وضو کرنے کا اشارہ کیا اور مدد کے لیے نلکا دبانے کو ہاتھ آگے بڑھائے۔ اس نے ہمارے ہاتھ جھٹک دیے۔

تپش تو محسوس کریں جہاں سیدنا بلالؓ کو محض اس جرم میں سزا دی جاتی تھی کہ وہ ایک خدا کو کیوں مانتے ہیں۔ سیڑھیوں سے سڑک پر قدم رکھا تو یوں لگا جلتے توے پر پاؤں رکھ دیا۔ فوراً دوسرا قدم زمین پر رکھتے ہوئے پہلا اٹھا لیا۔ یہ محض اضطراری کیفیت تھی۔ ورنہ دوسرا قدم کسی چمن کی روش پر تھوڑا ہی پڑنا تھا' یوں سمجھو دہکتے کوئلوں پر قدم رکھتے تیز تیز چلتے جا رہے تھے۔

سیدنا بلالؓ اور حضرت خبابؓ بن الارث یاد آتے رہے۔ ان کی یاد میں ہم نے بھی احد احد کرنے کی کوشش کی لیکن زبان سے اف اف نکلتا۔ باب عبدالعزیز سامنے ہی تھا لیکن نگاہیں نیچی کیے چلتے رہے کہ نظر اُٹھانے پر وہ دور لگتا۔ چند منٹوں کا وہ فاصلہ جانے کیسے طے کیا اور سیدنا بلالؓ کی استقامت کو خراج تحسین پیش کرتے مسجد میں داخل ہوئے۔ تکبیر ہو چکی تھی۔ ہمارے برآمدے میں داخل ہوتے ہی اللہ اکبر کہا گیا۔ قریبی صف میں جہاں جگہ ملی' وہیں کھڑے ہو کر نیت باندھ لی۔

اللہ اکبر کہا تو سیدنا بلالؓ کی یاد ساتھ تھی۔ واقعی اللہ بہت بڑا ہے کہ اپنے کیسے کیسے شیدائی پیدا کیے کہ وہ اتنے دکھ اُٹھانے کے باوجود بھی اس کی توحید کا اعلان کرتے رہے۔ ہم فرش پر کھڑے تھے اور تپش محسوس ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ پاؤں بدلی کرتے رہیں لیکن نماز کے احترام میں ضبط کیے کھڑے رہے۔ اچانک کسی نے ہمیں نرمی سے کھینچ کر بائیں طرف کر لیا' ہم ننگے فرش سے قالین پر آ گئے۔ یوں لگا جیسے نرم نرم روئیں پاؤں سے لپٹ کر اسے سہلا رہے ہوں۔ سورہ فاتحہ میں رب العلمین...... الرحمٰن الرحیم۔ پڑھتے ہوئے اس سے پہلے شاید اتنا لطف کبھی نہ آیا تھا۔

چھوٹی چھوٹی آیتیں مکے اور مدینے کی گلیوں میں چلتے ہوئے نئے معانی سے آشنا کرتی ہیں بشرطیکہ انسان نے تھوڑی بہت عربی سیکھ رکھی ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان اساتذہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے کہ جن کی بے لوث کوششوں کے نتیجے میں ہم نے عربی سیکھی اور قدم قدم پر ہمارے کام آئی۔

مکہ مکرمہ کے ایک چوک کا منظر

وہ قارئین جو عربی نہ جانتے ہوں' اس نیت سے یہ زبان سیکھنے کا اہتمام کریں کہ ایک تو قرآن فہمی بڑھتی اور روزمرہ زندگی میں قدم قدم پر ربانی ہدایت ملتی رہتی ہے۔ دوسرے کل کلاں' زندگی کے کسی موڑ پر مکے مدینے جانا ہوا تو وہاں کا قیام' قرآن کی تلاوت اور عبادت کے حوالے سے پُرلطف اور دوبالا ہو جائے گا۔

طرح طرح کے لوگ

اللہ کے گھر ہر طرح کے لوگ آتے اور اپنے اپنے ظرف، علم اور سطح کے مطابق بامراد لوٹتے ہیں۔ ایک دفعہ حطیم میں بیٹھے تھے کہ قریب سے آواز آئی ''اللہ اچبر''۔ دیکھا کہ ادھیڑ عمر کا ایک ترک نفل کی نیت کیے نماز پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے قدرے بلند آواز سے تلاوت

پسند ہیں' خوش اخلاق۔"

"کسے بتا رہے ہو؟"

"اوہ معاف کیجیے' بات یہ ہے کہ ان کے پاس آپ کا دیا سب کچھ ہے' ایک اولاد کی نعمت سے محروم ہیں......"

"وہ خود کیوں نہیں آئے؟"

"ہم سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔" شاید...... شاید کوئی مجبوری ہو۔"

"کیا مجبوری ہے؟"

ہمارے علم میں تو واقعی انھیں کوئی مجبوری نہیں تھی' کیا وکالت کرتے؟ جب ان کے بارے میں گفتگو شروع کی' اٹکاؤ محسوس ہوا' جیسے موسم کی خرابی سے تصویر دھندلا جائے' آواز غائب ہو جائے۔ پاکستان واپس آ کر انھیں اشاروں کنایوں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ حج کے لیے چلے جائیں۔

آیات قرآنی کے مطالب

اللہ میاں کے ساتھ "ہاٹ لائن" پر تو کسی بھی وقت بات کی جا سکتی ہے (اجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔ البقرہ ۱۸۶) لیکن اس کے گھر بیٹھ کر بات کرنے کا لطف ہی اور ہے۔ پھر اس کے کلام کو وہاں بیٹھ کر پڑھا جائے تو معانی اور واضح' مفہوم اور بہتر طریقے سے سمجھ میں آتا ہے۔ کچھ آیتیں تو ہیں ہی ایسی کہ ان کا پورا اور صحیح مفہوم ادا ہی تب ہوتا ہے جب انہیں مکے یا خانہ کعبہ کے عین بیچ بیٹھ کر پڑھا جائے جیسے

فلیعبدوا رب ھذا البیت الذی اطعمھم من جوع و آمنھم من خوف (قریش۔ ۳۔۴)

(پس چاہیے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے بھوک کی حالت میں انھیں کھلایا اور خوف کی حالت میں انھیں امن دیا۔)

والتین والزیتون وطور سینین و ھذا البلد الامین (التین۔ ۱۔۲)

(قسم ہے انجیر کی' زیتون کی' طور سینا کی اور اس امن والے شہر کی۔)

ان آیات کو پڑھنے کا لطف اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب آپ مکہ میں ہوں اور بیت اللہ آپ کی نگاہوں کے عین سامنے ہو۔

بیت اللہ کے اردگرد واقع مکے کی انہی گلیوں میں تیرہ سال تک قرآن نازل ہوا اور جب ہٹ دھرم کافروں نے اسے ماننے سے انکار کیا تو صاحب وحی نے انہی گلیوں' محلوں میں گزاری ہوئی زندگی کو دلیل کے طور پر پیش کیا تھا: لقد لبثت فیکم عمرا سنین ۔(میں نے اپنی عمر کے کتنے ہی سال تمہارے ساتھ گزارے ہیں۔) کتنی خوبصورت بات ہے اور کتنا بڑا دعویٰ! بھرپور اپنائیت کے ساتھ پیش کیا گیا کہ کل تک تو میں تمہارا ہی ساتھی تھا' تمہارے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ چلتا پھرتا تھا۔ تمہارے دکھ میرے دکھ تھے۔ تمہاری میری خوشیاں سانجھی تھیں۔ کبھی مجھے جھوٹ بولتے' لاف زنی کرتے یاوہ گوئی کرتے سنا؟ کوئی ہے تم میں جو میرے کردار پر انگلی اٹھا سکے؟ نہیں اور یقیناً اس کا جواب نہیں میں ہے تو مان لو کہ آج جن حقیقتوں کی خبر تمھیں دے رہا ہوں ان میں بھی چنداں کوئی جھوٹ شامل نہیں۔ تمہارے ساتھ گزارے ہوئے ماہ و سال میرے دعوے کی صداقت کے گواہ ہیں۔ تمہارا خیرخواہ رہا ہوں اور اب بھی تمہارے بھلے کی بات پیش کر رہا ہوں۔

حضرت بلالؓ کے نقش قدم پہ

سیدنا بلالؓ پر انہی گلی کوچوں میں ظلم کے پہاڑ توڑے گئے تھے۔ ایک دفعہ ہوٹل سے نماز ظہر پڑھنے خانہ کعبہ جانے لگے' تو سوچا آج ننگے پاؤں چلیں۔ ان گلیوں کی

"زمانے کو برامت کہو میں زمانہ ہوں۔" (حدیث قدسی)

اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز

جب خانہ کعبہ میں ہوتے تو اطمینان سے کسی کونے میں بیٹھ جاتے اور ان تمام افراد کو یاد کرتے جو سن شعور سے اب تک ہمارے حلقہ تعارف میں آئے تھے۔ ان کے لیے دعا کرتے۔ اس بہانے ایک تو اللہ میاں سے راز و نیاز کا موقع مل جاتا' دوسرے بک اکاؤنٹ میں کچھ نہ کچھ جمع ہوتا رہتا کہ دعا کسی حال فائدے سے خالی نہیں جاتی۔ اگر منظور نہ بھی ہو تو اس کے بدلے آنے والی کوئی آفت ٹال دی جاتی ہے۔

انسان صرف اپنی ذات کے لیے دعا کرے' تو اس کی تمناؤں کا ذخیرہ جلد ختم ہو جاتا ہے۔ آخر کیا کیا کچھ مانگے اپنے لیے؟ پس چاہیے کہ دعاؤں میں دوستوں' رشتہ داروں بلکہ مخالفوں کو بھی (مثبت دعاؤں کے ساتھ) یاد رکھے۔

دعا کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ مانگو دوسروں کے لیے' جھولی اپنی بھرتی رہتی ہے۔ دینے والے کی رحمت بے پایاں جو ہوئی۔ پھر اسی کا در ایسا ہے جہاں سے بار بار مانگتے رہو' کبھی ڈانٹ نہیں پڑتی۔ پس چاہیے کہ اسی کو پکاریں' اسی سے مدد مانگیں' صرف اسی سے..... اور اس کے لیے یہ شرط تو نہیں کہ خانہ کعبہ ہی جائیں تو یہ سلسلہ قائم ہو' دعاؤں کا سلسلہ تو کہیں بھی' کسی بھی وقت قائم ہو سکتا ہے۔ ہم تو پھر وہاں تھے' جہاں

حکایت لذیذ بود' دراز تر گفتم

اللہ میاں سے باتیں کرنے میں زیادہ لطف آتا:

"اے اللہ! وہ بچپن کا ساتھی..... جانے آج کل کہاں ہے۔ جہاں کہیں بھی ہے' اسے اپنی امان میں رکھنا۔"

"ہماری امان میں ہے۔"

"اور وہ فلاں' ہم نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ معافی عطا ہو۔"

"اوکے۔"

"اسے اپنے پاس سے بدلہ عطا فرما۔"

"فرما دیا۔"

"فلاں مدیر کتنے خلوص سے محنت کر رہے ہیں۔ ان کے پرچے کو فروغ عطا فرما۔"

"اوکے۔"

حاجی خانہ کعبہ کا طواف کر رہے ہیں

خانہ کعبہ میں رحمت خداوندی جوش میں ہوتی ہے۔ درخواستیں فٹافٹ پاس ہوتی ہیں۔ ایک بار مسترد ہوتے بھی محسوس ہوئی۔

"اللہ! ہمارے فلاں دوست بے اولاد ہیں۔ انھیں اولاد عطا فرما۔"

خاموشی

"اللہ! فلاں صاحب بڑے اچھے ہیں۔ انصاف

ساتھ مل کر خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے' تو ان کے لبوں پر یہ دعا تھی ''اے رب! اس شہر کو امن والا شہر بنانا' اس کے رہنے والوں میں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھیں' انھیں پھل عطا کرنا اور ان میں ایک رسول بھیجنا جو انھیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے' انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔''

رب کا میلا

بیت اللہ کی دنیا عجیب ہے۔ اس کے دروازوں سے داخل تو لوگ گروہ در گروہ ہوتے ہیں۔ مجموعوں کی شکل میں' انبوہ کی صورت' لیکن صحن میں اترتے ہی ہر شخص فرد واحد رہ جاتا ہے۔ ہر ایک کی اپنی تمنائیں ہوتی ہیں' اپنی دعائیں' مرادیں' منتیں اور چاہتیں۔ سارے مطالبے ایک ہونے کے باوجود' ہر زندگی مختلف ہوتی ہے جس میں محرومیاں ہوتی ہیں' حسرتیں' کردہ گناہوں کی پشیمانیاں' ناکردہ گناہوں کی سزائیں بھی! ہر کوئی اپنے گناہوں کا پشتارہ' خواہشوں کی گٹھڑی اور تمناؤں کی ''کانفیڈنشل'' فہرست ساتھ لاتا اور چپکے چپکے' سرگوشیوں میں اللہ میاں کے حضور پیش کرتا ہے۔

کچھ راز ایسے ہوتے ہیں کہ لب پر بھی نہیں آتے۔ دیواروں کے کان ہوتے ہیں نا! یہ راز ایسے ہوتے ہیں کہ بیت اللہ کی دیواروں کو بھی ان کا امین نہیں بنایا جا سکتا۔ براہ راست اللہ میاں کی خدمت ہی میں پیش کیے جاتے ہیں۔ بغیر زبان پر لائے۔ ''اے اللہ! تو جانتا ہے' تو علیم ہے' تو حلیم ہے۔'' یوں بھی ہوتا ہے کہ ہزاروں میل کا سفر جن کی سنگت میں طے کر کے بیت اللہ پہنچتے ہیں' طواف کے دوران' ہاتھ تو ان کے تھامے ہوتے ہیں لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ان سے بھی نہیں کی جاتیں' ان پر ذاتی' پرسنل' کانفیڈنشل' خفیہ' سیکرٹ' بلکہ ٹاپ سیکرٹ کے لیبل لگا کر رب کعبہ کے حضور پیش کی جاتی ہیں۔ اقبال خود تو وہاں نہیں جا سکے' گھر بیٹھے بیٹھے درخواست بھجوا دی ؎

گر تو می خواہی حسابم ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

(اگر تو مجھ سے حساب کتاب لینا ہی چاہے تو محمد مصطفیٰ ﷺ کے سامنے نہ لینا۔ ان سے چھپ کر لینا کہ ان سے محبّت کے مدعی کے ایسے ایسے گناہ)

اور اللہ میاں کی عظمت تو دیکھو۔ گھر ہے اس کا لیکن کوئی انتظار گاہ نہیں' کوئی ڈرائنگ روم نہیں' کوئی بیڈ روم' پرائیویٹ چیمبر' کمرا خاص' کچھ نہیں۔ زنان خانے مردانے کی کوئی تمیز نہیں۔ دیوان خاص بھی کوئی نہیں۔ ہاں دیوان عام ہے' کھلی کچہری جس میں داخلے کے لیے کسی پہریدار سے پوچھنا پڑتا ہے نہ کوئی زنجیر کھینچنی پڑتی ہے۔ کوئی منشی' کوئی پی اے' کوئی سیکرٹری' کوئی پی ایس سی' کوئی نہیں۔ اس کے باوجود جو کوئی دیوان عام میں داخل ہو' وی آئی پی بن جاتا ہے' اسٹیٹ گیسٹ!

جو وہ کچھ کہے' بڑی احتیاط اور باریک بینی کے ساتھ نوٹ کیا جاتا ہے۔ اللہ میاں ہر شخص کے ساتھ الگ الگ پیش آتے ہیں' ذاتی توجہ کے ساتھ۔ اور بہت سے لوگ گواہی دیں گے کہ جو دعا دل کی گہرائیوں سے کی جائے' پورے یقین و اعتماد کے ساتھ' اس کا جواب وہیں' اسی وقت مل جاتا ہے۔

اس کی مصلحتیں وہی جانے' وہ جو کچھ کرے' پورے چمن کے مجموعی انتظام کی بہتری سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ جو کچھ کرتا ہے' وہی وقت کی بہترین تدبیر ہوتی ہے۔ ہماری نگاہ کوتاہ بیں وقتی طور پر اس کی مصلحت سمجھنے سے قاصر رہتی ہے' اس لیے وارننگ دی گئی:

ہو جاتا۔ تب وہ بے تاب ہو کر دوڑتیں، تاوقتیکہ دوسرے ٹیلے کی چڑھائی سے انھیں بچہ پھر نظر آنے لگتا۔ میرا خیال ہے کہ مائیں اس کرب کو زیادہ بہتر طریقے سے محسوس کر سکتی ہیں جس سے بی بی ہاجرہ اس وقت گزری ہوں گی۔ یہ ماں کی ممتا ہی تو ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے امر کر دیا۔

حج کی تمام ادائیں ایک چھوٹے سے کنبے کی کہانی کے اردگرد گھومتی ہیں۔ چھوٹا سا کنبہ، اللہ کے رنگ میں رنگا ہوا۔ سراپا اطاعت، وفا شعار، تسلیم و رضا کے پیکر۔ عمر کا آخری حصہ تھا جب حضرت ابراہیمؑ کے ہاں بی بی ہاجرہ کے بطن سے اسماعیل علیہ السّلام پیدا ہوئے۔ اتنی دعاؤں اور تمناؤں کے ساتھ پیدا ہونے والا بچہ کتنا لاڈلا، کتنا پیارا اور دل کے کتنا قریب ہوگا۔ حکم ہوا اسے یہاں چھوڑ جاؤ، وادی بے نمود میں، جہاں دھوپ سے بچنے کے لیے کسی شجر کا سایہ تھا نہ پیاس بجھانے کے لیے پانی کا کوئی بندوبست۔ سورج آگ برساتا تھا اور تپتی ریت کسی سبز پتے کو پنپنے نہ دیتی تھی۔

صفا اور مروہ کے درمیان چلتے حاجی

پانی کا جو مشکیزہ چھوڑ چلے تھے، وہ کتنے دن چلتا......
ایثار و وفا کے اس پیکر پر ہزار محبتیں قربان، جب وہ اپنی بیوی اور بچے سے منہ موڑ کر چلا ہوگا تو فطری طور پر تقاضائے بشریت سے دل میں ایک ہوک سی تو اٹھی ہوگی، دھڑکنیں منتشر تو ہوئی ہوں گی شفقت پدری نے پیچ و تاب تو کھائے ہوں گے لیکن وہ جس مقام پر فائز تھے، اس کے وقار کا تقاضا تھا کہ لب خاموش رہیں لہجہ پرسکون ؎

میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں کہ وہ پوچھ نہ لے
یہ اگر ضبط کا آنسو ہے تو ٹپکا کیسے

آدابِ فرزندی

ایک عرصے بعد لوٹے تو باصبر بیوی نے دھڑکنیں فرش راہ کر دیں۔ بیٹا نہ صرف سلامت تھا بلکہ قد کاٹھ بھی نکال چکا تھا۔ ابھی اسے دیکھ دیکھ جی بھی نہ بھرا تھا، تبھی پرچہ سوالات سے مشکل ترین سوال اترا ''اسے ہمارے لیے ذبح کر دو گے؟'' بلا چون و چرا بیٹے کو ساتھ لے ویرانے کو چل دیے۔ اور اطاعت گزار بیٹے کو دیکھو، کہتا ہے ''ابا جان! آپ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ شفقت پدری سے احکام الٰہی کی تعمیل میں ہاتھ کانپ جائے۔''

اللہ اللہ، سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

یہ الگ بات کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام اور ان کے گھرانے کے نقوش پا کی پیروی لغوی اور روحانی، دونوں معنوں میں اگر کوئی کرتا ہے تو صرف مسلمان۔ آج مکہ اور اس کے اردگرد جو خوش حالی، آسوگی، طمانیت، امن و امان اور فراوانی نظر آتی ہے، وہ سب کچھ سیدنا ابراہیم علیہ السّلام کی دعاؤں کا ثمر ہے۔ وہ جب اپنے بیٹے کے

وہ مالک کائنات جو سب جہانوں کا رب ہے' کتنا عظیم ہے اور ہم کتنے حقیر' چھوٹے' بے مایہ' بے حقیقت! ذرا ذرا سی بات پر اس کے احکام بھلا بیٹھتے ہیں' جسارتیں کرتے ہیں' گستاخیاں' بدتمیزیاں' خلاف ورزیاں' یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ اس نے پھر بھی اپنے ہاں بلایا تھا۔ سبحان ربی الاعلیٰ پاک تو صرف میرے رب کی ذات ہے جو اعلیٰ ہے' بلند و برتر...... اے اللہ معاف فرما دے۔ بلایا ہے تو مان بھی رکھ۔ معاف کر دے۔ تو عظیم ہے' تو کریم ہے' تیری شان جل جلالہ۔

دیر بعد سر اُٹھایا تو آنسوؤں کے پیچھے سے خانہ کعبہ دھندلایا ہوا نظر آیا۔ جیسے خوبصورت تصویر کے اوپر مہین کاغذ کا حجاب۔ بعض اوقات قربتیں بھی منظر دھندلا دیتی ہیں ؎

اس انتہائے قرب نے دھندلا دیا مجھے
کچھ دور ہو کہ دیکھ سکوں تیرا بانکپن

آنکھیں میچ کر آنسو گرائے' تو منظر واضح ہو گیا۔ خوبصورتی اور نکھر گئی' حسن اور نمایاں۔ درمیان میں سیاہ غلاف میں ملبوس خانہ کعبہ تھا اور اس کے اردگرد سفید سفید احرام اور عباؤں میں ملبوس پھیرے لیتے ہوئے انسانوں کا ہجوم......

طواف کی سائنس

جانے اس طواف میں کیا مصلحت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو یہ کائنات تخلیق فرمائی' اس میں طواف کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ہر ذرہ اپنے مرکز کے گرد گھوم رہا ہے۔ زمین خود اپنے محور پر اور سورج کے گرد بھی گھوم رہی ہے۔ چاند زمین کے طواف میں مصروف ہے۔ ہمارے شمسی نظام کے تمام سیارے سورج کے اردگرد گھوم رہے ہیں۔ سورج ہے کہ وہ بھی اپنے مدار میں کسی سمت رواں دواں ہے۔

ماہرین فلکیات نے اب دریافت کیا ہے کہ نہ صرف سورج بلکہ وہ تمام تارے جن کو ثوابت (Fixed stars) کہا جاتا ہے۔ ایک رخ پر چلے جا رہے ہیں۔ ثوابت کی رفتار کا اندازہ ۱۶ سے ۱۶۰ کلومیٹر فی سیکنڈ لگایا گیا ہے۔ سورج کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے پورے نظام شمسی کو لیے ہوئے ۲۰ کلومیٹر فی سیکنڈ یعنی بہتر ہزار کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔

چناں چہ اللہ تعالیٰ نے حج کو زندگی میں ایک بار فرض ٹھہرایا اور اس میں طواف کو لازم قرار دیا' اس میں کوئی مصلحت ہوگی۔ یہ دور کی کوڑی نہیں بلکہ غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام میں جو پانچ باتیں بنیادی ارکان کی حیثیت رکھتی ہیں' ان میں سے تین کے اوقات کا تعین براہ راست اس پورے نظام شمسی اور زمین کی گردش سے ہے۔

بے خودی کے عالم میں ہم نے طواف مکمل کیا۔ مقام ابراہیم علیہ السّلام کے پاس آ کر دو نفل پڑھے۔ مقام ابراہیم سے اُٹھ کر آب زم زم پیا' تو جیسے تسکین روح کی گہرائیوں تک اتر گئی۔ ننھے اسماعیلؑ کی ایڑیاں کتنی بابرکت تھیں کہ ان کے طفیل اب تک کھربوں آدمی زم زم سے فیض یاب ہو چکے۔ چشمہ ہے کہ اس کی روانی میں کوئی کمی آئی ہے نہ پانی کے ذائقے میں تبدیلی۔ روح کی شفا' جسم کی غذا۔

ماں کی ممتا

صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے بی بی ہاجرہ کی بے تابیاں خود بخود نظروں میں گھوم جاتی ہیں۔ دونوں ٹیلوں کی درمیانی جگہ نشیب میں ہے۔ بی بی ہاجرہ یہاں آتیں تو ان کا لخت جگر ان کی آنکھوں سے اوجھل

سفرنامہ حج

لبیک اللھم لبیک'
لبیک لاشریک لک لبیک

اے اللہ ﷻ
میں حاضر ہوں

رب کائنات کی عظیم بارگاہ میں اطاعت گزاری' عاجزی اور خدمت کے انمول جذبات سے آراستہ

کرنل (ر) اشفاق حسین

ہم نے پہلے ایک ہوٹل ڈھونڈا۔ سامان وہاں رکھا اور چلے خانہ کعبہ کی طرف' وہ گھڑی آنے کو تھی جس کا اشتیاق تھا۔ وہ گھر سامنے تھا جہاں سے بلایا گیا تھا۔ مرکز یقین' مرکز روح و شفا' مرز مہر و وفا' ہم مقناطیس کی طرح اس کی طرف کھنچتے چلے گئے۔

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے' یہ بڑے نصیب کی بات ہے..... ہم برآمدے سے نیچے اتر آئے۔ رہا نہیں گیا' آنسو برساتی آنکھوں کے ساتھ سجدے میں گر پڑے۔ بیت اللہ میں داخلے کے بعد افضل ترین عبادت طواف کعبہ ہے۔ یعنی تحیۃ المسجد کی جگہ بھی طواف ہی کرنا چاہیے لیکن یہ ایک بے اختیاری فعل تھا۔ وہ سارا جلال' وہ سارا جمال جو سنتے آئے تھے' ہمارے چاروں طرف موجزن تھا۔ اللہ اکبر' اللہ اکبر لیکن سر اُٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔

11. Authentic proof of their financial position such as Bank Statement of previous one year.
12. Total assets work capital and liabilities duly certified.
13. Income tax registration certificate.
14. Any further particulars the firm whishes to furnish.
15. **The interested firms in the work will be shown their experiences in relevant field and detailed of works in hand indicating name of Client Department, consultants, scope of works completed/payment received upto date by the contractor/firm.**

The Pre-qualification application shall be evaluated on the basis of Planning & Development Department Criteria for Pre-qualification. The other related information required in this regard should also be provided/demanded.

Any further information/detail in this connection may be had from the Head Clerk in District Officer, (Roads) Highway Division, Gujranwala on any working day.

Only Pre-qualified firm will be sent invitations to submit tender.

RULES & REGULATIONS.

16. Competent Authority/prequalification committee reserves the rights to reject any application with assigning any reason as per PPRA rules 35.
17. Any concealment about the information/detail mentioned above may result in disqualification of the firm.
18. In case of incomplete information, prequalification application will be rejected and will not be considered for prequalification.
19. No court proceeding against the prequalification committee will be allowed and the decision of the committee will be final.
20. Applicant, firm/contractors are required to guarantee/undertaking that they have carefully studied the prequalification notice and will abide by the rules of the department mentioned above.

IPL-12323

Abdul Qayyum Tahir
District Officer (Roads),
Highway Division, Gujranwala.

HIGHWAY DIVISION GUJRANWALA.
PRE-QUALIFICATION NOTICE.

Application are invited from reputed/specialized contractors who are at the approved list of CWD for Highway Works and have got their names Registered/Renewed with Pakistan Engineering Council and Secretary to Government of the Punjab Communication & Works Department Lahore for the year 2014-15 to participate in pre-qualification for the following work in city Gujranwala.

Sr. No.	Name of Work	Estimated Cost in Million
1.	Rehabilitation of road from Theri Sansi road to Sansara Goraya. (Length = 2.31 KMS)	65.233 (M)
2.	Rehabilitation of road from Alamgir road to Exchange and Allama Iqbal road Ghalla Mandi and both side Railway line from Harrar Phatak to Mandiala Phatak. (Length = 3.15 KMS)	100.00 (M)

The interested firms are required to submit the following information/documents page marked & indexed (in duplicate) to the District Officer, (Roads) Gujranwala **upto ~~09~~ 11-10-2014** during office hours.

1. Name/Full address & partnership deed of the contractors/firms with Power of Attorney in favour of person authorized.
2. Year of Establishment supported by certificate from the Registrar of firms.
3. Name & Particulars of specialist firm to be associated.
4. List of cases pending in Arbitration/litigation if any.
5. List of complete permanent Business Management, Finance Management and Engineering/Technical Staff with their complete Bio-data and proof of stay with the firm.
6. List of equipment with its No. Make/Model condition and location alongwith the proof of ownership..
7. Detail of similar projects completed by the contractor/firm giving location approximate cost, time taken for completion duly supported with a certificate for client Department.
8. List of Projects handled during last three years giving their location, approximate cost, time allowed/taken duly supported with certificate from client Department.
9. Performance Certificate from the Executive Engineer/District Officer, (Roads)/Client under whom the works have been executed during last three years.
10. Detail of works in hand indicating name of Client Department, consultants, scope of works completed/payment received upto date by the contractor/firm.

سالانہ ترقیاتی پروگرام بابت سال 15-2014ء

نمبر شمار	نام منصوبہ	تخمینہ لاگت	زر ضمانت	مدت تکمیل
1	تعمیر نالہ و بھرائی مٹی پانڈ موضع ناڑی	17.723 ملین	0.355 ملین	6 ماہ
2	تعمیر نالہ و بھرائی مٹی پانڈ موضع لوتالہ (مجاز اتھارٹی سے فنی طور پر منظور شدہ)	10.353 ملین	0.207 ملین	4 ماہ

ٹینڈر شرائط

1. کٹے پھٹے بذریعہ ٹیلی گرام۔ اوور رائٹنگ اور بغیر دستخط والے ٹینڈر قبول نہ ہوں گے۔
2. نرخ۔ الفاظ اور ہندسوں میں تحریر کیے جانے لازمی ہوں گے۔ 3. کال ڈیپازٹ کسی بھی شیڈول بنک کی رقم کی بنام زیر دستخطی وصول کیے جائیں گے۔ 4. مندرجہ بالا منصوبہ جات کی تبدیلی و منسوخی تابع انتظامی احکامات ہوگی اور ٹھیکیدار اسکا پابند ہوگا۔ 5. ٹھیکیدار ہر قسم کے تعمیراتی کام کیلئے سامان اور مشینری کا خود بندوبست کریگا اگر کوئی سامان یا مشینری محکمہ مہیا کریگا تو اسکی قیمت وصول کی جائے گی۔

6. روڈ رولر مشینری مہیا کرنا محکمہ کی ذمہ داری نہ ہوگی اگر اس وجہ سے تاخیر ہوئی تو ٹھیکیدار ذمہ دار ہوگا۔ 7. اتھارٹی کے فنی طور پر منظور شدہ تخمینہ جات دفتر اسسٹنٹ انجینئر لوکل گورنمنٹ اینڈ کمیونٹی ڈویلپمنٹ ضلع خوشاب میں دفتری اوقات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مٹی کی اونچائی کے حساب سے ریٹ قابل قبول نہ ہوں گے۔

نوٹ: Earth Filling اور Dewatering کی ادائیگی PMDFC کے دیے گئے لیول اور ہدایات کے مطابق کی جائے گی۔

کوٹیشن

1۔ مہیا کئے جانے 5 عدد ٹائرز بمعہ ٹیوب برائے GENERAL 6.00-16 LT ND پجارو، سوزوکی جیپ (ریٹ بشمول تمام ٹیکسز دیئے ہونگے) — کال ڈیپازٹ 2000/- روپے

جملہ کوٹیشن مورخہ 14-10-2014 12 بجے دن تک وصول کی جائیں گی اور مورخہ 14-10-2014 کو ہی 2 بجے دن کھولی جائیں گی۔

المشتہر

Ahsan

شیخ محمد احسان الحق

اسسٹنٹ انجینئر لوکل گورنمنٹ و کمیونٹی ڈویلپمنٹ

ضلع خوشاب

IPL-12391

واقعی تبدیلی چاہتے ہیں لیکن ممبران کے ساتھ جو لیڈر ہیں انھوں نے پیسے کے بل پر ان پر قبضہ کیا ہوا ہے۔

گفتگو کو سمیٹتے ہوئے میں نے آخری سوال داغا، کوئی بھی اہم فیصلہ کرنے سے پہلے آپ کسی سے مشاورت کرتے ہیں؟

جاوید ہاشمی نے کہا: ''پہلے سے نتائج میرے ذہن میں نہیں ہوتے۔ جسے میں درست سمجھتا ہوں اُس پر ڈٹ جاتا ہوں۔'' حالیہ دنوں میں مجھے سوسائٹی نے حوصلہ دیا۔ میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ ابھی بھی دیکھیں پوری سول سوسائٹی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ جن دنوں میں قید تھا۔ میں نے جیل سے بیٹی کو خط لکھا تھا۔ ایک سول سوسائٹی کھڑی ہوتی جا رہی ہے اور پرویز مشرف کا دور چلا جائے گا اور اس کے بعد جو سول حکومت آئے گی اگر اسے پھر کوئی گرائے گا تو سول سوسائٹی اُٹھ کھڑی ہوگی۔ میں نے زندگی میں جو فیصلے کیے وہ اتفاق سے اتنے غلط نہیں کیے۔ انسان سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ میں کڑوے مزاج کا ہوں جو سچ سمجھا اس پر ڈٹ گیا اور اب میں نے اپنے حلقے کے عوام کو کہا کہ آپ نے مجھے پانچ سال کے لیے اسمبلی بھیجا تھا اس میں پارٹی کا بھی حصہ تھا۔ یہ مشترکہ امانت ہے' پارٹی کی آپ کی' میں اب آپ کے پاس استعفیٰ دے کر آپ کی دہلیز پر کھڑا ہوں...... اب یہ رائٹ میرے ووٹروں کا ہے کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ ان کے فیصلے پر سر تسلیم خم کرنا چاہیے۔ ◆◆◆

جواب ہوگا جاوید ہاشمی نے پاکستان کو بچالیا۔ لہٰذا میں نے بہت سوچ بچار کی مگر جو فیصلہ کیا اسے صرف میں جانتا تھا یا میرا اللہ......

میں سمجھتا ہوں کہ جو نوجوانوں کو مایوس کریں گے اور جو پارٹی مسائل پیدا کرے گی وہ مرجائے گی۔ آج بھارتی صرف چار ارب کی مشینری سے مریخ تک پہنچ گئے۔ آپ ان سے کتنی نفرت کریں گے۔ الطاف حسن قریشی صاحب میں نے آپ کو اتنا پڑھا کہ مجھے انڈیا سے نفرت رہی اور میں وہاں نہ گیا...... کافی عرصہ بعد ایک سیمینار کے سلسلے میں دلّی جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں حضرت نظام الدین اولیاؒ اور امیر خسروؒ کے مزار پر گیا تو یہ ملتان کے حوالے سے آپ کا شعر بے ساختہ یاد آ گیا ؎

ملتان ما بجنت اعلیٰ برابر است

آہستہ پا بنہہ کہ ملک سجدہ ہی کنند

(ہمارا ملتان جنت الفردوس کے برابر ہے...... پاؤں آہستہ رکھ کہ یہاں فرشتے سجدہ ریز ہیں)

آپ دیکھیں کہ انڈیا نے کتنی ترقی کی ہے۔ وہاں اسّی جہاز کھڑے دکھائی دیے۔ کوئی جہاز آ رہا ہے کوئی اڑنے کو تیار ہے اور میں واپس لاہور آیا...... لاہور کتنا پر رونق شہر ہے مگر جب اوپر سے دیکھا تو یہ ویران نظر آیا۔

آپ سمجھتے ہیں کہ عمران خاں کی تحریک انصاف تبدیلی لے آئے گی۔ اس کے بارے میں منفی تاثر ہے کہ یہ ڈانس پارٹی ہے؟

مخدوم جاوید ہاشمی: آپ کو شاید میری باتوں سے سو فیصد اتفاق نہ ہو لیکن میں عمران کی نوے فیصد باتوں کی تائید کرتا ہوں۔ اُن کی پارٹی میں جتنے بھی نوجوان ہیں وہ ڈانس پارٹی نہیں...... ان سب میں پاکستان سے محبّت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اور یہ ایک دو جلسوں کا کام نہیں۔ عمران خان کھلاڑی ہے وہ کسی کی بے عزتی نہیں کر رہا ہوتا یہ اس کا انداز...... اس کا اسٹائل ہے۔ جو اس کے ساتھ ہیں وہ جانتے ہیں۔ کوئی اس پر تنقید کرے وہ برداشت کرتا ہے۔ البتہ جس بات پر مجھے تشویش ہے جس کا میں نے اظہار نہیں کیا وہ اس پارٹی کے اندر پاکستان کی جمہوریت اور اس کی بنیادوں کے ادراک کا فقدان ہے۔ وہ وعدہ کر کے توڑ دیتا ہے۔ عمران خاں کو موقع ملے تو وہ میرے خلاف بات کرے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ تحریک انصاف نے پارٹی الیکشن کروائے۔ رپورٹ کے مطابق یہ الیکشن گندے ترین تھے۔

حالیہ دھرنے اور جلسوں پر کروڑوں روپے کے اخراجات کی خبریں بھی میڈیا میں گردش کر رہی ہیں کہ اب تک ڈیڑھ ارب روپیہ خرچ ہو چکا ہے جس میں سے صرف ''ڈی جے میوزک گروپ'' کو ساڑھے چار کروڑ دیے گئے یہ سب کیا ہے؟

اس سوال پر مخدوم جاوید ہاشمی نے کہا: یہ سارے لوگ پیسے کھانے والے ہیں، تحریک انصاف میں جتنے لوگ کھڑے ہیں وہ لوٹ کھسوٹ کی واضح مثال ہیں۔ فیوڈل لارڈز سرمایہ دار اور نوے فیصد مشرف کے ساتھی ہیں۔ پارٹی اسٹاف چلانے والا مشرف دور کا ہے۔ اب آپ بتائیں کہ تبدیلی (چینج) آئے تو کیسے آئے۔ اگرچہ نوجوان

سب زبانیں بھول گیا تھا اور جو زبان یاد رہی وہ صرف سرائیکی تھی۔

''آپ اپنے خاندان کے بارے میں بتا رہے تھے...... جاوید ہاشمی نے کہا میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ میرے نانا کا نام مخدوم ہادی شاہ اور والد کا نام مخدوم محمد شاہ تھا۔ ہمارے گھر میں اردو کی کتابیں کم اور فارسی کی زیادہ ہوتی تھیں۔ میرے نانا ان پڑھ تھے لیکن محاورے فارسی کے بولتے تھے۔ میری والدہ نے مجھے فارسی پڑھائی اور میں اپنی جماعت کو خود فارسی پڑھاتا تھا۔ استاد کہتے تھے کہ جاوید کی فارسی بہت اچھی ہے۔ دراصل فارسی اسلامی ورثہ تھا، سکھوں کے درباری زبان بھی تھی لیکن جیسے جیسے انگریزوں کا اثر ونفوذ جہاں جہاں بڑھتا گیا وہاں بتدریج فارسی کم اور انگریزی آتی چلی گئی۔

تعلیم کے حوالے سے جاوید ہاشمی نے بتایا: میں نے اپنے گاؤں کے ٹاٹ اسکول میں ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا تھا اور ٹاٹ بھی گھر سے لانا پڑتا تھا۔ اکثر ہم درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ ہمارے اسکول کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں لائبریری بہت بڑی تھی اور جن دنوں میں نویں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس وقت تک مقدمہ ابن خلدون اور دیگر تراجم پڑھ چکا تھا۔ اسی طرح اسلام کی ابتدائی تاریخ کی چار، چار جلدوں کی ضخیم کتب بھی پڑھ ڈالیں اور اسلامی تاریخ بنوامیہ کے دور حکومت تک یہ مجھے ازبر تھی۔ پھر دوسری کتب کے ساتھ اردو ڈائجسٹ کا مطالعہ بھی کرنے لگا۔ یہ ڈائجسٹ اس لیے مجھے اچھا لگتا تھا کہ ان ڈائریکٹ طریقے سے بچے اور بڑے دونوں کے ذہنوں کی تربیت کرتا تھا اور سوچ کو مثبت سمت دیتا، سب سے بڑھ کر پاکستان سے محبت کرنے کا بتاتا۔

آپ اپنے والدین کا ذکر کرتے ہوئے جاوید ہاشمی بولے میرے والد کا شمار علاقہ کے صاحب حیثیت لوگوں میں ہوتا تھا اور علاقے کے لوگ بھی اپنی امانتیں ان کے پاس رکھواتے بلکہ ان کی آمدن کا حساب کتاب رکھنے کے ساتھ ان کے جھگڑوں کا بطور منصف فیصلہ بھی کرتے تھے۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ جو زمینیں اس وقت ہماری تھیں ان میں آج تک ایک ٹکڑے کا بھی اضافہ نہ کیا۔ جب کہ آج ان زمینوں کی اہمیت پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے اور وہ کروڑوں کی ہوگئیں ہیں۔
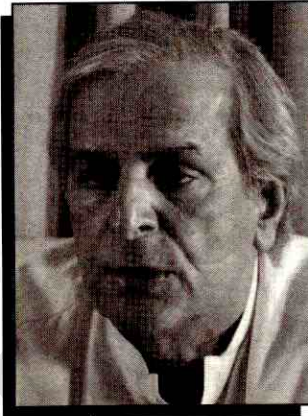
اسلام آباد میں دھرنے تھے اور پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس جاری تھا۔ جب آپ اچانک پارلیمنٹ میں داخل ہوتے ہیں تمام ارکان ڈیسک بجا کر آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں اور پھر آپ کی تقریر نے حالات کا رخ ہی بدل دیا۔ اس حوالے سے آپ نے کچھ سوچا تو ہوگا؟ آپ نے جو انکشافات کیے آپ کا خیال ہے مارشل لا کا راستہ روکا۔ سوال کے جواب میں مخدوم جاوید ہاشمی نے کہا آپ لاہور ملتان کی سڑک پر کھڑے ہو کر جس سے بھی پوچھیں گے اس کا

میں نے یہ سب کچھ کسی سیاسی مفاد کے بجائے قومی ذمے داری نبھانے کے جذبے سے کیا

ہیں۔ میں عمران خاں کے بہت بھید پا چکا ہوں اور اس نے فوجی عناصر کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا' وہ اس کا سب سے بڑا جرم ہے۔ میں آیا تو ریڑھی والے میرے پاس آئے اور مجھے پاکستان کو تباہی سے بچانے پر مبارک باد دی۔ عام شہری میری انتخابی مہم چلا رہے ہیں اور میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پرامید ہوں کہ عوام صحیح فیصلہ کریں گے اور عمران خاں کے فوجی اقتدار کے خلاف ووٹ دیں گے۔''

مخدوم جاوید ہاشمی نے اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں سوال کے جواب میں بتایا کہ تقریباً ایک ہزار سال قبل ہمارے آباؤ اجداد بدخشاں' تاشقند سے محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے کیوں کہ محمد بن قاسم کے بعد ہندوؤں نے پھر ان علاقوں پر تسلّط جما لیا تھا۔ محمود غزنوی کے ساتھ ہمارے بزرگ بھی تھے لہٰذا فتح کے بعد واپس جاتے ہوئے غزنوی، مخدوم احمد غوث کو اس علاقہ کا حاکم مقرر کر گئے۔ آپ دیکھیں کہ ملتان کا علاقہ ہر دور میں اہمیت کا حامل رہا۔ پھر تغلق اور پٹھان دلّی میں آئے۔ یہ ساتھ چلتے گئے۔ مغلوں کے دور میں لاہور کی اہمیت بڑھ گئی جبکہ اس وقت لوگ کہتے تھے جس کا ملتان مضبوط اس کا دلّی مضبوط ہے۔ اس دور میں ابن بطوطہ' البیرونی' سعدی شیرازی بھی ملتان تک آئے جبکہ ابن بطوطہ تو آگے بھی گئے۔ لہٰذا جب پٹھانوں کی دلّی میں حکومت تھی تو ایک لحاظ سے ملتان کو بھی اہم مقام حاصل تھا اور ہمارا خاندان اس علاقے میں دین پھیلانے میں شب و روز کوشاں رہا۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد بھی ہمارے بزرگوں کی مرید تھی اور برصغیر کی تقسیم کے بعد جو ہندو یہاں سے چلے گئے وہ دم درود کا اب بھی کہتے ہیں...... دراصل انھوں نے برصغیر میں اسلام پھیلانے کے لیے بڑا کام کیا۔ میرے جد امجد کہتے تھے جب مسلمانوں نے اسپین فتح کیا تو وہاں عرب ثقافت کے اثرات عوام پر پڑے جبکہ ہندوستان میں ہندو عبادت بھی بھجن گا کر کرتے تھے' لہٰذا ہمارے صوفیائے کرام نے قوالی کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی طرح کسی کی وفات کے بعد رسم قل ہوتی' تو اس موقع پر لوگوں کا اجتماع ہوتا تو اس میں بھی دین کی تبلیغ ہوتی تھی کیونکہ اجتماع میں آنے والوں کا اثر آگے تک جاتا۔

برصغیر میں دین تلوار سے نہیں پھیلا بلکہ تبلیغ اور عمل سے آگے بڑھا۔ ایک مثال دیتا ہوں کہ ایک آدمی جنگل میں پانی کے قریب بیٹھ جاتا ہے اور گزرنے والے کسی راہگیر یا قافلے کی مدد کرتا اور آہستہ آہستہ اس جگہ کھیتی باڑی کا آغاز کرتا اور یوں دس پندرہ سال کی بے لوث خدمت سے لوگ متاثر ہوتے اور اس کی باتوں پر عمل کرنے لگتے اور چند لوگ مسلمان بھی ہو جاتے تھے۔ ان دنوں مسلمانوں کی حکومت تھی اور تاجروں کے قافلے ہی خیر کا ذریعہ ہوا کرتے تھے اور جب تبلیغی اجتماع میں اکٹھے ہوتے تو حوصلہ بڑھتا۔ پھر کہتے تم نے چلّہ لگانا ہے' سال کا۔ پھر کہتے تم بنگال چلے جاؤ اب وہ باتیں کھیل تماشے بن گئی ہیں۔

وہ سلسلہ رک گیا اور پھر خرافات آتی چلی گئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سائنٹفک طریقہ تھا۔ میں آج انگریزی کا غلبہ دیکھ رہا ہوں۔ آپ کا بزنس اور دیگر سب کام انگریزی میں ہوتے ہیں۔ زیادہ تر سائنسی معلومات انگریزی میں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مادری زبان میں پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ میں یہاں بتاؤں کہ جب مجھ پر فالج کا حملہ ہوا تو میں

دونوں بھائی جیل میں تھے۔ ہاشمی صاحب نوجوانوں کے ساتھ ہماری رہائی کے لیے جلوس نکالتے اور پوری پی این اے کو آزادی صحافت کی تحریک میں شامل رکھتے تھے۔ انہی سربکف نوجوانوں نے چار ماہ تک جان ڈالے رکھی تھی۔ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا کے بعد جاوید ہاشمی کی زندگی نے ایک نیا رخ اختیار کیا اور وہ اپنے آئیڈیل کی تلاش میں آج بھی سرگرداں نظر آتے ہیں۔ میں نے اُن کے ذہنی اور سیاسی سفر کی روداد پوچھی، تو انھوں نے دھیمے لہجے میں کہا:

''تربیت میری اسلامی جمعیت طلبہ میں ہوئی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی شخصیت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ وہ معاشرے میں جو تبدیلی لانا چاہتے تھے اس کی رفتار میرے خیال میں بڑی سست تھی۔ ساٹھ کی دہائی میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کے انقلابی تصورات سے میں بہت متاثر ہوا اور نوجوانوں کے ساتھ اُن سے ملنے گیا۔ اُن کا رویہ بہت کھردرا اور کسی قدر حاکمانہ تھا۔ ہم نے سوچا جو شخص ملنے ملانے میں رعونت کا اظہار کر رہا ہے وہ قیادت جمہوری طور طریقے سے کیسے کر سکتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق آئے تو میں نے پی این اے کے ساتھ اُن کی کابینہ میں شمولیت اختیار کی، مگر جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں نے وزارت چھوڑ دی اور قوم سے معافی بھی مانگی۔ قوم سے معافی مانگ کر میں ایک اچھی روایت قائم کرنا چاہتا تھا۔ پھر مجھے ائیر مارشل اصغر خاں کی دیانت داری اور سیاست میں دانش کے امتزاج نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ ٹیم کو ساتھ لے کر چلنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد نواز شریف نے جس پامردی سے صدر غلام اسحٰق خاں کی ڈکٹیشن لینے سے انکار کیا تھا، اُن کی وہ ادا مجھے بہت پسند آئی۔ میں اس جماعت کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی میں آیا اور وزارت کا قلمدان بھی سنبھالا۔ ایک مقام پر آ کر مجھے محسوس ہوا کہ کابینہ کے چودہ ارکان کا تعلق پنجاب سے ہے، تو میں نے وزارت چھوڑنے اور میری جگہ کسی دوسرے صوبے سے وزیر بنانے کی تجویز دی۔ نواز شریف اور اُن کی جماعت پر بُرا وقت آیا تو میں نے قیادت کا بار سنبھالا اور جب یہ محسوس ہوا کہ مجھے عضو معطل سمجھ لیا گیا ہے، تو میں نے مسلم لیگ نون کو خیرباد کہہ دیا۔ اس دوران عمران خاں مطلع سیاست پر نمودار ہوا اور اس نے نوجوانوں کو ایک روشن مستقبل کی نوید سنائی، تو میں اس روشنی کی طرف لپکا، لیکن اوّل روز ہی احساس ہو گیا کہ یہ چمک پرائی ہے۔''

اُنھوں نے یہ آخری الفاظ رندھی ہوئی آواز میں ادا کیے تھے۔

''آپ نے تحریک انصاف میں سب سے بڑی خاص کیا بات پائی ہے؟ میں نے آہستگی سے پوچھا۔ انھوں نے عالم کرب میں کہا:

''عمران خاں اور اس کے چاپلوسوں کو پاکستان کے مقاصد اور اقدار کا سرے سے کوئی ادراک نہیں۔ دراصل سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے پارٹی پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ عمران خاں کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں اور اچھے لوگوں کو پیچھے دھکیل رہے ہیں۔ آپ غور کیجیے کہ تحریک انصاف کی ہائی کمان کا تعلق ملتان سے ہے۔ میں اس کا صدر ہوں، مخدوم شاہ محمود قریشی وائس چیئرمین ہیں۔'' جہانگیر ترین سیکرٹری جنرل ہیں جبکہ شیریں مزاری بھی مرکزی شخصیت ہیں۔ میں نے اپنے عہدے سے دستبردار ہونے کی پیشکش کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مجھے کسی عہدے کا لالچ نہیں۔ میں تو جب تک جان میں جان ہے، عوام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ تحریک انصاف کے اندر جو انتخابات ہوئے وہ بڑی حد تک جعلی تھے اور اسمبلیوں کے ٹکٹ بھاری رقوم وصول کر کے دیے گئے تھے۔ جسٹس وحید الدین اور تسنیم نورانی کی رپورٹیں ان تمام امور کی تصدیق کرتی

ہو گئے۔ اس وقت کے صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو ہمارے گھیرے میں تھے۔ وہ اس وقت ایک بگھی میں بیٹھے ہوئے تھے اور برطانیہ کے وزیرخارجہ لارڈ ہوم اُن کے ہمراہ تھے۔ وہ نوجوانوں کی یلغار سے گھبرا گئے۔ ہمارے اُن سے مذاکرات ہوئے اور یہ طے پایا کہ لڑکیوں کی برآمدگی تک پنجاب کے وزیر ممتاز کاہلوں یرغمال کے طور پر ہمارے حوالے کر دیے گئے۔ جن کو ہم نے طالبات کی باعزت واپسی کے بعد رہا کر دیا تھا۔ اس ایک واقعے نے پورے ملک میں کھلبلی مچا دی تھی اور حزب اختلاف میں جان پڑ گئی تھی اور عوام کے حقوق کا شعور ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ میرے اندر جبر کے خلاف جدوجہد کرنے کا جذبہ پہلے سے زیادہ مستحکم اور جواں تر ہو گیا تھا اور میں نے عہد کیا تھا کہ اپنے ہم وطنوں کی عزت و ناموس کی حفاظت اور اُن کے حقوق کی خاطر ہر محاذ پر سرگرم رہوں گا۔"

میرے حافظے کی اسکرین پر اُس عہد کے واقعات ایک فلم کی طرح چلنے لگے۔ سمن آباد کی طالبات کے واقعے نے جاوید ہاشمی کو ایک بہادر اور پرعزم نوجوان کی حیثیت سے متعارف کرا دیا تھا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے ایک قومی لیڈر کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور اُن کی عزیمت کے نقوش ہماری تاریخ پر گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ سقوط مشرقی پاکستان کا حادثہ پیش آ چکا تھا اور بھٹو صاحب جلد سے جلد بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینا چاہتے تھے۔ اس اہم دوراہے پر جاوید ہاشمی نے بلاشبہ ایک حیران کن کردار ادا کیا تھا۔ میں نے اس کردار کے حوالے سے اُن سے پوچھا کہ آپ بنگلہ دیش نامنظور کی تحریک میں کن نئی آزمائشوں سے گزرے تھے اور کیسے کیسے محیر العقول واقعات پیش آئے تھے۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا:

"میری جرأت اور حماقت میں بہت ہی کم فرق ہے۔ دراصل بات یہ تھی کہ جماعت اسلامی اور کچھ دوسری جماعتیں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے خلاف تھیں۔ مولانا ظفر احمد انصاری (مرحوم) اس معاملے میں پیش پیش تھے۔ ہم نوجوان باہر نکلے اور اس بھرپور طریقے سے نکلے کہ ذوالفقار علی بھٹو کو یہ کہنا پڑا کہ حرامزادو! نامنظور تو نامنظور سہی۔ یہ تھی ہمارے طالب علموں کی طاقت۔ راولپنڈی میں مسٹر بھٹو کا جلسہ ہونے والا تھا۔ وہاں میرے گروپ میں افضل اور مشاہد اللہ خاں شامل تھے۔ ہم نے جلسہ الٹا دیا اور بھٹو صاحب کو بھاگنے کا راستہ نہیں ملا۔ اس کے بعد اسلامی سربراہی کانفرنس کا مرحلہ آ گیا۔ پولیس نے لاہور کے ایک ایک چپے کی تلاشی لی تھی اور انٹیلی جنس کا ایک مضبوط نیٹ ورک بچھا ہوا تھا۔ ہم کچھ دوست پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے تھے جن میں افضل خالد اور ذوالفقار شامل تھے۔ ہم تین دوستوں نے مال روڈ پر جا کر بنگلہ دیش نامنظور کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ کھڑے تھے۔ وہ بھی ہمارے نعروں میں شامل ہو گئے اور ہمارے ساتھ آن ملے۔ اس طرح ایک جلوس کی شکل بنتی چلی گئی۔ اس اثنا میں افضل نے کہا کہ میں پستول لے کر آتا ہوں۔ میں نے کہا اس وقت میرے ساتھ رہ کر مار کھا اور کہیں مت جا۔ ہم نے اکٹھے ناقابل برداشت مار کھائی اور ہم ڈٹے رہے۔ اتنے میں شاہ فیصل کی گاڑی اسمبلی ہال کی طرف آ رہی تھی۔ ہم وہاں تک پہنچ گئے تھے جہاں بنگلہ دیش کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ پولیس نے ہمیں گاڑیوں میں ڈالا اور عقوبت خانوں میں لے گئے۔ ہماری تحریک نے جبر کے اقتدار کی بنیادیں ہلا ڈالیں تھیں۔"

جاوید ہاشمی کی باتوں میں بڑی صداقت اور تاریخ کی چاشنی تھی۔ جب پی این اے معرض وجود میں آئی تو ہم

ہاشمی صاحب! آپ کی پریس کانفرنس کے بعد وزیراعظم نواز شریف نے آپ سے رابطہ تو قائم کیا ہوگا؟ میں جملہ معاملات کے تانے بانے سمجھنا چاہتا تھا۔

''بالکل نہیں' انھوں نے برجستہ جواب دیا۔'' دراصل میں نے یہ سب کچھ کسی سیاسی مفاد کے بجائے قومی ذمے داری نبھانے کے جذبے سے کیا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ جب عمران خاں نے راستے جدا ہونے کا اعلان کر دیا ہے' تو اب مجھے پارلیمنٹ میں جانا اور اپنا استعفیٰ پیش کر دینا چاہیے۔ اس ضمن میں چند قریبی دوستوں سے مشورہ کیا۔ شامی صاحب میرے بہت قریبی دوست رہے ہیں اور وہ ہفت روزہ ''زندگی'' میں میری بہت پراجیکشن کرتے رہے۔ میں اس بات پر اُن سے ناراض بھی ہو گیا تھا کہ ضرورت سے زیادہ پبلسٹی مسائل پیدا کرتی ہے۔ اُن کی اپنی ایک دنیا ہے۔ استعفے کے بارے میں اُن سے مشورہ کیا۔ پوچھنے لگے آپ کو ماہانہ قومی اسمبلی سے چار لاکھ روپے مل رہے ہیں' کیا آپ اُن کے بغیر گزارہ کر سکیں گے۔ میں نے کہا میری زندگی اندیشۂ سود و زیاں سے ماورا ہے اور ایک سچے مقصد کے لیے سب کچھ برداشت کیا جا سکتا ہے۔ میں اے آر وائی کے ایک رپورٹر سے راستہ معلوم کر کے قومی اسمبلی میں چلا گیا اور اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے بعد اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ میرا ضمیر کہہ رہا تھا کہ میرے حلقے کے عوام نے مجھے منتخب کیا تھا' اس لیے مجھ پر لازم ہے کہ میں ان کی عدالت میں جاؤں۔ وہ اگر میرے اقدام کی تائید کریں گے' تو میرا سر فخر سے بلند ہو جائے گا اور اُن کے ساتھ میرا رشتہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔ ۱۶/اکتوبر کو انتخابات ہوں گے اور مجھے امید ہے کہ جمہوریت کی جنگ لڑنے کے صلے میں وہ میرا ساتھ دیں گے۔ سیاسی جماعتوں کو بھی ایک فعال کردار ادا کرنا ہوگا۔ وہ اگر میرے موقف کو درست خیال کرتے ہیں' تو انھیں اپنے کارکنوں کو میدان میں اُتارنا ہو گا۔ میری پینتالیس سالہ جدوجہد اُن کے سامنے ہے۔ قومی اسمبلی میں وزیراعظم صاحب بڑے تپاک سے ملے تھے' اس کے بعد کوئی رابطہ قائم نہیں ہوا' البتہ خواجہ سعد رفیق کے گاہے گاہے فون آتے رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت پرانا یارانہ ہے۔''
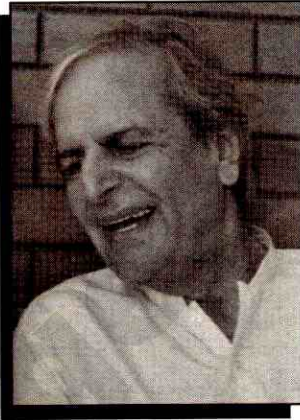
میں نے پینتالیس برس پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے سمن آباد سے دو لڑکیوں کے اغوا کا واقعہ اور نوجوان جاوید ہاشمی کا ناقابل فراموش کردار یاد آیا۔ میں اس وقت سمن آباد ہی میں رہتا تھا اور اس اذیت ناک واقعے کی یاد سے میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔ میں نے ہاشمی صاحب سے پوچھا کہ آپ بے خطر آتش نمرود میں کیا سوچ کر کود پڑے تھے۔ انھوں نے اپنے بائیں بازو کو جنبش دیتے ہوئے واقعات کی گرہیں کھولنا شروع کیں:

''غالباً یہ ۱۹۷۲ء کے اوائل کا واقعہ ہے کہ سمن آباد سے دو یتیم سید زادیاں اغوا کر کے گورنر ہاؤس پہنچا دی گئیں۔ ان دنوں غلام مصطفیٰ کھر پنجاب کے گورنر تھے۔ ہم نوجوانوں نے گورنر ہاؤس پر دھاوا بول دیا اور ہم ایک دروازہ توڑ کر اندر داخل

میری پریس کانفرنس نے عمران کو پارلیمان کی طرف بڑھنے سے روک دیا

دیا کہ تحریک انصاف کی کور کمیٹی پارلیمان پر حملے کے خلاف ہے۔ میرے اس پیغام نے عمران خاں کو پارلیمنٹ کی طرف بڑھنے سے روک دیا البتہ قادری صاحب کی عوامی تحریک پارلیمان کے گرد جنگلہ توڑ کر اندر داخل ہو گئی تھی۔

فالج کے باعث جاوید ہاشمی صاحب کا دایاں ہاتھ ساکت تھا' مگر اُن کے بائیں بازو میں ایک عجب اضطراب دیکھنے میں آ رہا تھا۔ وہ اسے بار بار حرکت دے رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کی مختصر پریس کانفرنس نے مختلف حلقوں میں کیا اثرات پیدا کیے تھے اور تحریک انصاف کے اندر کس نوعیت کا ردعمل سامنے آیا تھا۔ انھوں نے قدرے بلند آواز میں کہا: ''میں تحریک انصاف کو تباہی کی طرف جانے سے روکنے اور خطرناک نتائج سے آگاہ کرنے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا جبکہ عمران خاں در پردہ اشاروں پر بگٹٹ دوڑتا جا رہا تھا۔ میری ان کوششوں کا البتہ یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ پی ٹی وی پر حملے میں تحریک انصاف نے حصہ نہیں لیا اور سارا الزام طاہر القادری کے لوگوں پر آیا۔ یہ حملہ انقلاب مارچ کے لیے واٹرلو ثابت ہوا' کیونکہ حملہ آور اکسپوز ہو گئے تھے کیونکہ وہ فوجیوں کی آمد پر ان کے حق میں نعرے لگاتے ہوئے عمارت سے باہر چلے آئے تھے۔ انھوں نے ٹی وی اسٹیشن کے اندر شرافت اور اخلاق سے گری ہوئی جو نازیبا حرکات کیں' اُن کے خلاف عوام نے شدید ردعمل ظاہر کیا اور ٹی وی چینلز پر یہ سوال بھی زیر بحث آنے لگا کہ فوج کو آرٹیکل ۲۴۵ کے تحت اسلام آباد کی حفاظت کے جو اختیارات ملے ہیں' اُن کے استعمال میں اس نے غفلت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی شام عمران خاں نے کنٹینر پر اعلان کر دیا کہ میرے اور جاوید ہاشمی کے راستے جدا ہو چکے ہیں۔ اسی صبح کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہو چکی تھی کہ فاضل چیف جسٹس نے سپریم کورٹ کے تمام جج صاحبان کو اسلام آباد طلب کر لیا ہے اور عمران اور قادری کو نوٹس جاری کر دیے ہیں کہ وہ مصالحت کے سلسلے میں اپنی تجاویز پیش کریں۔ یہ تمام اشارے اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ ڈی ڈے قریب آ پہنچا ہے۔ چنانچہ میں نے پریس کانفرنس کے ذریعے پوری قوم کو آنے والی آفت سے خبردار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے بتایا کہ عمران خاں غیر جمہوری طاقتوں کے ہاتھ میں کھیل رہا ہے' فوج کے بااثر عناصر اسے شہ دے رہے ہیں اور منصوبہ یہ ہے کہ عدالت عظمیٰ سوموٹو لے گی اور مصالحت کے نام پر منتخب حکومت کو فارغ کر دے گی اور نئے انتخابات کے لیے ٹیکنوکریٹس پر مشتمل ایک نگران حکومت قائم کر دی جائے گی۔ میری پریس کانفرنس کے ایک گھنٹے بعد آئی ایس پی آر کا پریس ریلیز آ گیا کہ فوج کسی کی پشت پر نہیں اور وہ جمہوریت کے ساتھ ہے۔ میری پریس کانفرنس کے بعد عدالت عظمیٰ کی سرگرمیاں بھی سرد پڑ گئیں اور عمران خاں کا اصل چہرہ بے نقاب ہو گیا۔ غالباً یہ اتوار کی شام تھی جب سازشی اور غیر جمہوری عناصر پر کاری ضرب لگی تھی اور ان کا پورا کھیل بگڑ چکا تھا۔''

میں جاوید ہاشمی کی باتیں سنتا ہوا سوچ رہا تھا کہ قدرت کے کھیل بھی کس قدر نرالے اور حکمت پر مبنی ہوتے ہیں کہ اگر تحریک انصاف میں شامل نہ ہوتے' تو تاریخ کے اس انتہائی نازک موڑ پر پاکستان کو ایک بہت بڑی سیاسی تباہی سے بچانے کا عظیم الشان کارنامہ کیسے انجام دیتے۔ اُس وقت قانون کے ذریعے قائم شدہ حکومت کی نبضیں ڈوب رہی تھیں اور ہر طرف سے ٹیک اوور کے اشارے مل رہے تھے۔ ایسے میں فوجی اقتدار کے باغی نے اپنے وطن کو اندھیروں میں بھٹکنے سے بچا لیا تھا۔

وہی توڑ پھوڑ کریں گے اور ہم کسی بات میں ملوث نہیں ہوں گے۔ میں نے عمران خاں سے علیحدگی میں پوچھا کہ ہم اسلام آباد میں دھرنا دیں گے، تو ریاست کام کرنا چھوڑ دے گی اور یوں ملک میں مارشل لا آ جائے گا۔ اس پر اس نے تفصیل سے بتایا تھا کہ اوّل تو اسلام آباد جانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی اور گوجرانوالہ پہنچتے ہی نواز شریف کی حکومت ختم کر دی جائے گی۔ اور اگر ہمیں اسلام آباد میں دھرنا دینا پڑا، تو نئے چیف جسٹس اس صورت حال کا ازخود نوٹس لیتے ہوئے حکومت کی برطرفی اور ٹیکنو کریٹس کی حکومت قائم کرنے کے احکام جاری کر دیں گے جو آئین کے عین مطابق ہوں گے۔"

"ہاشمی صاحب! میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کو اس پوری صورت حال میں کسی سازش کی بو محسوس نہیں ہوئی اور آپ کو یہ اندیشہ لاحق نہیں ہوا کہ جمہوریت کی بساط لپیٹنے کا عمل آخری مرحلے میں ہے؟"

انھوں نے ایک منجھے ہوئے سیاست دان کی ذہانت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا:

"میں یہی سمجھتا رہا کہ کور کمیٹی خاں صاحب کو ایک حد سے آگے نہیں جانے دے گی۔ دراصل مجھے اُن کی ۸۰ فیصد باتوں سے اتفاق ہے اور میرا یہ بھی حسن ظن ہے کہ وہ نوجوانوں کی جماعت ہے اور ایک حقیقی تبدیلی لانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہمیں کسی طور اس کی صلاحیتوں کو ضائع ہونے نہیں دینا چاہیے، مگر جوں جوں نت نئے واقعات پیش آتے گئے، توں توں مجھ میں عظیم ذمے داریوں کا احساس بڑھتا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حالات بے قابو ہوئے اور میرے اندر جو انٹینا نصب ہے، اُس میں زبردست ارتعاش پیدا ہوتا گیا۔ خاں صاحب کو پورا یقین دلایا تھا کہ مرحلہ بخیر وخوبی طے ہو جائے گا اور تین ماہ کے دوران نئے انتخابات یقینی طور پر منعقد ہوں گے۔ اس نے مجوزہ امیدواروں کی فہرستیں بھی اگست کے اوائل میں طلب کر لی تھیں۔"

"آپ کی نظر میں اُن کے اس بے پناہ اعتماد کے پیچھے کون سی قوت تھی؟" میں نے تباہی کے مناظر کو ذہن میں لاتے ہوئے سوال کیا۔

جاوید ہاشمی نے بے ساختہ جواب دیا کہ بعض ریٹائرڈ اعلیٰ فوجی اور سرکاری افسر اور جنرل پرویز مشرف کے طرف دار اور خفیہ ایجنسیوں کے طاقت ور عناصر اُن کی پشت پر کھڑے تھے۔ خاں صاحب گفتگو کے دوران اکثر یہ تاثر دیتے کہ وہ بہت جلد آئیں گے جن کے سینوں پر دائیں بائیں اعلیٰ مناصب کے فیتے سجے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے آغاز ہی میں ایمپائر کی انگلی اُٹھنے کی "بشارت" دے دی تھی۔ تحریک انصاف کی کور کمیٹی اس امر کی پوری پوری کوشش کرتی رہی کہ پارلیمان پر حملہ نہیں ہونا چاہیے، مگر ایک شام ڈاکٹر علوی میرے پاس ہانپتے کانپتے آئے کہ پارلیمان پر حملہ ہونے والا ہے، آپ فوری طور پر کچھ کیجیے۔ میں کور کمیٹی کے متعدد ارکان سے ملا جو اس بات پر متفق تھے کہ ہمیں کوئی غیر قانونی کام نہیں کرنا چاہیے۔ میں کنٹینر پر عمران خاں کے پاس گیا اور اسے کور کمیٹی کا پیغام دیا۔ پارلیمان پر حملہ آور ہونے کا مقصد سیکیورٹی فورسز کو اشتعال دلانا اور پاکستان کا امیج تباہ کرنا تھا۔ میں یہ بات میڈیا کے ذریعے عوام تک پہنچانا چاہتا تھا کہ کور کمیٹی کسی قسم کی پیش دستی کے حق میں نہیں، چنانچہ میں کنٹینر سے نیچے اُترا اور پریس کلب کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہاں پہنچا تو ہو کا عالم تھا۔ لوٹنے ہی لگا تھا کہ ایک نوجوان دور سے دوڑتا ہوا آیا اور پوچھا کہ آپ یہاں کیسے آئے ہیں۔ میں نے کہا میڈیا سے ایک اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے دس پندرہ منٹ میں رپورٹر اور ٹی وی کیمرامین بلا لیے۔ میں نے وہاں فقط یہ پیغام

عمران خاں نے مجھے بتایا گوجرانوالہ پہنچتے ہی نواز شریف کی حکومت ختم ہو جائے گی

میرے کان میں کہا کہ میں سیاسی طور پر نواز شریف کے خلاف ہوں' لیکن اُن کے موقف کا ہم نوا ہوں۔ اس ایک جملے میں بہت کچھ پنہاں تھا۔ میں نے اُن کے چہرے کی طرف دیکھا جو ایک نئی داستان سنا رہا تھا۔ نواز شریف کا موقف یہ تھا کہ فقط الزام کی بنیاد پر وہ استعفا نہیں دیں گے اور لشکر کشی کے ذریعے منتخب حکومت کو گرانے کی روایت اگر ایک بار قائم ہو گئی' تو ملک میں جنگل کے قانون کا راج ہو گا۔

ہم ۸/اگست کی شام اسلام آباد سے واپس آ گئے کہ وہاں ایک طوفان آنے والا تھا جس کی لگامیں اندھی خواہشات کے ہاتھ میں تھیں۔ عمران خان اور قادری آندھی کی طرح اسلام آباد آئے اور مملکت کی حکمران علامتوں پر حملہ آور ہوئے۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ حکومت کے خاتمے اور ٹیکنو کریٹس کی بادشاہت کے قیام کی افواہیں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ وزیراعظم ہاؤس پر مسلح ہجوم نے حملہ کر دیا تھا جسے ایس ایس پی جونیجو نے بڑی مردانگی سے پسپا کر دیا تھا۔ انھوں نے بہادری اور فرض شناسی کی ایک نئی تاریخ رقم کی تھی۔ اُنھیں افسران بالا نے طاقت کے استعمال سے روک دیا تھا۔ انھوں نے بے سروسامانی کی حالت میں پولیس کے جوانوں کی قیادت کی۔ وہ بُری طرح زخمی ہوئے اور اس کے باوجود اپنے محاذ پر ڈٹے رہے اور مظاہرین کو وزیراعظم ہاؤس میں داخل ہونے نہیں دیا۔ اس افراتفری میں اکثر حلقے یہ تاثر دے رہے تھے کہ جناب وزیراعظم تنہا رہ گئے ہیں اور اپنے مستقبل کے بارے میں بڑی حد تک مایوس ہو چکے ہیں۔ عالمی خبر رساں ایجنسی نے فوج کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع کر دی تھیں اور عین اس وقت جب وقت کا جلاد رسہ کھینچنے ہی والا تھا جناب جاوید ہاشمی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور اندھیروں میں کھیلے جانے والے خطرناک اور تباہ کن کھیل سے پردہ ہٹا دیا۔ ہم اُن سے اس متوقع شب خون (حملہ) کی کڑیوں کی حکایت اور مستقبل کے امکانات پر بات کرنے کے لیے ملتان آئے تھے۔ اُن سے پہلا سوال یہی کیا کہ آپ کو خطرے کا احساس کب ہوا تھا۔ اُن کے جواب کا پہلا جملہ ہی بہت ہوشربا تھا۔ انھوں نے کہا:

''میں کراچی کے جلسے میں شرکت کے لیے ایئر پورٹ پر اُترا تو عمران خاں وہاں موجود تھے اور خود گاڑی چلا رہے تھے۔ راستے میں انھوں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری سے جنرل کیانی اور کبھی جنرل پاشا سے ٹیلی فون ملانے کے لیے کہا۔ میرے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اب واپسی بھی ناممکن تھی۔ دراصل میں نے مسلم لیگ نون کی قیادت کے بارے میں یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ مجھے عضو معطل رکھنا چاہتے ہیں جو میرے لیے کسی طور بھی قابل قبول نہیں تھا۔ مجھے اس وقت شدید صدمہ پہنچا جب شہباز شریف' غلام مصطفیٰ کھر کے ساتھ شکار کھیلنے کے لیے میرے مکان کے پاس سے میری خیریت معلوم کیے بغیر گزر گئے۔ اب میرے لیے تحریک انصاف میں رہ کر اس کے حالات بہتر بنانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھے اپنی کامیابی کا اس لیے یقین تھا کہ عمران خاں میری بہت عزت کرتا' مشورے بھی لیتا اور مجھے اپنے راز بھی بتا دیتا تھا۔ جب وہ لندن سے آیا' تو اس نے صرف مجھے بتایا کہ وہاں علامہ طاہر القادری سے ملاقات ہوئی ہے۔ آزادی مارچ کے سلسلے میں اس نے تین ماہ پہلے کور کمیٹی سے مشاورت کرتے ہوئے تاثر یہ دیا تھا کہ ہمارے آگے علامہ قادری کے کارندے ہوں گے'

نے ۶۷ لاکھ ووٹ حاصل کیے اور اس نے جماعت اسلامی اور کچھ دوسری جماعتوں کے تعاون سے خیبر پختونخواہ میں حکومت بنالی تھی۔ عمران خاں نے انتخابات میں کامیابی پر جناب نواز شریف کو مبارک باد پیش کی تھی اور بعد میں اپنی رہائش گاہ پر اُن کا خوش دلی سے استقبال کیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے تیور بدلتے گئے اور انھوں نے انتخابات میں بہت بڑی دھاندلی کے حوالے سے سابق چیف جسٹس جناب افتخار چودھری، الیکشن کمیشن، ریٹرنگ آفیسرز، پنجاب کے نگراں وزیراعلیٰ جناب نجم سیٹھی اور جیو نیوز پر گھناؤنے الزام لگانے شروع کر دیے۔ اسی دوران ۱۷ جون کا سانحہ ماڈل ٹاؤن رونما ہوا اور عمران خاں اور علامہ طاہرالقادری نے وزیراعظم نواز شریف اور وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کے استعفوں کا مطالبہ داغ ڈالا۔ اُن کے طور طریق سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ وہ ایک ایسے ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں جو پاکستان کو شدید ترین سیاسی عدم استحکام سے دوچار کر دے گا۔ وہ اپنی طویل تقریروں میں عجب عجب اشارے بھی دیتے جا رہے تھے۔ پھر انھوں نے بہاولپور کے جلسہ عام کے موقع پر اعلان کیا کہ اُن کی جماعت ۱۴ اگست کو اسلام آباد تک آزادی مارچ کرے گی جس میں لاکھوں لوگ شامل ہوں گے۔ جوں جوں یوم آزادی قریب آتا گیا، عوام کے اندر بے یقینی اور بے چینی بڑھتی گئی اور کالے بادل گہرے ہوتے گئے۔

ہم ۸ اگست کو اسلام آباد میں تھے جبکہ قومی اسمبلی کا اجلاس جاری تھا۔ سوچا اندر کا حال دیکھا اور پیش آنے والے واقعات کا سراغ لگایا جائے۔ میں نے اپنے محترم دوست جناب تحسین راؤ سے قومی اسمبلی کے پاس بنوانے کے لیے کہا جو آج کل حکومت کے پرنسپل انفارمیشن آفیسر تعینات ہیں اور میڈیا سے کٹے پھٹے تعلقات میں پنکچر لگانے کی مشق کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے ہماری راہنمائی کے لیے ایک سمجھ دار افسر مقرر کر دیا جو ہمیں مین گیٹ سے لفٹس کی طرف لے گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ جاوید ہاشمی اپنے پروانوں کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ ٹوٹ کر ملے اور اُن کے طفیل وزیراطلاعات جناب پرویز رشید سے بھی آمنا سامنا ہو گیا جو اپنا دیدار کرانے کے لیے کبھی کبھار جھروکے میں آتے ہیں۔ راہداری سے گزرتے ہوئے جاوید ہاشمی کی نہایت اہم لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور وہ ہمیں اسپیکر گیلری میں بٹھا کر اپنی نشست پر جانے لگے تو

پھر مجھے وہ دن یاد آئے جب مسٹر بھٹو سویلین چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے طور پر برسراقتدار آئے اور وہ ہر قیمت پر پنجاب یونیورسٹی میں اسلامی جمعیت طلبہ کا زور توڑ کر اپنی سیاست کا قلعہ تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ تب ہفت روزہ ''زندگی'' اور ماہنامہ ''اردو ڈائجسٹ'' نے انتخابی حکمت عملی تیار کرنے اور مناسب انتخابی نعرے تراشنے میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ طے پایا تھا کہ بائیں بازو کے مقابلے میں دائیں بازو کی قوت میں اضافے کے لیے یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کی صدارت کے لیے حفیظ خاں کھڑے کیے جائیں اور جنرل سیکرٹری کے لیے جاوید ہاشمی مناسب رہیں گے۔ عزیزی مجیب الرحمٰن شامی جو ہفت روزہ زندگی کے ایڈیٹر تھے انھوں نے انتخابی مہم کے دوران ایک سرگرم کردار ادا کیا۔ جناب سجاد میر بھی ''زندگی'' سے وابستہ چلے آ رہے تھے اور وہی ہاشمی صاحب کو میدان میں لائے تھے۔ پیپلز پارٹی حکومت تمام تر طاقت اور ہیبت کے باوجود وہ پنجاب یونیورسٹی میں شکست سے دوچار ہوئی اور اگلے سال بھی اسے سر اُٹھانے کا موقع نہ ملا کہ اس دفعہ جاوید ہاشمی یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہم نے انھیں مختلف محاذوں پر عوام کے حقوق کی جنگ لڑتے اور بڑی پامردی سے انھیں مشکلات کا سامنا کرتے دیکھا۔ جنرل پرویز مشرف کا زمانہ آیا تو وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور انھوں نے ایک جونیئر فوجی افسر کا خط اسمبلی کے فلور پر بلند آواز میں پڑھ کر سنایا جو اس نے تمام اراکین اسمبلی کو ارسال کیا تھا۔ اس پر فوجی حکومت نے اُن پر بغاوت کا مقدمہ چلایا جس میں انھیں دس برس کی سزا سنائی گئی۔ انھوں نے جیل سے کتاب لکھی ''ہاں، میں باغی ہوں۔'' اس وقت سے اُن کا نام ''باغی'' پڑ گیا جو اُن کی عزیمت و استقامت کا ایک زندہ استعارہ بن چکا ہے۔

اسیری کے دوران وہ مسلم لیگ نون کی صدارت کا بار بھی اُٹھائے رہے۔ جناب نواز شریف کی جلاوطنی کے بعد اس جماعت میں انٹیلی جنس ایجنسیوں نے نقب لگائی تھی اور قاف لیگ وجود میں آ گئی تھی۔ فروری ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں جاوید ہاشمی نے مسلم لیگ نون کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کی تین نشستیں جیت لی تھیں اور یوں عوام نے اُن کی قربانیوں کو زبردست خراج تحسین پیش کیا تھا۔ تین سال بعد انھوں نے مسلم لیگ چھوڑنے کا فیصلہ کیا، تو اُن کے نہایت قریبی دوست خواجہ سعد رفیق نے انھیں اپنے گھر بلایا، وہ اور اُن کی اہلیہ دیر تک انھیں اس ارادے سے باز رکھنے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے۔ اس رات محترمہ کلثوم نواز بھی اس میٹنگ میں شریک ہوئیں اور ہاشمی صاحب کو رام کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہیں، مگر شاید اُن کی عزت نفس پر کوئی گہرا زخم لگا تھا جو انھیں بے چین کیے دے رہا تھا۔ پھر ہم نے ٹی وی پر وہ منظر بھی دیکھا کہ اُن کے حلقے کے لوگ اُن کی کار کے آگے لیٹ گئے تھے جو انھیں ایئرپورٹ لے جا رہی تھی کہ انھیں کراچی میں منعقد ہونے والے تحریک انصاف کے جلسہ عام میں شریک ہونا تھا۔ میں نے اس جلسے میں اُن کی تقریر سنی تھی جس میں انھوں نے عمران خاں سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ میں ''تمھارا بھی باغی ہو سکتا ہوں۔'' اُن کے یہ الفاظ میرے ذہن کے اندر چپک گئے تھے اور مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ اس تقریر سے پہلے کوئی بہت بڑا خاموش حادثہ رونما ہو چکا ہے۔

اس پورے عرصے میں اُن سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ تحریک انصاف کے منتخب صدر بن چکے تھے اور اُن کی حیثیت عمران خاں سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھی کہ انھیں جماعت کے ارکان نے ووٹوں سے منتخب کیا تھا جبکہ دوسرے عہدیداروں کی طرح عمران خاں بھی ایک طرح سے نامزد ہوئے تھے۔ مئی ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں تحریک انصاف

آیا' ہمیں خوش آمدید کہا اور ڈرائنگ روم کے اندر لے گیا جس میں ایئرکنڈیشنر نہیں تھا۔ ملتان کا موسم خاصا گرم تھا اور ہمیں قدرے بے آرامی محسوس ہوئی' مگر جب جاوید ہاشمی آگئے' تو باتوں میں کسی چیز کا احساس ہی نہ رہا۔ میز پر ناشتہ لگا ہوا تھا جس میں کولیسٹرول بڑھانے والی تمام اشیا موجود تھیں۔ جاوید ہاشمی ہمارے سوالات کا جواب دیتے اور حلوہ پوری پر ہاتھ صاف کرتے رہے۔ وہ بے پناہ قوت ارادی کے مالک ہیں اور بالعموم نتائج سے بے پروا رہتے ہیں۔ اُن کی باتیں مجھے پینتالیس برس قبل ماضی میں لے گئیں جب میری اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تھی اور ہم ایک بہت بڑے بحران سے دوچار تھے۔

ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ کے زیراہتمام ہم نے ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء کو ملتان سے روزنامہ جسارت کا اجرا کیا۔ افتتاحی تقریب میں جناب اے کے بروہی تشریف لائے تھے۔ یہ آغا یحییٰ خاں کا دورِ حکومت تھا جس میں صحافت کو کسی قدر آزادی میسر آئی تھی اور نئے اخبارات کے ڈیکلریشن ملنے لگے تھے۔

اس کے برعکس ایوب خاں کے زمانے میں ایک نہایت جابرانہ پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس نافذ تھا جس میں اخبارات و جرائد کے ڈیکلریشن کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اور ذرا ذرا سی بات پر ڈیکلریشن منسوخ کر دیے جاتے تھے۔ ہم ایوب حکومت کے خاتمے کے ایک سال بعد روزنامہ جسارت کا ڈیکلریشن حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ابھی ہمیں روزنامے کو نکالے دو چار مہینے ہی ہوئے تھے کہ آزادیٔ صحافت کے نام پر پی ایف یو جے نے ایک روزہ ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ ہماری انتظامیہ کے نزدیک یہ ہڑتال بے محل اور بے جواز تھی' اس لیے ہڑتال کے باوجود ہم نے روزنامہ جسارت شائع کر دیا مگر ہاکر اخبار فروخت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ تب اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستہ نوجوان آگے آئے اور انھوں نے روزنامہ جسارت پورے شہر میں تقسیم کیا۔ اس وقت ان طلبہ کی قیادت نوجوان جاوید ہاشمی کر رہا تھا۔

محمد عرشیان، مخدوم جاوید ہاشمی، الطاف حسن قریشی، شاہزیب ہاشمی، خالد یزدانی

طیب اعجاز قریشی، خالد یزدانی، الطاف حسن قریشی، مخدوم جاوید ہاشمی

بجے جاوید ہاشمی فون پر آئے' تاخیر سے بات کرنے پر معذرت کی اور بتایا کہ مجھے علی الصباح اپنے حلقے میں جنازے میں شریک ہونا ہے اور میں کوئی ساڑھے دس بجے واپس آؤں گا' آپ پہلے آجائیے اور میں ناشتے میں شریک ہو جاؤں گا۔
رات کے ساڑھے گیارہ بجے ملتان کے آثار نظر آنے لگے جو فلائی اوورز میں جکڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس شہر سے ہم نے ۱۹۷۰ء میں روزنامہ ''جسارت'' نکالا تھا اور اس وقت ضلع کچہری کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ چالیس بیتالیس برسوں میں اس شہر کی وہ خصوصیتیں ناپید ہوگئی ہیں جن کے لیے وہ تاریخ میں پہچانا جاتا تھا' البتہ اولیائے کرام کے مزارات اور خانقاہیں آباد ہیں اور عالی شان عمارتیں شہر کو ایک نیا جمال عطا کر رہی ہیں۔ رمادہ ہوٹل پہنچے تو اس کی آرائش و زیبائش دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ملتان شہر جدید سہولتوں سے آراستہ ہوتا جا رہا ہے۔
اُردو ڈائجسٹ کے ایگزیکٹو ایڈیٹر عزیزم طیب اعجاز' ڈپٹی ایڈیٹر خالد یزدانی اور عزیزی محمد عرشیان جب ملتان چھاؤنی میں بنگلہ نمبر ۵۰ پر پہنچے' تو اس پر کسی کا نام نہیں لکھا تھا اور مین گیٹ کھلا ہوا تھا۔ ہم نے سوچا یہ ہاشمی صاحب کا گھر نہیں ہوسکتا' کیونکہ دور دور تک کوئی دربان اور کوئی محافظ نظر نہیں آیا جبکہ اُنھیں سخت حفاظتی اقدامات کی ضرورت تھی۔ ہم اس کوٹھی سے آگے نکل آئے۔ وہاں ایک پولیس والا کھڑا تھا۔ اس سے جاوید ہاشمی کے گھر کا پتا معلوم کیا' تو اس نے کہا یہ پیچھے برابر والی کوٹھی ہے۔ شبیر کار اندر لے گیا جہاں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ اتنے میں ہاشمی صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری نے فون پر پوچھا کہ آپ لوگ کہاں ہیں۔ ہم نے کہا دروازے تک آن پہنچے ہیں۔ وہ دوڑا دوڑا

ہم چراغ جلے ملتان کے سفر پر روانہ ہوئے۔ ہمیں ایک مردِ آہن کا انٹرویو لینا تھا جس کے ایک جرأت مندانہ اقدام نے پاکستان کو غیر جمہوری اور سازشی طاقتوں کے پنجوں میں جانے سے بچا لیا تھا اور ملک دشمن عناصر کے تمام خواب چکنا چور کر ڈالے تھے۔ نہر کے کنارے ای ایم ای سوسائٹی سے ذرا پہلے ایک نہایت خوبصورت مسجد میں نماز مغرب ادا کی جس میں امام صاحب کی تلاوت نے ایک سماں باندھ دیا تھا اور خدائے لم یزل کی واحدانیت کے غیر فانی نغمے روح میں اُتار دیے تھے۔ کار کا ڈرائیور شبیر ملتان تک پورے علاقے کا بڑا رازداں ہے اور اسے معلوم ہے کہ میاں منشا کی زمین کہاں تک پھیلی ہوئی ہے اور جناب جہانگیر ترین کے مربعوں کی تعداد سینکڑوں یا ہزاروں تک جا پہنچی ہے جو تحریک انصاف کے سیکرٹری جنرل ہیں اور جناب عمران خاں انہی کے طیاروں اور بلٹ پروف گاڑیوں میں اُڑے پھرتے ہیں۔ مانگا تک سڑک ٹوٹی پھوٹی تھی، لیکن اس کے آگے ہمیں کسی بڑی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ساہیوال کے بائی پاس پر ہمیں ہوٹل ''ویو'' نظر آیا جو قدرے بلندی پر واقع تھا۔ رات کے نو بج رہے تھے، ہم وہاں رکے اور اس کے صاف ستھرے ماحول نے دامن دل کھینچ لیا۔ کھانا کھایا جو بہت مزے کا تھا اور بیرا نہایت سلیقہ شعار تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا اور آگے چل پڑے۔

اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے میں ہاشمی صاحب کو مسلسل فون کیے جا رہا تھا۔ جواب یہی آ رہا تھا کہ عوام کے اندر گھرے ہوئے ہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ ٹی وی پروگرام پر مکالمے کا حصہ بنے بیٹھے ہیں۔ اُن کے سیکرٹری سے بات ہوئی تو انھیں پیغام دیا کہ ہم قریباً رات کے بارہ بجے ملتان پہنچیں گے اور صبح ناشتے پہ ملاقات کرنے کا ارادہ ہے۔ رات گیارہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
خصوصی انٹرویو
ظلم و استحصال کے باغی اور قوم کے محسن
مخدوم جاوید ہاشمی
سے ایک خصوصی اور آنکھیں کھول دینے والا انٹرویو
ملاقات: الطاف حسن قریشی
شریکِ گفتگو: طیب اعجاز قریشی، خالد ہمدانی
عکاسی: محمد ذیشان
اردو ڈائجسٹ 17 اکتوبر 2014ء
WWW.PAKSOCIETY.COM

میں ایک منصوبے کے تحت شیعہ سنی فسادات کرانے کی سرتوڑ کوشش کی جا رہی ہے۔ اب یہ واقعات ثابت ہو چکے کہ ایک ہی پستول کی گولیوں سے الگ الگ مقامات پر شیعہ اور سنی افراد موت کی نیند سلائے گئے ہیں۔ ان تمام تر مذموم اور مطعون کوششوں کے باوجود ابھی تک ہمارا معاشرہ ایک بڑے عذاب سے محفوظ ہے اور خارجی اور داخلی دشمنوں کی سازشیں ناکام ہوتی آئی ہیں، مگر عراق، شام، لبنان میں مسلک کی بنیاد پر جس ہولناک تقسیم کے خونریز مناظر سامنے آ رہے ہیں، اُن سے خوف محسوس ہو رہا ہے کہ خدانخواستہ پاکستان بھی اُن کی لپیٹ میں نہ آ جائے اور فرقہ وارانہ تشدد کا زہر ہمارے معاشرے میں پھیلتا نہ چلا جائے۔

اس خطرے سے آنکھیں بند رکھنے کے بجائے ہماری حکومت، ہمارے اہلِ دانش، اساتذہ اور میڈیا کو اس کی روک تھام کے لیے ایک جامع حکمتِ عملی مرتب کرنا اور اس پر عمل درآمد کو یقینی بنانا ہوگا۔ بلاشبہ ہماری فوج دہشت گردوں اور انتہا پسندوں کے خلاف برسرِپیکار ہے اور اُن کے کمانڈ اور کنٹرول مراکز پر کاری ضرب لگا رہی ہے، مگر اصل دشمن تو وہ خیالات اور تصورات ہیں جو اسلام کی آفاقی حکیمانہ تعلیمات کی گمراہ کن تعبیرات پیش کرتے اور طاقت کے ذریعے شریعت نافذ کرنے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ طاقت کے ذریعے گلے سڑے نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کی تحریک اب کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی مقبول ہو رہی ہے اور بزورِ اسلام کی سربلندی کے تخیل سے اب افواج کے افسر اور جوان بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ کراچی نیول ڈاک یارڈ میں دہشت گردی کا جو واقعہ پیش آیا، اس میں نیوی کے بعض افسر بھی شامل تھے۔ کامرہ ائیربیس پر دہشت گردی کے واقعے سے یہ شہادت سامنے آئی تھی کہ اندر کے کچھ لوگ ملے ہوئے تھے۔

ان حالات میں ہمیں علمی، تخلیقی اور سائنسی بنیادوں پر کام کرنا ہوگا۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہمارے اپنے تعلیمی ادارے نوجوانوں کو کیا تعلیم دے رہے ہیں اور دینی مدرسوں کا ماحول کیسا ہے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ معاشرے میں طبقاتی تقسیم بہت گہری ہوتی جا رہی ہے اور ایک عام شہری کی آرزوؤں کا بے دردی سے قتلِ عام کیا جا رہا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ عام آدمی کو طفل تسلیاں دینے کے بجائے یہ دیکھا جائے کہ اسلام کے تصورِ عدل کو جلد سے جلد کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے۔ بڑے بڑے محلات میں رہنے والے، بڑی گاڑیوں اور طیاروں میں سفر کرنے اور دولت کو پانی کی طرح بہانے والے اور حرام کمائی سے پیٹ کا دوزخ بھرنے والے اُمڈتے ہوئے طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اُنھیں عوام کی سطح پر آنا اور بنیادی مسائل کا حل تلاش کرنا ہوگا۔ ایک عادلانہ معاشرتی نظام کے اندر فتنے پنپ نہیں سکتے اور جذبات کو غلط رخ نہیں دیا جا سکتا۔ امن اور سکون خود احتسابی اور ایثار کیشی میں پوشیدہ ہے۔

الطاف حسن قریشی

اصل خطرہ

پاکستان ایک زمانے سے مسائل اور مصائب کی زد میں ہے، مگر جس خطرے کا زہر ہمارے قومی وجود میں پھیلتا جا رہا ہے، وہ فرقہ وارانہ تشدد اور انتہا پسندی ہے۔ صرف کراچی شہر کے اندر گزشتہ ڈیڑھ دو ہفتوں میں تین بڑی مذہبی شخصیتیں موت کی آغوش میں چلی گئیں۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے ڈین، ڈاکٹر شکیل اوج اس وقت گولی کا نشانہ بنے جب وہ اپنی بیٹی اور اپنے استاذ عامر مسعود کی معیت میں کار پر ایرانی قونصل کے دفتر ایک تقریب میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ وہ سیلف میڈ آدمی تھے اور اہل علم و تحقیق میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ ایک درجن سے زائد بلند پایہ کتابوں کے مصنف تھے۔ اُن کی آزاد خیالی کے باعث کچھ مذہبی حلقے اُن سے قدرے ناخوش تھے اور اُن کے خلاف جعلی فتوے بھی جاری ہوئے تھے۔ جو عناصر پاکستانی قوم کو ذہنی طور پر پسماندہ رکھنا چاہتے ہیں اور اختلاف رائے کو برداشت کرنے کو تیار نہیں، وہ علم کے چراغ بجھانے کی ہلاکت خیز سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور اُن کی پوری کوشش یہ ہے کہ فرقہ وارانہ نفرتوں کو ہوا دی جائے جس سے معاشرہ تقسیم ہوتا جائے۔ کراچی میں ایک معروف شیعہ عالم عباس کمیلی کے صاحبزادے علی اکبر کمیلی شہید کر دیے گئے اور جامعہ بنوریہ کے مہتمم مفتی محمد نعیم کے فرزند مسعود بیگ بھی نامعلوم افراد کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ نفرتوں کی یہ آگ پھیلتی ہی جا رہی ہے۔ حال ہی میں دیوبندی فکر کے جید عالم دین کے پوتے گولیوں سے چھلنی کر دیے گئے، جبکہ ہنگو میں مدرسہ دارالہدیٰ کے مہتمم حضرت مولانا شیر عالم بھی موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔

تحریک طالبان پاکستان کا پورا فلسفہ بھی مذہبی شدت پسندی پر مبنی ہے۔ اس کے نزدیک بھی وہ لوگ واجب القتل ہیں جو اس کے انتہائی سخت مذہبی تصورات سے اختلاف کرتے اور اپنی بچیوں اور بچوں کو انگریزی تعلیم دیتے ہیں۔ سوات میں غلبہ حاصل کرنے کے بعد طالبان نے لڑکیوں کے اسکول بند کر دیے اور معمولی معمولی فروگزاشتوں پہ شہریوں پر سرعام کڑی سزاؤں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسلام جو اعتدال اور توازن کا دین ہے، وہ انسانیت کے شرف اور عزت نفس کا بہت احترام کرتا اور معاشرے میں سکون، خیر خواہی اور شائستگی کو فروغ دیتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان

اُردو ادب

طب و صحت

رنگا رنگ تحریریں

مستقل سلسلے

فہرست

فہرست

اسلامی زندگی کی کہکشاں

فہرست

دلچسپ سفرنامہ

چلو مقبوضہ کشمیر چلتے ہیں

طیب اعجاز قریشی

بھارتی تسلّط کی وجہ سے کشمیری نوجوان فرسٹریشن میں مبتلا ہیں

کشمیر میں آج تک شیعہ سنی یا ہندو مسلم فسادات نہیں ہوئے

خصوصی انٹرویو

باغی کے بروقت اقدامات نے
ملک کو بہت بڑی تباہی سے بچالیا

ظلم واستحصال کے باغی اور قوم کے محسن

مخدوم جاوید ہاشمی

سے ایک خصوصی اور آنکھیں کھول دینے والا انٹرویو

الطاف حسن قریشی

اُردو ڈائجسٹ

اکتوبر 2014ء
ذوالحجہ 1435ھ
جلد نمبر 54 شمارہ نمبر 10

www.urdudigest.pk urdudigest.com

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
اسسٹنٹ ایڈیٹر: سید عاصم محمود
سب ایڈیٹر: غلام سجاد
مجلس تحریر: حافظ افروغ حسن، نوید اسلام صدیقی، سلمیٰ اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
پروف خواں: خالد محی الدین، کلیم اللہ فاروقی
کمپوزر: اشرف سکندر

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: محمد سلیمان احمد 0300-4116792
لاہور: ندیم حامد گوجرانوالہ: احسان اللہ بٹ
اسلام آباد: محمد سلیم کراچی: شازیہ قمر 0345-2558648

سالانہ خریداری 560 روپے کی بچت کے ساتھ

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdu-digest.com
21/19 ایکڑ سکیم، سمن آباد، لاہور فون: 92 42 37589957
پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
بیرون ملک 60 امریکی ڈالر
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdu-digest.com

قیمت: 100 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے جسارت پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

گزشتہ مہینا وطن عزیز کی معیشت کے لیے کسی طور خوش کن نہ تھا۔ اسلام آباد کو دھرنے اور بالخصوص پنجاب کو سیلاب نے اپنی لپیٹ میں لیے رکھا جس پر اسٹیٹ بینک آف پاکستان کو بھی اعلان کرنا پڑا کہ ملک میں جاری دھرنے اور سیلاب نے معیشت کو بڑا نقصان پہنچایا' اسی وجہ سے روپے کی قدر کم ہونے سے مہنگائی بڑھے گی۔ آپریشن ضرب عضب کی وجہ سے متاثرین (آئی ڈی پیز) کی دیکھ بھال حکومت کے لیے ایک چیلنج تھی اور اب سیلاب نے پنجاب میں تباہی مچا دی۔ نہ صرف وسیع رقبہ زیرآب آیا بلکہ سیلابی ریلے کی زد میں آنے والے مکانات تباہ ہوئے اور سیکڑوں افراد اپنی جان و مال سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ حکومتی ادارے اور فلاحی تنظیمیں متاثرین سیلاب کو ہر ممکن مدد پہنچانے میں کوشاں ہیں۔ پاکستانی افواج کے جوان بھی بڑھ چڑھ کر امدادی کارروائی میں حصہ لے رہے ہیں۔

نیا اسلامی مہینا ذی الحجہ کا آغاز ہو چکا۔ یہ وہ مہینا ہے جب لاکھوں فرزندان توحید حج کی سعادت پاتے ہیں۔ دنیا بھر کے مسلمان سنت ابراہیمیؑ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے قربانی کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور تاقیامت یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔ شاعر مشرق نے اسی حوالے سے کیا خوب کہا تھا ؎

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسماعیل

عیدالاضحیٰ پر ہمیں آئی ڈی پیز کے ساتھ سیلاب سے متاثرہ خاندانوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اسلام ہمیں اسی بات کا درس دیتا ہے۔ عید قربان کے حوالے سے خصوصی تحریروں کے ساتھ بھارت کا طبی ایٹم بم' گمراہ کن انگریزی نصاب کا پوسٹ مارٹم، کھیل اور طب وصحت پر معلوماتی اور دلچسپ مضامین بھی شامل ہیں۔ ان شا اللہ اردو ڈائجسٹ کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے اگلے ماہ سے کچھ نئے سلسلوں کا بھی آغاز کیا جا رہا ہے جسے آپ یقیناً پذیرائی دیں گے۔

طیب اعجاز قریشی

tayyab.aijaz@urdu-digest.com

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اُٹھائیے

Happilac
PAINTS
کیونکہ خوشیوں کے رنگ دیواروں کے رنگ سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں
COLORS OF HAPPINESS
www.happilacpaints.com
www.facebook.com/happilacpaints
momentum 360

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

صدقہ دینے والے کا اجر

اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے۔ تب کہے اے پروردگار! کیوں نہ مجھے تھوڑی سی اور مہلت دی تاکہ میں صدقہ (خیرات) کر لیتا اور نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا O

(سورۃ منافقون: 10:63)

جو لوگ، مرد اور عورتیں، صدقات (خیرات) کرنے والے ہیں اور (خلوص نیت سے) اللہ کو نیک قرض دیتے ہیں ان کو دگنا (اجر) ملے گا اور ان کے لیے عزت کا اجر ہے O (سورۃ حدید: 18:57)

رسول ﷺ کا فرمان

صدقہ جہنم کی آگ سے بچنے کا ذریعہ ہے

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص اپنی پاک کمائی میں سے ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ تک پاک چیز ہی پہنچتی ہے تو اللہ اسے بڑھاتا ہے حتیٰ کہ وہ پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے'' (اور اس کا اجر و ثواب اسی حساب سے ملتا ہے)۔

(بخاری کتاب 97: باب 23: مسلم کتاب الزکوۃ۔ باب 19)

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''عنقریب قیامت کے دن تم میں سے ہر شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ براہ راست بات کرے گا۔ پھر بندہ نظر اٹھا کر دیکھے گا، تو اپنے سامنے آگ ہی آگ نظر آئے گی جو اس کا استقبال کر رہی ہوگی، چنانچہ تم میں سے اس سے بچنے کا ذریعہ صدقہ ہے خواہ وہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر کسی کو یہ بھی میسر نہ آئے تو کلمہ خیر اور اچھی بات کہے (کہ یہ بھی صدقہ ہے)۔''

(بخاری کتاب 81: باب 49: مسلم کتاب الزکوۃ۔ باب 20)

Introducing Ultra-thin Sanitary Pads
mothercare
Be confident everyday
SANITARY PADS
Extra DAY & NIGHT coverage with 3-D Absorbent ADL Gel